بازوؤں سے تھام لیا۔

"کیا مطلب' میں سمجھی نہیں۔" ارشین اسکے عجیب وغریب تبصرے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی۔

مہران سنی ان سنی کر کے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"کتنی بار پروفیسر دانیال نے خواہش کے رنگ بھر کر تمہارے چہرے کے ایک ایک نقش کو نظر اور دل میں اتارا ہوگا۔ تمہاری آنکھوں' ہونٹوں اور سراپے کی قصیدہ خوانی کے پس پردہ اپنی طلب کا اظہار کیا ہوگا۔ اور' اور نجانے کتنی بار تمہیں چھوا ہوگا۔" مہران نے شدت جذب سے نچلا ہونٹ کاٹا۔ غیرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"ایس پی صاحب پلیز۔" ارشین بے ساختہ چیخ پڑی اور ردعمل کے طور پر اپنا آپ اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا مگر اس کے فولادی بازوؤں کے حصار میں وہ ہل بھی نہ سکی۔

"کیوں' کیا ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ مرد عورت کے انٹیمیسی میں کیا ایسا نہیں ہوتا؟ تم کوئی انوکھی ہو کہ اس حد تک نوبت نہ آئی ہوگی۔ یہی ہوتا ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے اور یہاں اسی دنیا میں ہوتا ہے۔"

"میں نہیں جانتی انٹیمیسی لڑاتے ہوئے فریقین کن "مرحلوں" سے گزرتے ہیں۔ مگر آپ کو اتنا ضرور بتاؤں گی کہ میرا پروفیسر مہدی کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں رہا۔ انہوں نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ جو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کیا ہم اگلے بندے کی زبان پکڑ سکتے ہیں؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"مگر تم نے ان کو شہہ تو دی۔ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ کسی سے کمٹمنٹ کرنا معمولی بات نہیں ہوتی۔" وہ ضدی پن سے گویا ہوا۔

"میں نے ان ہی کو یہ اختیار دے رکھا ہے اور کیا کہتی۔"

"کہہ تو تم نے دیا تھا۔ اسٹامپ پیپر پر نکاح کی رضامندی لکھ کر دے دی تھی اور کس طرح کہتیں۔" وہ پھنکارا۔

"آپ نے کبھی مجھ سے پوچھا؟ یا مجھے صفائی کا موقع دیا؟ آپ تو خود سے ہر بات فرض کر کے بدگمانی کے کانٹے راہ میں بچھائے بیٹھے ہیں۔ میں نے پروفیسر صاحب کی فطرت جان لینے کے بعد مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس انکار کے جرم میں انہوں نے اغوا کر کے جبراً اسٹامپ پیپر پر من پسند تحریر لکھوائی تھی۔"

"تم لکھنے سے انکار کر سکتی تھیں۔ کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ لڑکی کا کسی مرد کو اپنی تحریر دینا گویا عزت گروی رکھوانے کے مترادف ہوتا ہے؟ ایسی بھول کا بہت کڑا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولا۔

"پتا تھا' سب پتا تھا۔ مگر اس وقت کیا کرتی۔ یا عزت دیتی یا تحریر۔ انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ جو سودا منظور ہے کر لو۔ ایک ویران اجاڑ جگہ پر کون تھا جو انہیں من مانی سے روکتا۔ کوئی ایک چیز گنوائے بغیر میں وہاں سے نہیں نکل سکتی تھی۔"

ارشین گویا آج ہر بات صاف صاف بتانے کی ٹھان چکی تھی۔

باہر بارش زور پکڑ گئی تھی۔ تیز بوچھاڑ کے ساتھ آندھی اور طوفان کے جھکڑ یوں چل رہے تھے گویا تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم کر چکے ہوں۔

ہوا کی شائیں شائیں چابک کی طرح پودوں' فصلوں اور مکانات کی دیواروں پر ضربیں لگا رہی تھی۔ بادلوں کی سیاہی تو تھی ہی' سورج غروب ہونے کے بعد اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج میں کہیں کہیں کسی جانور کی سہمی ہوئی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

کمرے میں آتشدان کی جلتی لکڑیوں اور لالٹین کا پیلا نارنجی اجیارا سا تھا۔ سرخ شنیل کے کور والے بستر پر رکھی سرخ شنیل ہی کی رضائی اور تکیے نارنجی روشنی میں چمک رہے تھے اور فرش پر بچھے سرخ دبیز کارپٹ پر دو انسان ایک دوسرے کے بے حد نزدیک کھڑے آنکھ اور زبان کے ذریعے ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے تھے۔

مہران کے بازو ارشین کے شانوں کے گرد حائل تھے۔ اس کے وجود کی ساحرانہ مہک اور لطیف تپش ارشین کو بوکھلائے دے رہی تھی۔ وہ اس کے جارحانہ عزائم کا پتا دیتی تھی۔ سخت و سرکش گرفت سے نکلنا چاہتی تھی مگر مہران جانے کیا سوچے ہوئے تھا۔ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔

"آج کیا نئی بات تھی.....!

اس لمحے بہت زوردار کڑک سنائی دی۔

اس قدر دل دہلا دینے والی کڑک تھی کہ ارشین جیسی مضبوط دل کی لڑکی بھی خود پہ قابو نہ رکھ پائی۔ بے اختیار چیخ مار کر مہران کے وجود میں پناہ لینے کو قریب ہو گئی۔

مہران نے اسے اپنی طرف سمیٹ لیا اور جھک کر پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا' ڈر لگ رہا ہے؟" ارشین کے لمس کی نرمی آسودگی عطا کرنے والی گرماہٹ اور سکون دینے والی حیات پرور لطافت نے مہران کی سوئی ہوئی تمام فطری حسیات کو جگا دیا تھا۔ افسرانہ چولا اتر گیا تھا۔ اس وقت وہ ایک عام مرد تھا۔ ایک ذمہ دار اور خیال رکھنے والا شوہر۔

اس حسن سلوک کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت اس کے ذہن سے ارشین کی ذات سے متعلق شکوک و بدگمانی کے بہت سے جالے صاف ہو چکے تھے۔ اسی لئے وہ اس کی وجود کے قربت اور مہک کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔

"حالانکہ تم جیسی عورت کو تو اب ڈرنا نہیں چاہئے۔ اتنے عرصے سے اکیلی رہ رہی ہو۔" خدا جانے یہ طنز تھا یا تحسین و ستائش۔ وہ ستم گر کے لحظہ بہ لحظہ بدلتے تیور اور جذبات سے کیونکر اس کے موڈ کا اندازہ کر سکتی تھی۔ کہ وہ گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیاء والی مثال تھا۔

"کیا اکیلا رہنے سے انسان بہادر اور نڈر ہو جاتا ہے؟" ارشین نے جھکی پلکوں کو اٹھاتے ہوئے مرتعش لہجے میں سوال کیا اور ساتھ ہی الگ ہونا چاہا۔

"کم از کم زندگی کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا ہنر ضرور آ جاتا ہے۔" وہ اس کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھکا۔

"رات ہو گئی ہے۔ آپ آرام کریں' میں ذرا گوگی بوا کو دیکھ لوں۔" مہران کے عجیب انداز' رویے میں چھپی نرمی و توجہ اور آنکھوں اور لمس سے جھلکتی استحقاقانہ گرم لپک نے اسے اس رشتے کی موجودگی کا احساس دلایا تھا جو دونوں کے درمیان ایک اٹل حقیقت کی طرح پل بن کر کھڑا تھا۔

ملانے کے لئے' تعلقات بڑھانے کے لئے' آگے کی طرف دیکھنے اور پچھلا بھول جانے کے لئے۔

دونوں حقیقی معنوں میں شاید آج پہلی بار ایک دوسرے کی شرعی حیثیت کو تسلیم و محسوس کر رہے تھے۔ وگرنہ جس قسم کے حالات رہے تھے میاں بیوی کے بجائے جیلر اور قیدی کا سا تعلق دکھائی دیتا تھا۔

"بوا سو چکی ہیں۔ تم اتنی ٹھنڈ میں کہاں جاؤ گی۔" وہ اسے بازوؤں میں جکڑے پلنگ پر لے آیا اور سہولت سے بٹھا دیا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ یہ جگہ دو افراد کے لئے کافی ہے۔" مہران کا لہجہ سادہ اور پرسکون تھا۔

نجانے ارشین کو کیا ہوا۔ اس کا جی چاہا' چیخیں مارتی ہوئی پچھواڑے کے قبرستان میں نکل جائے اور ایک ایک قبر سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔

اتنے کشٹ بھوگنے' اتنی ناروا سہنے اور قطرہ قطرہ زندگی کا زہر پینے کا یہ صلہ۔

اک حرف معذرت بھی نہیں۔ کوئی ندامت' کوئی شرمندگی نہیں۔ میری ذات کو کچل کر یوں پیروں تلے روندا کہ کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر کر ڈالا اور اب خیال آنے پر اٹھا کر اپنے برابر بٹھایا بھی ہے تو مطلب نکالنے کے لئے۔ اپنا حق وصولنے کے لئے۔

میں کہاں ہوں۔ میری پہچان' میری ہستی کا افتخار کہاں ہے۔ کیا فقط یہی کہ میں ایک ضرورت کی چیز ہوں جسے طلب پوری کرنے کے بعد پھر سے سرد خانے میں ڈال دیا جائے گا اور رویوں کے کوڑوں سے میری روح زخمی کی جائے گی۔

"کچھ بھی تو نہیں کہا۔ کوئی حرف اعتبار' کچھ ایسا کہ لٹے پٹے پندار کی چھید چھید جھولی کو رفو کیا جا سکے۔ میں خود کو نئے سرے سے یقین دلانے کے قابل ہو سکوں۔ کہ میں بھی انسان ہوں۔ ایک باوقار' باحمیت اور معزز انسان۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ مجھے بھی چوٹ لگنے پر تکلیف ہوتی ہے۔

"یا البرے سانتو کون ہے؟" اچانک ہی مہران کے ذہن میں ایک شبیہہ اتری تھی۔

"البرے سانتو؟" ارشین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ کس کس طرح یہ شخص اپنے تیوروں کے بدلتے رنگ ڈھنگ ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں پاتا۔

"کیا تم جانتی ہو اسے؟" مہران نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں' اگر اسے جاننا ہی کہتے ہیں تو۔" ارشین نے گہری سانس لے کر سر ہلایا۔

"کون ہیں یہ موصوف۔" اس نے سختی سے پوچھا اور ساتھ ہی اپنا بازو اس کی کمر کے گرد سے ہٹا لیا۔ ایک چبھتی ہوئی مسکراہٹ ارشین کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو بس یہی ہے تمہارا التفات و اکرام کہ بدگمانی کے ایک ہی ڈنک سے پگھل کر پانی کی طرح بہہ گیا۔

وہ سنبھل کر اس کے پاس سے اٹھی اور پلنگ سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ اس سوال کا جواب اسی سے پوچھیئے گا ایس پی صاحب جس نے آپ کو بات کا سرا

پکڑایا ہے۔ میرا کہا تو بقول آپکے فریب اور دھوکا بازی پر ہی مشتمل ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

مہران غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

☆☆☆☆☆

"آؤ آؤ میری جان۔ لیلیٰ منزل کی کشش تمہیں یہاں کھینچ لائی۔"

لیلیٰ شاہ نے ڈری سہمی بری طرح گھبرائی مگر ہیروئن کی طلب میں نڈھال و بے قرار امبرین کا بڑے تپاک سے استقبال کیا تھا۔

"اب یہاں آ گئی ہو ناں تو سرتاپا ہماری ہو گئی ہو۔ دیکھنا ایسا روپ دیں گے کہ خود کو پہچان نہ پاؤ گی۔"

لیلیٰ بہت غور سے امبرین کا سراپا دیکھ رہی تھی۔

"سو فیصد بنی بنائی ارشین ہو۔ صرف شکل مختلف ہے۔" لیلیٰ کی آنکھیں ہزار واٹ کے بلب کی طرح چمک رہی تھیں۔ امبرین اسکی جسم کے آر پار اتر جانے والی نظروں سے بے ساختہ سٹ کر رہ گئی۔

"کیا چیز ہاتھ لگی ہے بھئی۔ ہمارے ایس پی صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ ان کی ایک زوجہ ہوتی تھی ارشین بخاری نام کی۔"

لیلیٰ دل ہی دل میں جی بھر کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اسکا چہرہ اس کی شیطانی عزائم اور مکروہ ارادوں کا پتہ دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

مہران صبح اٹھا تو جی بھر کر خود پر حیران ہوا۔

مجھے کل رات کیا ہو گیا تھا؟

یہ میں کس عورت کو اپنی قربت کا شرف بخشنے جا رہا تھا؟ کس کو پہلو میں بٹھا رہا تھا۔ وہ جسے میرا رواں رواں ناپسند کرتا ہے۔ جس کا رسوا کن ماضی میری غیرت و حمیت کیلئے تازیانہ ہے۔ جس پر زخم کرنا میری دانست میں برائی کی پشت پناہی کے مترادف ہے۔

شاید یہ رات کا سحر تھا۔ فطرت کی آواز تھی۔ یا پھر دل کے تقاضے کہ رقتی طور پر منتقم و متنفر تم

کے جذبات کے الاؤ پر برف پڑ گئی تھی۔

اور اب صبح دم بیداری کے ساتھ ہی غیض و غضب اور سنگ دلی کے پرانے رنگ دوبارہ چمک اٹھے تھے۔

وہی سابقہ نفرت و بیزاری عود کر آئی تھی۔

وہ تیار ہو کر تن فن کرتا کچن میں آیا تو چہرے پر کل والے جذبات شائبہ تک نہیں تھا۔ یوں جیسے نیا خول چڑھا لیا ہو۔

"کب تک بنے گا ناشتہ؟ محترمہ! مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"بس چائے بن رہی ہے۔ برکتے خالہ کا لڑکا طیفا ابھی ابھی دودھ دے کر گیا ہے۔"

وہ چولہے کی سلائی مشین کی طرح کی ہتھی کو اوپر نیچے گھما کر آنچ تیز کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔ چولہا دیکھنے میں اسی شیپ کا تھا جس طرح کے سوئی گیس کے عام برنر گھروں میں فٹ ہوتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ یہ سنگل برنر والا تھا۔ جس کے ساتھ بیضوی شکل کی لمبی لینڈر نما لوہے کی ٹنکی بنی ہوئی تھی۔ اس ٹنکی میں مٹی کا تیل ڈالا جاتا تھا۔ چولہا جلنے کی آواز باقاعدہ سنائی دے رہی تھی۔ اس کا شعلہ عام گیس کے برنر سے کافی تیز تھا۔ یعنی نسبتاً جلدی چیز پک جاتی تھی۔ چائے ابلنے کے ساتھ ہی ارشین نے ناب گھما کر برنر بند کر دیا۔ یہ "سوغات" اسے شہر کی خاک چھانتے ہوئے ایک دکان سے ملی تھی۔ اس نے فوراً سے پیشتر خرید لی کہ لکڑیاں جلا کر آگ دہکانے اور اس پر کھانا پکانے کا عمل حد درجہ تکلیف و کلفت کا باعث تھا۔ مہران اس "عجوبے" کے علاوہ بھی دیگر نئی چیزیں کچن میں آراستہ دیکھ رہا تھا مگر انا ایسی قیامت کی تھی کہ پوچھ کے نہیں دیا۔ دیکھ کر نظر انداز کر دیا۔ البتہ اس کی چوڑیوں بھری کلائی پر نظر ضرور ٹھہری تھی جہاں مزید دو چوڑیاں کم ہو چکی تھیں۔

"یہ لیں۔" ارشین نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کا کپ، سلور کی پلیٹ میں تلا ہوا انڈا، رومال میں لپٹے دو پراٹھے اور خالہ برکتے سے خریدے ہوئے اچار کی چند پھانکیں سلیقے سے سجی تھیں۔

نجانے مہران کو کیا ہوا۔ وہ ٹرے کو ہاتھ لگائے بغیر ایک دم کچن سے باہر نکل گیا اور جب ارشین اس کے اقدام پر حیرت سے سوچتی ہوئی پیچھے نکلی تو وہ تب چابیاں اٹھا کر پھاٹک کے باہر کھڑی جیپ کا لاک کھول چکا تھا۔

"بات سنیں ایس پی صاحب۔!" وہ حیران و پریشان اس کارروائی کی وجہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"ایسا کیا ہوگیا۔ میں نے تو کچھ کہا ہی نہیں جو۔" وہ دل میں سوال جواب کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں جیپ اسٹارٹ ہوگئی۔ مہران اس کی بات پر توجہ دیئے بنا گولی کی طرح جیپ اڑا کر لے گیا۔

وہ گیلی مٹی پہ بنے ٹائروں کے گہرے نشان دیکھتی رہ گئی۔

"کیا شاہانہ مزاج پایا ہے بادشاہ سلامت نے۔ ہم تو لب ہلانے کے قصوروار بھی نہ تھے پھر کیا بات ناگوار خاطر گزری حضور کو۔" وہ مرجھائے ہوئے انداز میں اندر آ گئی۔ ناشتے کے نام پر چند لقمے زہر مار کر کے برتن سمیٹے پھر گوگی بوا کے پاس آ گئی جو اپنا ناشتہ ختم کر چکی تھی۔ اب وہ گلی کا چکر لگانے کیلئے چادر کی بکل مار کر اپنی لمبی سی ڈانگ ٹیکتے ہوئے باہر نکل رہی تھی۔

"بوا! دھیان سے جانا۔ رات بڑا مینہ برسا تھا۔ راستوں پہ پھسلن ہوگی۔" ارشین نے مقدور بھر اشاروں کے ذریعے بوا کو سمجھایا۔ بوا زور زور سے سر ہلاتی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔

ارشین گھر کے کاموں سے نپٹ کر ایزل کے آگے جت گئی اور انہماک سے اپنا کام مکمل کرنے لگی۔

تلاش بسیار کے بعد شہر میں ڈیکوریشن پیسز اور پینٹنگز کی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھنے والے "یاسین ورائٹی سنٹر" کے مالک محمد یاسین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنا اور اپنے کام کا حوالہ دینے کے بعد ارشین نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے کھرے انداز میں صاف بتا دیا تھا۔

"دیکھیں بی بی! ہم صاف اور سیدھی بات کریں گے۔ بے شک آپ کی بنائی ہوئی تصویروں نے بڑا بزنس کیا ہے۔ یقیناً وہ بہت اچھی بھی ہوں گی لیکن بات یہ ہے کہ اسلام آباد کے مقابلے میں نارووال ایک چھوٹا سا عام سا شہر ہے۔ یہاں اردگرد کے زیادہ تر لوگ محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ گاؤں سے روزگار کیلئے یہاں بسے ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ کم ہے۔ آرٹ کی سمجھ بوجھ تو خیر کیا ہوگی۔ صاف لب و لہجے میں اردو یا انگریزی بول لیں تو سمجھو مال کر دیا ہے۔ فقط شہر کا متمول طبقہ گھر کی ڈیکوریشن میں دلچسپی رکھتا ہے مگر اسے بھی صحیح معنوں میں فن کے قدردان نہیں کہا جا سکتا۔ سجاوٹ کے نام پر وہ ہر طرح کی الا بلا چیزیں گھر میں بھر لیتے ہیں۔ اس لئے آپ

کی بنائی ہوئی پینٹنگ ہم اسی صورت میں خرید سکتے ہیں جب اس کی قیمت ہمیں سوٹ کرے اور ہماری آفر یقیناً آپ کی توقع سے بے حد کم ہوگی۔ یوں سمجھ لیں جس تصویر کے آپ کو بارہ ہزار ملتے ہیں اس کے ہم زیادہ سے زیادہ دو ہزار دیں گے اگر منظور ہوں تو بسم اللہ کیجئے اور اس ماہ ہمیں دو اعلیٰ قسم کی پینٹنگز بنا دیجئے۔ ہاں اس کو فریم کرانے کا ذمہ ہمارا ہوگا۔"

ارشین کو آمدن کا ذریعہ درکار تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہوتا سو اس نے ہامی بھر لی تھی۔ حاکو تانگے والا اس کے ساتھ تھا۔ اس نے محمد یاسین سے حاکو کا تعارف کروا کر بتا دیا تھا۔

"میں دو ہفتے بعد اس آدمی کے ہاتھ پینٹنگز بھجوا دوں گی۔ اسی کو پے منٹ کر دیجئے گا۔ اعتبار کا بندہ ہے۔"

ارشین نے دکان کے مالک سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کسی کو اپنی پورٹریٹ بنوانے میں دلچسپی ہو تو اسے مطلع کر دے کیونکہ وہ اس فن میں بھی مہارت رکھتی ہے۔ دونوں تصویریں مکمل کرنے کے بعد اس نے احتیاط سے کاغذ میں لپیٹیں اور حاکو تانگے والے کے گھر چلی آئی۔

"حاکو بابا! یہ یاسین ورائٹی سنٹر کے مالک کو دینی ہیں۔ میں نے رقعہ لکھ دیا ہے اس کے نام۔ وہ پیسے آپ کو دے دے گا۔"

"ٹھیک ہے پتر۔ تو فکر نہ کر۔ میں اکھاں بند کر کے اوتھے پہنچ جاواں گا۔ چل وئی میریا شیرا۔"

حاکو پگڑ سنبھال کر جست لگاتے ہوئے تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا اور گھوڑے کو چھڑی سے ششکارنے لگا۔ "ابا! میں کہہ رہا ہوں۔ میں چلا جاتا ہوں باجی کا کام کرنے۔" حاکو کا پندرہ سولہ سالہ شوخ و شریر لڑکا پیرو مچلا تھا۔

"ارے چل حرام خورا۔ مینوں خبراں نے تیری آوارگیاں دی۔ سویر سے تانگہ لے کر کتے کی طرح شہر میں گھوم پھر کے ادھی رات کو واپس مڑیں گا۔" حاکو نے چھڑی اپنے لونڈے کے مارنے کی کوشش کی مگر وہ ڈھٹائی سے ہنس کر وار بچا گیا تھا۔

"بابا آپ میرے سے کوئی کام نہیں لیتیں۔ ہر ویلے ابے کو ہی ساتھ لے جاتی ہیں۔" باپ کے جانے کے بعد پیرو نے جیسے بسور کر شکایت کی۔ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کی جھجک دور ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس میں ارشین کی خاموش و سادہ فطرت اور ملنساری کا بھی دخل تھا کہ آس

پڑوس کے لوگ اجنبیت کی دیوار گرانے لگے تھے۔

"لے جاؤں گی تمہیں بھی اگلی بار۔ ابھی تو بڑے کام پڑے ہیں۔" اس نے پیرو کے کان کھینچ کر تسلی دی۔

شام کو حاکو واپس آیا تو ارشین نے اس کی محنت اور بھاگ دوڑ کے صلے میں سو روپے زبردستی تھما دیے۔

"او پتر اے کی گل ہوئی۔ لے دسو بھلا۔" وضع دار بوڑھا احتجاج کرتا رہ گیا۔

"کچھ نہیں حاکو بابا۔ یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اپنے گھوڑے کے چارہ پانی کے لئے رکھ لو۔ میرے کام کے لئے اسے اتنی دور دوڑا کر لے گئے تھے۔"

اس نے پورے چار ہزار ارشین کی ہتھیلی پر رکھ دیے تھے۔ اتنا تو اس کا حق بنتا تھا۔

حاکو کو رخصت کرنے کے بعد اس نے ایک ہزار کا نوٹ ہفتہ بھر کے سودا سلف' خالہ برکتے کے دودھ اور انڈوں کے حساب کتاب اور سبزی خریدنے کے لئے نکالا اور باقی پیسے سنبھال کر سبز پٹ والی الماری میں رکھ دیے۔

زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل ہی پڑی تھی آخر۔

☆☆☆☆☆

امبرین کو لیلیٰ شاہ کی طرف سے اتنے پرتپاک استقبال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو بڑی ڈری سہمی وسوسوں میں گھری "لیلیٰ منزل" آئی تھی کہ اب آئے بنا چارہ نہ رہا تھا۔

اس نے بہت دفعہ نظر بچا کر بی بی کے بٹوے سے رقمیں پار کی تھیں مگر تاکے۔ انہیں پتا چل گیا کہ یہ جو ہر دوسرے تیسرے دن پرس سے پانچ سو کا نوٹ غائب ہو جاتا ہے اس کاروائی میں گھر کے بندے کا ہاتھ ہے۔

وہ ایک ایک پہ چیختی چلاتی تھیں۔ امبرین سر نیہوڑائے' گھنی بنی' منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہی۔ شاہین نے بار بار معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا تاہم اس نے ماں کو "چور" کی نشاندہی نہیں کی کہ ایسی صورت میں امبرین اس کی کھال اتار دیتی۔

آخر کار یہ کہ بی بی جان نے پرس کسی محفوظ اور خفیہ جگہ منتقل کر دیا جسے امبرین تلاش بسیار کے باوجود نہ ڈھونڈ پائی۔

پیسوں کی اسے سخت ضرورت تھی کہ رقم کے بغیر سگریٹ نہیں خرید سکتی تھی۔ جب نشے کی طلب نے حد سے سوا ستایا تو کوئی چارہ نہ پا کر وہ کالج کے اوقات میں پیریڈ چھوڑ کر لیلیٰ منزل چلی آئی تھی۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ فی الحال وہ لیلیٰ شاہ سے ادھار سگریٹ مانگ لے گی اور اس کے بدلے اس سے سفارش کرے گی کہ اسے کسی جگہ پارٹ ٹائم جاب دلا دے تاکہ وہ کچھ پیسے کما سکے۔

"لیلیٰ منزل" کریم کلر کی ماربل ٹائلز سے بنی ہوئی شاندار اور وسیع و عریض شاہانہ عمارت کا نام تھا جس کی بکونی پیشانی پر "لیلیٰ منزل" حروف وائٹ ماربل سے کندہ کیے گئے تھے۔ چاروں پلرز بھی سفید ماربل کے تھے۔ فرش سیاہی مائل شیشے کی طرح کے چمکتے دمکتے شفاف قیمتی ٹائلز کا تھا۔ پاؤں رکھتے ہوئے یوں گمان ہوتا جیسے ابھی سیاہ چندے والی پانی کی جھیل میں قدم جا پڑیں گے۔

عمارت دو حصوں پر مشتمل تھی۔ گیٹ کھلتے ہی سامنے پورچ نظر آتا تھا جس کے دائیں طرف مرکزی عمارت تھی اور بائیں طرف ایک سیدھ میں تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کی چھت پر ایک بورڈ آویزاں تھا۔ "لیلیٰ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ فار ویمن"۔

انسٹی ٹیوٹ میں متعلقہ اساتذہ اور لڑکیوں کی چہل پہل تھی۔ معمول کے مطابق کلاسز ہو رہی تھیں۔

اتفاق سے لیلیٰ شاہ اسے مرکزی عمارت کے آگے بنے ہوئے نفیس گھاس والے لان میں میوزک کی تال پر ایروبکس کرتی مل گئی تھی۔ وگرنہ اسے عمارت کی بھول بھلیاں ہراساں کر دیتیں۔

"آؤ چاند' اندر آ جاؤ۔" لیلیٰ اسے ہمراہ لئے مرکزی عمارت کے براؤن ٹنٹڈ گلاس ڈور کا ہینڈل پیک پش کرتی ہوئی اندر آ گئی۔

"میڈم! آپ کا فون' انگلینڈ سے کوئی جارج ایمرسن بات کر رہے تھے۔" چھتیس سینتیس برس کی گہری سانولی' دبلی پتلی معمول سے کچھ زیادہ ہی لمبی عورت مودبانہ مخاطب تھی۔

"اوکے' میں دیکھ لیتی ہوں۔" لیلیٰ نے اس کے ہاتھ سے کارڈلیس لے لیا۔

"تم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ بڑی خاص مہمان ہیں۔ اپنے گھر کی ہی سمجھ لو۔ اب تم اکثر اسے یہاں دیکھو گی اور امبرین! یہ تارا ہے۔ میری آنکھ کا تارا۔ میرے بیشتر معاملات اور گھر

کا حساب کتاب بھی دیکھتی سنبھالتی ہے۔"

وہ اونچا سا قہقہہ اچھال کر بڑی تندہی سے انگلش میں فون پر مصروف ہوگئی۔ تارا اسے ساتھ لئے آگے بڑھ گئی۔

"تشریف رکھیئے۔" اندر داخل ہوتے ہی امبرین کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ڈرائنگ روم کا رقبہ اتنا زیادہ تھا کہ اتنی جگہ میں عام گھروں کے تین ڈرائنگ رومز بن سکتے تھے۔

آف وائٹ بے حد دبیز کارپٹنگ' تین صوفہ سیٹ' ایک آف وائٹ' دوسرا گرے اور تیسرا لائٹ براؤن اور ان کے آگے رکھی گلاس ٹاپ نفیس ٹیبلز کرسٹل کے بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز' نہایت قیمتی اور نادر و نایاب پتھروں سے بنے مختلف نمونہ جات اور دیواروں پر مرصع اعلیٰ قسم کی پینٹنگز۔

امبرین اتنے پرتعیش طلسم کدے میں کھو کر رہ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بُتیں ٹھہر گئی ہوں۔

اس نے کبھی خواب میں بھی ایسا حسین ڈرائنگ روم اور عالی شان محل نما گھر نہیں دیکھا تھا۔

اسے بیٹھے بمشکل تین منٹ گزرے ہوں گے جب تارا مشروبات سے لدی ہوئی ٹرالی گھسیٹ کر اس کے عین سامنے لے آئی۔

"شوق فرمایئے۔"

کرسٹل کے بھارتی غیر ملکی واٹر سیٹ کی نفاست و ندرت تو ایک طرف' وہ تین منزلہ ٹرالی پر سجی مشروبات کی بے شمار اقسام دیکھ کر بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی تھی۔

پہلی منزل پر ہر قسم کے پھل کے جوسز' ملک شیک اور فراسٹ وغیرہ تھے۔ دوسری پر پیپسی' مرنڈا سیون اپ اور اسی طرح کی سافٹ ڈرنکس کے ٹن تھے۔ تیسری میں مارٹینی کی سبز بوتل کے ساتھ بیئر کے ٹن اور ساتھ میں کرسٹل کی کٹوری میں آئس کیوبز رکھے تھے۔

"کیا پسند کریں گی مس۔ اگر ڈرنک بنانا ہو تو بتایئے۔"

ٹرینڈ اور ایکسپرٹ ملازمہ نے تیسری منزل کی طرف اشارہ کیا لیلیٰ شاہ کے خاص مہمان "اس" سے شغل ضرور فرماتے تھے۔ امبرین نے گو کہ کبھی ان خرافات کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا البتہ اتنا عرصہ ثنا گروپ کے ساتھ گزارنے کے بعد شراب کی مختلف اقسام کے بارے میں کافی

کچھ جان گئی تھی۔

"نن نہیں۔ بس پیپسی ٹھیک ہے۔" اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ہکلا کر کہا۔

اسی اثنا میں لیلیٰ شاہ واپس آ چکی تھیں۔

"دھیرج سے بھئی' ابھی نئی نئی مہمان ہوئی ہیں ہمارے ہاں۔ تم تو پہلی ہی "اینٹری" میں کلائمکس تک لے جانے کی سبیل کر رہی ہو۔"

لیلیٰ شاہ امبرین کے قریب صوفے پر بیٹھ کر ٹانگ پہ ٹانگ جما کے ہنسی تھی۔ امبرین اس کی قربت پر سمٹ سی گئی۔ جانے وہ اس عورت کے سامنے خود کو اتنا نروس اور بوکھلایا ہوا کیوں محسوس کرتی تھی۔

"ایزی لیل کر دمیری جان۔ کہاں اس چار دیواری کے اندر کوئی غم' کوئی دنیاوی پریشانی تمہارے پاس نہیں بھٹک سکتی۔" لیلیٰ نے اس کا کندھا دبایا۔ تارا نے اس کے اشارے پر ڈرنک بنا کر ہاتھ میں تھمائی اور باہر نکل گئی۔

"آ' آنٹی۔ وہ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ کچھ دیر بعد میرا بھائی مجھے لینے کالج پہنچ جائے گا۔ اس کے آنے سے پہلے مجھے کالج کے گیٹ پر موجود ہونا چاہئے۔ میں آپ سے سگریٹ کا پیکٹ لینے آئی تھی۔ میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں لیکن میں عنقریب آپ کو قیمت ادا کر دوں گی۔"

بڑی دیر بعد وہ ذہنی طور پر تیار کئے گئے مکالمے کو لیلیٰ کے روبرو دہرانے کے قابل ہوئی تھی۔

"تمہارا یہاں تک آنا ہی قیمت چکانے کے برابر ہے۔ غیروں جیسی باتیں کیوں کرتی ہو چندا۔" لیلیٰ نے اٹھ کر کونے پر بنے خفیہ خانے سے پیکٹ نکال کر اس کی گود میں ڈال دیا۔

"بے حد شکریہ آنٹی۔" امبرین نے متشکرانہ نظروں کا خراج دیا پھر جھجکتے ہوئے بات کا سرا جوڑا۔

"میں کوئی جاب کرنا چاہتی ہوں آنٹی! کوئی ایسا کام جس میں اوقات کار مختصر ہوں اور دن کی روشنی میں ہوں کیونکہ مجھے گھر والوں کی طرف سے بے حد منت سماجت کے بعد مشکل سے باہر نکلنے کی اجازت ملی بھی تو وہ "زنانہ" قسم کی ایکٹویٹی کے لئے ہی مل سکے گی۔"

"میرے پاس مختصر مدت میں بغیر کسی مشقت کے بیٹھے بٹھائے پیسہ کمانے اور دولت مند

ہونے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔" لیلیٰ کو اس کی خواہش اور درخواست پر از حد مسرت ہوئی تھی۔ (مچھلی خود بخود جال میں آ رہی ہے۔)

"نہیں آنٹی!" امبرین نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیا۔ "میں" اس" طرح کی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ مجھے ایسی ماڈلنگ سے حاصل کردہ دولت و شہرت کی طلب ہے۔ مجھے صرف اتنا درکار ہے جس سے میری ضروریات پوری ہو سکیں۔"

لیلیٰ بے حد پراسرار انداز میں مسکرائی۔

"ٹھیک ہے جانم! ابھی مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔" لیلیٰ شاہ بڑبڑائی پھر سنبھل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سنو میرے پاس تمہارے لئے ایک جاب ہے۔ اگر تم کرنا چاہو تو۔ اس گھر کی دوسری اور تیسری منزل میرے فوٹو گرافی کے کام کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری اسٹوڈیو کے اور تیسری منزل پہ تصویریں ڈویلپ کرنے کا انتظام ہے۔ یہاں میری اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہ علاقہ خاص ہے جہاں صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو قدم رکھنے کی اجازت ہے۔ مجھے اپنے کام کے لئے ایک قابل اعتبار اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ گو کہ تارا میری اپائنٹ منٹس' شیڈول اور شعبے سے متعلقہ ساز و سامان کا دھیان رکھتی ہے مگر اب کام اتنا پھیل گیا ہے کہ ایک آدمی ڈیوٹی ناکافی ہو گئی ہے۔ میں چاہتی ہوں تم یہ سیٹ سنبھال لو۔ میں تمہیں معقول تنخواہ دوں گی اور ٹائمنگ بھی تم اپنی سہولت کے مطابق ایڈجسٹ کر لینا۔"

"مگر میں گھر والوں کو کیا بتاؤں گی۔ میرا مطلب ہے کچھ دنوں میں امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ پیپرز کے بعد کالج چھوٹ جائے گا۔ میں گھر سے کس طرح نکل پاؤں گی؟" وہ نیم رضامندی سے گویا ہوئی۔

"کہہ دینا تم یہاں انسٹی ٹیوٹ سے ٹیکنیکل کورس کر رہی ہو اور ادارہ ہنر سکھانے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ وظیفہ بھی دیتا ہے۔"

لیلیٰ شاہ کا دماغ کس قدر شاطر اور برق رفتار تھا کہ ایک منٹ میں مناسب وجہ بھی تلاش کر لی۔ امبرین قدرے مطمئن ہو گئی اور دیواروں کی آرائش دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی ایک تصویر پر جا رکیں۔ آئل پینٹنگ تھی۔

جیسے حافظے میں کوئی خاکہ روشن ہوا۔

یہ اتنی جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے؟

کہاں دیکھا ہے؟

اس نے بھنویں سکیڑ کر سوچا۔

بہت سارے لوگ نارنجی آتشی سورج کو ہاتھوں میں اٹھائے قبر میں دفن کر رہے تھے۔ پس منظر میں سخت تاریکی اور خوف و ہراس سے دھواں دیتی فضا کا تاثر نمایاں تھا۔ قبر سے کچھ فاصلے پر چند درخت آندھیوں کی زد میں بری طرح لرز رہے تھے۔

بڑی عجیب' پراسرار اور معنی خیز پینٹنگ تھی۔ دیکھ کر دل و دماغ پر عجب بوجھل پن اور سراسیمگی طاری ہو جاتی تھی۔

پھر اسے یاد آ گیا۔

"یار! میں نے پوری توانائیاں صرف کر کے ایک تاثر ابھارا ہے۔ دعا کرو اس تصویر کو اس کا صحیح قدردان مل جائے۔"

چند سال پہلے کا ایک سین یادداشت کے پردے لہرایا۔ ارشین آخری اسٹروک لگانے کے بعد تھک کر چور ہو گئی تھی۔ خود کو کاؤچ پر گراتے ہوئے اس نے امبرین کو مخاطب کیا تھا۔

تھوڑی کوشش کے بعد اسے پینٹنگ پر ارشین کا نام اور دستخط بھی نظر آ گئے۔

"جس کی نظر پہلی مرتبہ پڑتی ہے وہ اسی طرح بھٹکتا ہے لیکن تم یقیناً یہ پہلے بھی دیکھ چکی ہو گی۔ اپنی بہن کے اسٹوڈیو میں۔"

لیلیٰ نے اس کا انہماک ملاحظہ کرتے ہوئے خوبصورتی سے کریدا۔

"جی' جی....." اس نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ یاد ماضی کی ایک ہلکی سی کسک آنکھوں میں دھند بن کر پھیل گئی تھی۔

(کہاں ہوں گی آپ۔ ایس پی کی عنایات سے بھٹکتی ہوئی یا اس کے ظلم کی آگ میں جلتی ہوئی۔ کیا محسوس کرتی ہوں گی بھلا۔ کتنی زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔ آپی' کیا آپ کو کبھی میرا خیال نہیں آیا؟) اک آہ بے اختیار دل سے نکلی تھی۔

"اوہو' کڑوی نہیں ہے۔ شیری تو یوں بھی کافی لائٹ ہوتی ہے۔ ذرا ذائقہ تو چکھو۔ عادت

بھی ہو جائے گی۔" لیلیٰ نے بڑے خوبصورت گلاس میں مشروب انڈیل کر بصد اصرار سے اسے پلایا۔

ابتدائی چند گھنٹوں کے ساتھ ہی اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ فوراً کھانسی شروع ہوگئی۔ وہ بے اختیار سینہ مسلنے لگی مگر آب سرور نے اپنا اصل رنگ جمانا شروع کیا۔ امبرین کو خبر بھی نہ ہوئی وہ دو پیگ پی گئی۔ لیلیٰ شاہ پر مسرت نظروں سے اس کی کارکردگی دیکھ رہی تھی۔

"یہ تصویر ایک لحاظ سے میرے لئے بہت یادگار ہے۔" لیلیٰ شاہ کی نظریں پینٹنگ پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ میری شکست، میری توہین اور میری تکلیف دہ مگر محبوب یادوں کی علامت ہے۔"

پھر اس نے نظریں موڑ کر امبرین کی طرف دیکھا۔

"تمہاری بہن آج کل کہاں ہوتی ہے؟"

"میں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔" امبرین گھبرا گئی۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔

لیلیٰ ناقابل فہم انداز میں مسکرائی۔

"کیا یہ سچ ہے کہ اس کی شادی ایس پی مہران سے اس کی ماں کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے اور ایس پی نے اسے اپنے آبائی گاؤں میں چھپا رکھا ہے۔"

"ہاں ایسا کچھ سنا ہے۔" امبرین گومگو کے عالم میں انگلیاں مسلنے لگی۔

"میرا مطلب ہے ہمارا ڈائریکٹ لنک نہیں ہے ان سے۔"

"تو میری جان! بناؤ ناں ڈائریکٹ لنک۔" لیلیٰ شاہ طمطراق سے مسکرائی اور غور سے امبرین کا چہرہ پڑھنے لگی۔

"میں کچھ بھی نہیں۔"

"سمجھ جاؤ گی۔ سب سمجھ جاؤ گی آہستہ آہستہ۔ فی الحال یہ بتاؤ تمہارے اپنی بہن سے تعلقات کیسے ہیں۔ میرا مطلب ہے روایتی بہنوں کی طرح حاسدانہ اور برابری کی سطح کے ہیں یا دوستانہ قسم کے؟"

ایک زہر خند تبسم امبرین کے ہونٹوں پر رقصاں ہوگیا۔

"ہوتے تھے کبھی "تعلقات" بھی۔ اب تو بس تماشا رہ گیا ہے دیکھنے دکھانے کو۔ خود تو جو

خوار ہوئی سو ہوئی، میرے نصیب کے دروازے پر بھی تالہ لگا گئی۔ برباد دل لئے بیٹھی ہوں اب۔"

امبرین کی نظریں دائیں ہتھیلی پر جمی تھیں۔

"اچھا۔" لیلیٰ شاہ نے ایک پر معنی اور مطمئن نگاہ اس پر ڈال کر سر ہلایا۔ اس کی دائیں ٹانگ مسلسل حرکت میں تھی۔

"میں چلتی ہوں اب۔ عدنان مجھے لینے کالج کے گیٹ پر پہنچنے والا ہوگا۔" کچھ دیر بعد وہ گھڑی دیکھ کر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

لیلیٰ شاہ نے اسے پرتپاک انداز میں رخصت کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ کئی بار اس کی وضاحت کر چکی ہوں۔" نینی نے شال بیگ میں رکھی۔

"پھر آپ شیخ باندھ کیوں جا رہی ہیں اسلام آباد کو چھوڑ کے۔" سفیان نے سر سے پیر تک بے چینی و بے کلی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"یوں ہی، آب و ہوا بدلنے کے لئے۔" وہ مسلسل بیگ پر جھکی ہوئی تھیں۔ "مدت گزر گئی چکر لگائے۔ منشی جی بار بار اصرار کر چکے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اگلے ہفتے ان کے منجھلے بیٹے کی بارات ہے۔ اسی بہانے شادی بھی اٹینڈ ہو جائے گی۔"

سفیان پیشانی مسلتا ہوا ہولے ہولے ٹہلنے لگا۔ گاہے گاہے نینی کے سنجیدہ و پرسکوت چہرے کو دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

کوئٹہ کے لئے سیٹ کی بکنگ کل ہی ہو چکی تھی۔ سفیان انہیں ایئرپورٹ تک چھوڑنے جا رہا تھا۔ جانے سے پہلے نینی نے مہران سے ملنے کی زحمت نہیں کی۔

"بھائی جان سے نہیں ملیں گی؟ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔"

بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر نکلتے ہوئے سفیان نے انتہائی تعجب سے انہیں دیکھا۔ وہ شال اوڑھ کر گھڑی باندھنے کے بعد خاموشی سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

"نہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

سفیان نے اذیت کی برف قلب پر گرتی محسوس کی۔

(کس کی نظر لگ گئی ہمارے ہنستے بستے خوش وخرم گلشن کو۔) عام حالات ہوتے تو ایسا ہو سکتا تھا؟ نینی' جن کی صبح بھائی جان کے درشن کے بغیر نہیں ہوتی تھی' جن کا کھانا انہیں سامنے بٹھائے بغیر حلق سے نہیں اترتا تھا' جن کی آتی جاتی سانسیں انکی زندگی سے بندھی تھیں۔ آج کس قدر اجنبیت سے ان کے بارے میں اظہار خیال کر رہی ہیں۔

اس بار انہوں نے جاتے وقت ناظر کو امور خانہ داری اور دیگر گھریلو معاملات سے متعلق ہدایات بھی نہیں دیں۔ یوں رخصت ہوئیں جیسے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا مسافر۔ نہ پیچھے کی پروا نہ آئندہ واپسی کا خیال وامکان۔

سفیان انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس گھر آیا تو اسے ہر شے سے اداسی اور سناٹا برستا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے کسی انجان جگہ پر آ گیا ہو۔ کیا یہ وہی آفریدی ہاؤس ہے؟

ہنگاموں کا مرکز۔

شرارتوں کا گڑھ۔

قہقہوں کا سنگم۔

خوشیوں کا گہوارہ۔

یوں لگتا ہے اس کے چپے چپے میں کوئی آسیب آ بسا ہو۔

مہران کی جیپ پورچ میں کھڑی تھی۔ گویا آفس سے آ چکا تھا۔

بنا کسی ارادے کے بلاوجہ سفیان کے قدم اس کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

"خوامخواہ کی ضد یا بحث سے کچھ حاصل نہیں نازش۔ میں نے بتایا ناں ابھی آپ اس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ جہاں بھی ہے' زندہ ہے' خوش ہے۔ فی الحال میں آپ کو اس کے پاس نہیں لے جا سکتا۔"

دروازے کے باہر ہی سفیان کے قدم ٹھٹھک گئے۔ مہران غالباً فون پر نازش سے مخاطب تھا۔

"میں آل ریڈی ٹینس ہوں۔ میری تکلیف کو اور مت بڑھائیں۔ نینی کا رویہ دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے خود کو شوٹ کر لوں۔" مہران کا لہجہ شکستہ تھا۔

"کیا مل گیا اپنی منوا کر تمہیں۔" وہ بہت تھکے تھکے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "نہ خود بس سکیں' نہ

"اسے" بسا پائیں اور نہ میری ذات کو کوئی سکھ مل سکا۔ فقط خوامخواہ کی خواری۔ حاصل وصول کچھ نہ ٹھہرا۔ زندگی ایک سیدھی پٹڑی پر چل رہی تھی تم نے بھٹکا کر جانے کہاں پہنچا دیا۔ اب تو اپنی پہچان بھی مشکل ہو گئی ہے۔"

کچھ دیر بعد باتوں کی آواز ختم ہو گئی۔ گویا فون رکھا جا چکا تھا۔

سفیان عجیب سی سوچوں کے حصار میں چکراتا دستک دے کر اندر آ گیا۔ مہران بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے سامنے دیوار کو گھور رہا تھا۔

اس کی آمد پر نظروں کا زاویہ بدلا۔

"نینی شیخ ہانڈہ چلی گئی ہیں بھائی جان۔" "معاً" کمرے کے سکوت میں مہران کی دھیمی آواز ابھری۔

"کیا تم دن کوٹ گئے تھے۔" مہران اس سے نظر ملانے سے بدستور گریز کر رہا تھا۔

"جی۔" سفیان نے گہری سانس لے کر اعتراف کیا۔ اس نے بھی نظر جھکا لی تھی شاید بڑے بھائی کا شرمندہ اور پشیمان روپ دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

"اس سے ملے تھے؟"

"جی۔"

"پھر تو یقیناً" سب کچھ جان بھی گئے ہو گے۔ آ کر مجھ سے پوچھا کیوں نہیں۔ نینی سے کیوں نہ کہہ دیا۔"

"میں آپ کی طرف سے "پہل" کا منتظر تھا۔" سفیان نے نگاہ اٹھائی۔ "بھائی جان' جو کچھ ہوا اسے نرم سے نرم الفاظ میں افسوس ناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ میں آپ سے عمر اور عقل دونوں میں چھوٹا ہوں۔ شاید آپ میری بات کو ذاتیات میں مداخلت قرار دیں لیکن میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کریں۔ ارشین آپا کو گھر لے آئیں۔ انہیں ان کا جائز مقام دیں۔ نینی کے ذہن اور جذبات کو جو شاید جھٹکا لگا ہے ایسے میں ان کا ردعمل فطری امر ہے لیکن بہرحال وہ ایک ماں ہیں۔ نرم مزاج اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ زیادہ دیر تک پتھر نہیں بن سکیں گے۔ موم ہو جائیں گی۔"

مہران بیڈ سے اٹھ کر وارڈروب کھولنے لگا۔

"تم ابھی بچے ہو۔ معاملے کی بہت سی پیچیدگیوں سے ناواقف ہو۔ حقیقت صرف وہی نہیں ہوتی جو سنائی جائے۔ دکھائی دینے اور محسوس کرنے والی چیزیں بھی حقیقت کہلاتی ہیں۔"

"مگر ایسا کب تک چلے گا بھائی جان۔" سفیان اتنا سیریس اور متفکر کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

"میرے لئے اس وقت نجی کی ناراضگی سے بڑھ کر اہم کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

وہ کپڑے نکال کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ گویا گفتگو ختم کرنے کا اشارہ دیا ہو۔ سفیان آزردہ خاطر، مکدر طبیعت لئے کمرے سے نکل آیا۔

"نازش اپیا سے بات کروں گا۔ شاید دل بیٹھ کے کوئی مناسب حل نکل ہی آئے۔" اس نے دل میں ٹھان لی۔

☆☆☆☆☆

عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔

ارشین اپنے اور گونگی بوا کے جمع شدہ میلے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی باندھ کے "سوئے" پہ لے آئی تھی۔

یوں تو اتنی دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کہ تین چار جوڑے تھے۔ گھر نکلے پہ بھی دھل سکتے تھے مگر یوں ہی گھر کی یکسانیت میں لپٹی خاموش فضا سے فرار حاصل کرنے اور نیا تجربہ کر کے دھیان بٹانے کی غرض سے دو نہر پہ چلی آئی تھی۔

کپڑے دھونے کے لئے اس نے جو کنارہ منتخب کیا تھا وہ عام گزرگاہ سے قدرے ہٹ کر اور ویران سا تھا۔ فصلوں اور ان کے بیچ کہیں کہیں درختوں کا سبزہ، پہاڑی ٹیلے اور ان پہ بچھی زرد خشک جھاڑیوں کے جھرمٹ اور دفاع کی غرض سے انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں بنائے گئے مٹی کے پرانے مورچے، لال مٹیالے رنگ کے پائیوں پر مشتمل سوئے کے اطراف کا حسن دوبالا کر رہے تھے۔ پہاڑی ریتلے ٹیلے سے کچھ پرے پختہ سڑک کے پاس ایک خستہ حال پل بھی تھا جو اب استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پل کے نیچے سرنگ سی بنی ہوئی تھی جہاں وہ بکریاں آرام کر رہی تھیں۔

دن ڈھلنے کے ساتھ سورج کی تیکھی عمودی شعاعیں خود بخود نرم اور ترچھی ہو گئی تھیں۔ ان کی چمک اور حدت ٹھنڈے شفق رنگ اجالے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

وہ اپنے دھیان میں قمیض پر صابن کی ٹکیہ رگڑ رہی تھی جب ریتلے ٹیلے کے پیچھے سڑک سے

گزرتی ہوئی جیپ کا انجن اچانک خاموش ہو گیا۔

اس نے ہاتھ سے جھاگ اتارتے ہوئے مصروف انداز میں سر اٹھایا اور پھر پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

ہلکے آسمانی مردانہ شلوار قمیض میں پشاوری چپل پہنے مہران بے تکلف اور گھریلو سے حلیے میں نہر کے کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ اس کے مقابل تھا۔

شیو بڑھی ہوئی، سبز آنکھوں کے نیچے حلقے، گلابی صحت مند رخساروں کی ماند پڑتی چمک اور ذہنی انتشار کی غماز مضطربانہ کیفیت۔ یہ روپ، یہ انداز ارشین کے لئے قطعی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھا۔

(ایسا کیا ہو گیا اس لوہے کے بنے انسان کے ساتھ۔)

"السلام علیکم۔" اس کے قریب آنے پر ارشین نے آہستگی سے کہا۔ مہران نے سر ہلایا اور ایک ٹھنڈی نگاہ اس پر ڈالی۔

"کپڑے گھر پہ بھی دھوئے جا سکتے تھے۔" اس نے حسب سابق پتھریلے انداز میں "آغاز" کیا۔

"جی۔" اس نے گہری سانس لی۔ جب اعتراض برائے اعتراض کسی کی عادت بن جائے تو بحث و تمحیص سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

"بس تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔ آپ گھر چلیں۔ میں آتی ہوں۔"

لیکن وہ جانے کے بجائے سوئے کے کنارے پر عین ارشین کے سامنے بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ پانی میں ڈال کر چیک کیا۔ پانی خاصا سرد تھا۔ اس نے ارشین کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ انگلیوں کی پوریں سرخ ہو رہی تھیں اور ہتھیلیوں کے کنارے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئے تھے۔

"یہ تو اچھا خاصا سرد ہے" اس نے ہاتھ نکال کر ارشین کی طرف دیکھا۔

"تم کیسے کپڑے دھو رہی ہو اس سے؟"

ارشین کے ہونٹوں پہ مضمحل مسکراہٹ تیرنے لگی۔

ہم تو بہت سے دوسرے ایسے کام بھی کر رہے ہیں جو پہلے کبھی نہیں کئے تھے۔ کیا کریں برداشت میں ہم بھی لوہے کا چنا بنتے جا رہے ہیں؟

مہران باقاعدہ وبغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوئے کے کنارے پر پلاسٹک شیٹ بچھائے دیہات کی دوسری عورتوں کی طرح دوپٹے کو سر پہ منڈھ کے دونوں سروں سے پیچھے کی طرف گرہ لگائے' آستین چڑھائے اور چھپا چھپ کپڑے پر ہاتھ مار رہی تھی۔ سورج کی نارنجی گلابی کرنیں اس کے خوبانی جیسے سنہری رخساروں پر لالیاں بکھیر رہی تھیں۔ اس نے وہی سبز کپڑے پہن رکھے تھے جو گھس گھس کر کثرت استعمال کے باعث اصلی رنگ اور چمک کھو چکے تھے۔

"تم تو پکی دیہاتن لگ رہی ہو۔" مہران بے اختیار مسکرا دیا۔ یہ اس کی پہلی سادہ سی مسکراہٹ تھی جس میں تحقیر و تنفر کا "تڑکا" شامل نہیں تھا۔

ارشین نے خود پہ نگاہ دوڑائی پھر جھینپ کر سر پہ منڈھا دوپٹہ کھول کر اچھی طرح آگے کی طرف کندھوں پہ پھیلا لیا۔

"تم غالباً" اس مقولے پر عمل کر رہی ہو کہ روم میں رہ کے وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔"

"نہیں۔" ارشین نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ "ایک ساتھ' ایک جگہ رہنے سے رہن سہن یا لباس و انداز میں تو ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا ہو سکتی ہے مگر سوچ اور عقائد میں یکسانیت نہیں آ سکتی۔ ان لوگوں کے عقائد بہت ناپختہ اور ضعیف ہیں۔ عشروں سے اندھا دھند غیر شرعی اور غیر منطقی روایت کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ علم سے دوری نے ذہنوں میں اتنی تاریکی بھر دی ہے کہ بعض اوقات یہ جگہ افریقہ کے تنگ و تاریک سیاہ جنگلوں کا کوئی گم شدہ حصہ معلوم ہوتی ہے۔ شاید آپ کو خبر ہو یہاں ایک مقام ہے جو بقول ان کے سانپوں کے بادشاہ "گگا پیر" کی رہائش گاہ ہے۔ اس مخصوص جگہ کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ گگے پیر کی اہمیت کسی ولی بزرگ یا برگزیدہ ہستی سے کم تر نہیں ہے۔ گاؤں کے لوگ اسے خوش کرنے کے لئے چڑھاوے کے طور پر سویاں اور دیگر نذر و نیاز لے کر جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح گگا پیر انہیں اور ان کے مویشیوں کو سانپ کے ڈسنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں سانپ نکل آئے اور اسے ڈس لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گگا پیر اس سے ناراض ہو گیا ہے اور سزا کے طور پر سانپ کو بھیجا گیا تھا۔ جو اپاہ شخص سویاں یا کوئی میٹھا پکا کر اگلے دن پیر صاحب کی "رہائش" پہ حاضری دینے کا پابند ہو جاتا ہے۔"

"مائی گڈنیس۔" مہران کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

"اس کے علاوہ گھروں کے کچھ مخصوص کونوں' دیواروں اور قدیم درختوں کے تنوں میں یہ

لوگ باقاعدگی سے اگر بتیاں سلگاتے ہیں تاکہ ان جگہوں پر ڈیرہ ڈالے جنات و بلیات کے شر سے محفوظ رہیں۔ اگر کسی دن اگر بتی نہ سلگائی جائے تو بقول ان کے جن اور چڑیلیں ناراض ہو کر نقصان پہنچاتی ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔"

"علاوہ ازیں یہاں ایک "بھوتوں کا ڈیرہ" بھی ہے جہاں بھوت' چڑیلیں اور دیگر آسمانی آفات مل کر رقص و سرود کی محفل منعقد کرتے ہیں۔" ارشین مسکرائی۔

"جو ان کے مخصوص احاطے میں قدم رکھتے گا وہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔ ایسا ایک دفعہ سانحہ گونگی بوا کے بیٹے کے ساتھ ہو چکا ہے۔"

اس نے بوا کی قمیض اچھی طرح ملنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے سوئے کے پانی میں ڈبو کر باہر نکالی۔ اس کے بازوؤں کی آستین کہنیوں تک مڑی ہوئی تھیں۔ گدرائے ہوئے اجلے اجلے گداز بازو شفق رنگ کرنوں اور پانی کے قطروں سے جھلملا رہے تھے۔ مہران کی اچٹتی ہوئی غیر ارادی نظریوں ہی اس منظر پر ٹھہر گئی۔

"کبھی وقت نکال کر آیا تو اس ڈیرے کا جائزہ لوں گا۔ خبر تو ہو کس قسم کے "فنکار جن" محفلیں سجاتے ہیں۔ تمہارا کام ختم نہیں ہوا؟ چھوڑو باقی رہنے دو۔ یوں بھی دھوپ ختم ہونے کو ہے۔ گھر چلتے ہیں اب۔" مہران نے ہاتھ بڑھا کر اس کا دایاں بازو گرفت میں لے لیا۔ پانی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بہت سے قطرے ارشین کی کلائی سے مہران کی کلائی مائل چوڑی ہتھیلی میں جذب ہو گئے۔ اس ٹھنڈک میں بھی اک آنچ تھی جس نے آپس کے لمس کو انگارہ بنا دیا تھا۔

ارشین نے تیزی سے کلائی سے کچھ اوپر کے حصے کو اس کی دباؤ بڑھاتی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

"آپ چلیں' میں آ رہی ہوں۔" اس کی جھکی پلکیں لرز گئیں۔

"ساتھ ہی چلتے ہیں۔" اس کا انداز اور لہجہ قطعی تھا۔ پھر اس نے اچانک اس کی کلائی چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔ "اپنی چیزیں سمیٹو فٹافٹ۔ مجھے رات ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔" وہ جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

ارشین نے دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر ایک بالٹی میں ڈالتے ہوئے غور سے اس کی گرفت

سے نکلنے والے بازو کی طرف دیکھا۔ دبیز شفاف جلد پہ انگلیوں کے دباؤ اور سختی سے سرخیاں سی پھیل گئی تھیں۔ بازو کا وہ حصہ سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کنارے پہ بچھی پلاسٹک شیٹ احتیاط سے اٹھا کر جھاڑنے کے بعد اس نے تہہ کر کے بالٹی میں رکھ لی پھر جھجکتی ہوئی جیپ کے پاس آئی۔

مہران نے کھٹاک سے اگلا دروازہ کھول دیا مگر وہ متذبذب کھڑی رہی۔

"اس سیٹ پر وہی بیٹھے گی جو صحیح معنوں میں ذات اور حیات کی شریک ہوگی۔" ماضی میں چھوڑے ہوئے لفظوں کے زہریلے تیر اس کی یادداشت میں پیوست ہو گئے تھے۔

"بیٹھتی کیوں نہیں ہو۔" وہ برہم ہوا۔

"آپ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیں۔ میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھوں۔" اس نے بہت سکون سے کہا۔ مہران کو کچھ یاد آ گیا۔

"کبھی کبھی ہم گھر آئے مہمان کے لئے سب سے اچھا بیڈروم سیٹ کر کے دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ مستقل مالک بن بیٹھا ہے۔ اخلاق و مروت کی وجہ سے ایسا کرنا پڑ جاتا ہے۔ تم بھی یہی سمجھ لو۔" وہ خشک لہجے میں مخاطب ہوا۔

"آپ میرے معاملے میں اخلاق و مروت نہ برتیں۔ کیوں خود پہ جبر کرتے ہیں۔" ارشین اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلی اور بدستور پچھلے دروازے کے کھلنے کا انتظار کرتی رہی۔

مہران نے دانت بھینچتے ہوئے غضب ناک ہو کر اس کی سمت دیکھا' اگلے لمحے زوردار آواز کے ساتھ فرنٹ ڈور بند کیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے زناٹے سے نکل گیا۔

وہ شرمندگی و خجالت کی دھند میں لپٹی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ نہ حیثیت دیتے ہو نہ زندگی سے خارج کرتے ہو۔ تو پھر یہ "بین بین" بھی کیوں۔ کسی کنارے پہ کیوں نہیں لگنے دیتے۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے قدموں کو واپسی کے لئے آمادہ کر پائی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا لوٹنے کے بجائے پیچھے پلٹ جائے۔ دور بہت دور ماضی اور حال کے ہر ناطے کو ادھیڑ کر۔

☆☆☆☆☆

"امبرین! بھئی کہاں غائب ہو جاتی ہو تم۔ کتنے دنوں سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ تمہیں ایک راز کی بات بتانا تھی۔"

آڈیٹوریم کے پیچھے شہتوت کے درخت سے ٹیک لگائے سنسان سے لان کے گوشے میں نیم دراز امبرین کے پاس بیٹھتے ہوئے فاریہ نے دوستانہ خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"کہو' کون سا راز افشا کرنا چاہتی ہو۔" سرخ آنکھوں' بکھرے بالوں اور قدرے مسلے ہوئے یونیفارم میں ملبوس امبرین نے ہاتھ میں پکڑی بوتل کا ڈاٹ لگا کر سائیڈ پہ رکھ دی۔

"یہ کیا پی رہی ہو؟" معاً فاریہ کی نظر بوتل پہ لگے ٹیگ پر ٹک گئی۔

"پڑھ سکتی ہو تم۔" امبرین کا اطمینان' بے پروائی بلکہ ڈھٹائی قابل دید تھی۔ گویا وہ ہر قسم کی تادیب و فہمائش اور تفتیش و انجام سے بے فکر ہو چکی تھی۔

"یہ کہاں سے لی تم نے۔ اتنی مکروہ اور گندی چیز۔" فاریہ کی سانسیں حلق میں اٹکنے لگیں۔ "واڈکا" کا لیبل صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ کیا دیدہ دلیری تھی کہ کالج میں بیٹھ کے پی رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی کی ایک فلاسک کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھی۔

"تمہیں پوچھنے اور تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس کام سے آئی ہو وہ کہو۔"

"کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا امبرین۔ کچھ تو سوچو۔ یہ درسگاہ ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ یہ غلاظت کس نے تمہیں لا کر دی ہے۔" فاریہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

امبرین نے اطمینان سے بوتل بیگ میں ڈال لی۔

"اب کہو اور مری کیوں جا رہی ہو یار۔ قیامت تو نہیں آ گئی۔"

"اور قیامت کیا ہوگی۔" فاریہ کے حواس قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

"میں تمہیں پہلے بھی کہتی آئی ہوں کہ ٹاگروپ سے ہوشیار رہو۔ یہ اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔ ان جیسی لڑکیوں کا اپنا تو کوئی کیریکٹر ہوتا نہیں ہے البتہ شریف لڑکیوں کے کردار کو داغدار کرنے میں کمال کی شہرت رکھتی ہیں۔ تمہارا ان سے بڑھتا ہوا میل جول تمہیں تباہ و برباد کر دے گا امبرین۔ ابھی بھی وقت ہے۔ سوچ لو اور سنبھل جاؤ۔" فاریہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھی۔

"اونہہ' سن لیا اور سمجھ بھی لیا۔ اپنی کہو اب تم۔" امبرین نے ہاتھ ہلا کر جیسے مکھی اڑائی۔ فاریہ افسوس سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دوست ہونے کے ناطے سمجھا ہی سکتی تھی زبردستی احکام تو لاگو نہیں کر سکتی تھی۔ نہ منوا سکتی تھی۔ یوں بھی اب جس طرح امبرین اس سے کٹ کر اکھڑی اکھڑی اور دور دور رہنے لگی تھی اس نے دوستی کے مخصوص مان' مضبوطی اور استحقاق کی جڑوں کو کمزور کر دیا تھا۔

تعلقات میں بے تکلفی کے بجائے جھجک اور ہچکچاہٹ در آئی تھی۔

"سفیان آفریدی کو جانتی ہو نا تم۔ وہی جن کی امی ارشین آپی کی کولیگ ہیں۔ اتفاقاً وہ ہماری جانے والی نکل آئیں یوں آنا جانا ہو گیا۔ امی بتا رہی تھیں انہوں نے سفیان کے لئے بات کی ہے۔ بات پکی کرنے کے لئے انہیں باقاعدہ ہمارے ہاں آنا تھا مگر پھر وہ اچانک ہاسپٹلائز ہو گئیں۔ آج کل کومہ گئی ہوئی ہیں۔ واپسی پر فائنل ہو گا۔"

فاریہ نے سر جھکا کر ہونٹوں پہ در آنے والی خوبصورت مسکراہٹ روکی۔ وہ امبرین کے بھسم کر ڈالنے والے تاثرات نہیں دیکھ سکی تھی۔

"لے گئیں اس کو تم۔ کوئی ڈھنگ کا بندہ نہ چھوڑنا۔ چیل کی طرح جھپٹ لیتی ہو تم میسنی گھنی مشرقی بیبیاں۔ میری بہن صاحبہ ایک چھوڑ دو۔ دو تین کو گانٹھ میں باندھ کے لے گئیں جو بچا اس پہ تم دعویدار بن بیٹھیں۔ بہت خوب' نصیب ہی ایسے ہیں اپنے۔ کیا کیا جائے۔" اس نے دانت پیسے۔

"میں سمجھی نہیں۔" فاریہ ہکا بکا اس کا اشتعال آمیز انداز ملاحظہ کر رہی تھی۔

"ارے جاؤ' بے وقوف کسی اور کو بنانا بی بی۔ دوغلا پن اوڑھ کے فن کاری کے جوہر دکھا کے لڑکوں کو الو بنا کے چلتی بنیں۔ گھٹیا کردار کی گھٹیا لڑکیاں۔ آخ تھو۔" امبرین نے ایک طرف تھوک دیا۔

مارے ذلت و رنج کے فاریہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"تم اپنے ہوش میں نہیں ہو یقیناً۔" فاریہ نے خوف و دہشت سے کانپ کر کہا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"اور یہ سب اس ام الخبائث کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ میں ارشین آپی سے بات کروں گی۔ یقیناً وہ اس صورتحال سے لاعلم ہوں گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ امبرین کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔

"ہاں ہاں کرنا اپنی چہیتی ارشین آپی سے بات۔ اب تو ایک چھت تلے رہو گی دونوں۔ مجھے لوٹ کے خالی کرنے والیوں' اللہ تم لوگوں کی جھولی بھی ہمیشہ خالی رکھے' کوئی سکھ نصیب نہ ہو زندگی میں۔"

امبرین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بھل بھل آنسو رخساروں پر بہنے لگے پھر اس

نے دانت کچکچا کر حق دق کھڑی فاریہ کی طرف دیکھا۔

"رشتے میں تم اس کی دیورانی بن جاؤ گی' ہونہہ' سفیان' مائی فٹ۔" احساس ذلت کی تیز آنچ نے امبرین کی رگوں میں آتشیں سیال بہا دیا تھا۔ آنکھوں میں وحشت اور دیوانگی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ فاریہ کو لگا کچھ ساعتیں جاتی ہیں کہ امبرین ڈھے کر نیچے گرنے والی ہے۔

"کس کی دیورانی؟" اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ مہران بھائی کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ سنا ہے کسی بہت حسین و جمیل ایس آئی سے رشتے کی بات چل رہی ہے۔

"اپنی ارشین آپی کی۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"ابھی تک شرف ملاقات نہیں بخشا کیا۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"مسز ارشین آفریدی' بیگم مہران۔ اب تو جانے کتنے ماہ گزر چکے ہیں یہ معرکہ سر کئے ہوئے۔ کیا تفصیل نہیں سنائی آپ کے جیٹھ صاحب نے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" فاریہ نے بے بسی سے سر تھام لیا۔

"تم نے بتایا بھی تو نہیں ہے۔ مدتوں سے ہماری آپس میں بات چیت نہیں ہوئی۔ ارشین آپی کے بارے میں بھی یہیں تک علم ہے کہ کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر وہ کالج چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ میں نے خیال کیا شاید بحیثیت آرٹسٹ کے مصروفیات بڑھ جانے کے سبب جاب چھوڑی ہے۔ تمہارے گھر گزشتہ ایک سال سے آنا نہیں ہوا۔ دراصل آنٹی کے سرد اور تلخ تاثرات نے مجھے دوبارہ جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں کرتیں۔ حالانکہ بیچ میں کئی بار میرا دل چاہا کہ میں ارشین آپی سے ملوں۔ ان کی خیر خبر دریافت کروں مگر پھر تمہارے الجھے ہوئے بیزار و بیگانہ رویے نے مجھے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ فون نمبر تمہارے بابا جان تبدیل کروا چکے ہیں۔ نیا نمبر دینے کی تم نے زحمت نہیں کی اور میں نے پوچھا نہیں کہ خودداری آڑے آ جاتی تھی۔"

"اب بھی مت پوچھو۔ جاؤ اپنی راہ لو۔" وہ اکل کھرے انداز میں گویا ہوئی۔

"مہران بھائی کی کوئی بیگم نہیں ہیں' کم از کم آفریدی ہاؤس میں۔ ہمارا آئے روز کا آنا جانا ہے وہاں' ہوتی تو نظر نہ آ جاتی۔"

فاریہ بے چاری معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے روہانسی ہو رہی تھی۔

"دکھی بنا کر چپکا دیا ہوگا کہیں۔" امبرین نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ "جادوگروں کا ٹولہ ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"امبرین! خدا کے لئے خود کو سنبھالو۔ کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔" طبعاً مخلص و مہربان فاریہ انتہائی رنجیدگی سے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

لا پلا دے ساقیا پیمانہ ' پیمانے کے بعد
ہوش کی باتیں کریں ' ہوش میں آنے کے بعد

امبرین گنگنائی۔

"ارے ان عیاش امیرزادوں کے بڑے ٹھکانے ہوتے ہیں بھولی شہزادی۔ لے گیا ہوگا کسی خفیہ رہائش گاہ پر۔ ماں سے چھپ کے بیاہ رچایا تھا۔ کچھ تو کرنا ہی تھا رازداری نبھانے کے لئے۔"

"نجی آنٹی اس شادی سے بے خبر ہیں؟ یہ کیا معمہ ہے۔" آواز بے یقینی سے چور چور تھی۔

"یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔" امبرین ترنگ میں آ گئی۔

"جاؤ اب یہاں سے سر نہ کھاؤ میرا۔ میرے وجود کا رواں رواں آگ اگل رہا ہے۔ کہیں تم بھی اس آتش فشاں کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔"

"مہران بھائی اور ارشین آپی کی شادی ناممکن۔ میں آج ہی فون پر سفیان سے تصدیق کرتی ہوں۔" فاریہ کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

"ایک' دو' تین' چار' پانچ' آہ۔ جانے کتنے لاتعداد مہینے ہو گئے کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ڈنر کئے۔"

سفیان نے ٹھنڈی سانس لے کر انگلیوں پہ گنا تھا۔

"ہولنگ' لانگ ڈرائیو' پکنک' فنکشن۔ کتنے اجنبی لگتے ہیں یہ الفاظ۔" ٹھنڈی سانسیں لینے کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

"بھلا آخری دفعہ کب گئے تھے ہم باہر۔" اس نے بھنڈی کا مصالحہ بھونتے کچن میں

مصروف عمل ناظر سے دریافت کیا۔

"کون سے باہر؟" ناظر نے چمچہ گھماتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔

"وضاحت فرمایئے۔ حوالات سے' ملک سے یا گھر سے باہر۔"

"ذرا سوچو تو ناظر! کتنا دردناک تصور ہے۔ آفریدی ہاؤس میں سیر و تفریح پر نامعلوم مدت کے لئے پابندی لگ چکی ہے۔ آخر کب ہنسیں گے ہم کھل کر' منہ پھاڑ کر اور پورے دل سے۔"

"ہم نہ ہنسیں گے تو کوئی ہم پہ ہنس لے گا بھیا۔" ناظر نے احتیاط سے دیگچی پہ ڈھکنا سیٹ کیا۔ "یہی دستور زمانہ ہے۔"

"اُفوہ! یہ کیا بھنڈی' کریلے اور ٹنڈے کا بھرتا کھلاتے ہو روز۔ کبھی تو مینیو بدل لیا کرو۔" سفیان نے برا سا منہ بنا کر برنر پر رکھے سالن کی طرف دیکھا۔

"مرغ روسٹ' چکن کڑھائی' بریانی' قورمے کا دور کب آئے گا اس گھر کی تاریخ میں۔ کچھ تو نیا پن ہونا چاہئے۔"

"صبر کریں۔ آپ کی برات اور ولیمے پر مل جائے گا۔" ناظر بے نیازی سے بولا۔ "تب تک سبزیوں پر گزارا کریں۔"

"اف' میں ہلاک ہو جاؤں گا اس نباتاتی تشدد سے۔" سفیان نے چلا کر اعلان کیا۔

"اور ویسے بھی ابھی "بڑے صاحب" کا بارات ولیمہ تو خیر خیریت سے نپٹ جائے۔ حالات کی ڈور ایسے پھنسی ہے کہ دور تک ہمارا نام لسٹ میں درج ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"ہوشیار ہو جایئے۔ نجی ایک دن کہہ رہی تھیں' مہران اپنی ضد پر اڑا رہا تو میں سفیان کی پہلے کر دوں گی۔ گھر میں بہو تو آئے' بھلے سے چھوٹی سہی اور اب تو ویسے بھی آپ کے لئے آصف صاحب کی بیٹی پسند کر لی گئی ہے۔ دیکھ لیجئے گا۔ نجی شیخ بانڈہ سے واپسی کے فوراً بعد آپ کی منگنی کی تیاریاں کر دیں گی۔"

"نجی!" سفیان کا چہرہ یک لخت تاریک ہو گیا۔

"کہاں ہوں گی وہ اس وقت' کب آئیں گی واپس اور جانے آئیں گی بھی یا....."

"بے وقوفی کی باتیں مت کریں سیفی میاں!" ناظر نے بات کاٹ کر ڈانٹا۔

"آئیں گی بھلا کیوں نہیں۔ ان کا گھر ہے' بچے ہیں' مالکن ہیں وہ یہاں کی ہر چیز کی۔"

"اور تمہیں پہنچانے کا یہ عظیم کارنامہ "بڑے صاحب" نے سرانجام دیا ہے۔" سفیان کوشش کے باوجود طنز کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ناظر کو جواب دینے کا موقع نہیں مل سکا۔ فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ بٹا دی تھی۔

"لیجئے بڑی عمر ہے صاحبزادی کی۔ ابھی ان ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔" ناظر خوشگوار موڈ میں لاؤنج سے لوٹا۔

"کن کا۔"

"فاریہ بی بی ہیں۔ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" ناظر نے دانت نکالے اور چھیڑ خانی کے سے انداز میں آنکھ دبائی۔

"آپ کے دماغ میں فاسد خیالات کا ڈھیر جمع ہو گیا ہے۔ بہتر ہوگا' اس کی صفائی کروالیں۔ خواہ مخواہ شریف النفس لوگوں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ شرفاء کی پگڑیاں اچھالنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔"

سفیان نے جھینپ مٹانے کو ایک ہاتھ اسے جڑا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا لاؤنج میں آ گیا۔

فون سیٹ ہاتھ میں لے کر وہ آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی السلام علیکم یا عزیزی' کیف حالک۔"

"وعلیکم السلام۔ آگے کیا بولا ہے' سمجھ میں نہیں آیا۔" فاریہ حیران ہوئی۔

"اس سے آگے میری عربی پنکچر ہو گئی ہے ورنہ زبان دانی کا مزید مظاہرہ کر دکھاتے۔" سفیان نے کان کھجا کر کہا پھر تیز ہوا۔

"اللہ توفیق دے آپ کو شرمندہ ہونے کی۔ اتنی سی عربی نہیں آتی۔ کیا بنے گا بوقت رخصت۔"

اس نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

"کیسی رخصت؟" وہ اچنبھے سے بولی۔

"دنیا سے' ہمیشہ کی رخصت۔ جس کے بعد قبر میں ہر بندہ منکر نکیر کے تین سوالوں کا جواب دینا ہوتا ہے۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک جواب بھی غلط ہوا تو امیدوار فیل ہو کے جہنم کی

اے کلاس میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہ سوال و جواب عربی زبان میں ہوتے ہیں۔ تم تو ہو گئیں پکی پکی فیل۔"

"توبہ ہے۔" فاریہ جھلا کر بولی۔ "سچ ہے۔ آپ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔"

"اے لڑکی! تم اونٹ جیسی بے ڈھب چیز سے مجھ معصوم کا موازنہ نہ کرو۔" سفیان خفگی سے بولا۔

"ہاں' واقعی۔ اونٹ برا مان جائے گا۔" اس نے تسلیم کیا۔

"تم نے گوش گزار نہیں کیا کہ فون کیوں کیا ہے' اپنے ہونے والے منگیتر کو۔ تمہاری جگہ میں شرم سے لال ہوا جا رہا ہوں۔"

"منہ اچھی طرح دھو کے رکھیے۔" وہ کچھ شرمائی اور کچھ ناراض ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم دھو لیتے ہیں بلکہ سج بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔" سفیان ہنسنے لگا۔ "آپ بھی لال جوڑا زیب تن کر لیں۔"

"اور جب تک میں گلی سے کسی باریش آدمی کو پکڑ لاتا ہوں۔" پاکٹ ریڈیو پر ایف ایم ٹیون کرتے ناظر نے اندر آ کر اطمینان سے دخل در نامعقولات کیا۔

"بھئی' شادی کی رسم کو حتمی شکل تو مولوی صاحب ہی دیتے ہیں ناں۔" سفیان کے کھسیا کر گھورنے پر وہ دانت نکالنے لگا۔

"لو آ گیا آدم و حوا کی جنت میں ایک شیطان۔" اس نے مایوسی سے فاریہ کو اطلاع دی۔

"آپ کچھ دیر کے لئے باہر دفع مریں۔ یہاں نہایت سنجیدہ قسم کی رومینٹک گفتگو ہو رہی ہے۔"

"پھر تو ظالم سماج کا درمیان میں رہنا بے حد ضروری ہے۔ از روئے فلمی قواعد۔" ناظر نے ڈھٹائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے سامنے کی نشست سنبھال لی۔

"اس کے بغیر فلمی کہانی مکمل نہیں ہو سکتی۔" ناظر نے مزید ارشاد کیا۔

"میری بات سنیں سفیان بھائی' پلیز۔ میں نے بہت مجبور ہو کر آپ سے رابطہ کیا ہے۔ خدا کے لئے سنجیدہ ہو جائیں کچھ دیر کے لئے۔"

"سفیان بھائی؟ لاحول ولا قوۃ" وہ لال پیلا ہونے لگا۔ "تمہارا بھائی ہوگا' ظہیر' ناظر یا اسی

جیسا کوئی اور چغد۔ سن لو بی بی! میرا نام سفیان ہے۔ مجھے آئندہ اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے۔ زیادہ سے زیادہ تم سفی کہہ سکتی ہو' پیار سے اور یہ "آپ" کیا ہوتا ہے۔" اس نے جھڑک کر پوچھا۔

"بھائی کہہ دیا ہونے والی شریک حیات نے۔ ہوہو۔" ناظر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "یہ عزت رہ گئی ہے آپ کی اندازہ کیجئے۔ چہ چہ چہ۔ اور "آپ" ہوتا ہے ایک گدھا' سفیان نام کا۔"

"ناظر! ناظر! تم یقیناً میرے ہاتھوں قتل ہونا چاہتے ہو۔ کہاں ہے بھائی جان کا سروس ریوالور۔ اس سے پہلے کہ میرا قاتل بننے کا موڈ بدل جائے' فوراً سے پیشتر حاضر کردو۔" سفیان نے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔ "یہ باہمی جنگ و جدل کا شوق بعد میں پورا کر لیجئے گا۔ میری بات سن لیں پہلے۔" فاریہ کا لہجہ سنجیدہ ہوا تو سفیان بھی چھیڑ خانی ختم کر کے سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں کہو' میں سن رہا ہوں۔"

"کیا مہران بھائی کی شادی ہو چکی ہے؟" سنگین سوال کی اچانک یلغار نے سفیان کی رہی سہی چلبلاہٹ بھی ختم کر دی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" اس نے خالی خالی لہجے میں دریافت کیا۔

"اور کیا انکی بیوی کا نام ارشین ہے؟" فاریہ نے اس کا استفسار نظر انداز کر دیا۔

اب جواب دینے کو دامن میں کیا رہا تھا۔

"آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔" سفیان کا توقف فاریہ کو شاق گزرا۔ وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر یہ سب جھوٹ ہے تو تردید کیوں نہیں کرتے اور اگر سچ ہے تو وضاحت کریں کہ ہم سے کیوں چھپایا گیا؟"

"کیا آصف انکل اور آنٹی بھی اس بات سے آگاہ ہو چکی ہیں؟"

"نہیں' فی الحال تو نہیں مگر....."

"ایک منٹ فاریہ! سوری تمہاری بات کاٹ رہا ہوں۔ تمہیں جو بھی اور جہاں بھی اور جہاں تک بھی پتا چلا ہے اسے فی الوقت اپنے تک محدود رکھنا۔ مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی مگر میرا تجسس تو دور کیجئے۔"

فاریہ اس ہدایت پر متعجب ہو گئی۔ سفیان نے مختصراً ضروری تفصیلات بتائیں۔

"دعا کرو' خالہ واپس لوٹ آئیں۔ وہ بہت بددل ہو کر ہارے ہوئے انداز میں یہاں سے گئی ہیں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

فاریہ عجیب و غریب انکشافات پر دم بخود رہ گئی تھی۔

"کیا ہم ارشین آپا سے مل نہیں سکتے۔ میرا مطلب ہے' جہاں انہیں رکھا گیا ہے' ہم وہاں جا کر انہیں واپس لے آئیں۔" فاریہ بے بے جوش سے بولی۔

"بھائی جان اجازت نہیں دیں گے۔"

"اور وہ جو ایس آئی درنایاب سے رشتہ طے کیا جا رہا تھا۔ اس کا کیا ہوگا۔"

"پتا نہیں' کیا کہا جا سکتا ہے۔ خالہ واپس آئیں گی تو معاملے کا کوئی سرا پیر نکلے گا۔ میں تو سخت بور ہو گیا ہوں۔ ایک سی سرد سپاٹ اور گھٹی ہوئی گھریلو فضا ہے' نہ ذہن کا تناؤ ختم ہوتا ہے' نہ حالات کا۔" سفیان جانے کیسے روانی میں اپنی کیفیت اس سے شیئر کرنے لگا۔

"اللہ کرے یہ معاملہ بخیر و عافیت نپٹ جائے۔ ہمیں تو ارشین آپی اور مہران بھائی برابر عزیز ہیں۔" فاریہ نے خلوص سے دعا کی۔

"ہاں' ان کا معاملہ نپٹے گا تو اپنی باری آئے گی۔" سفیان زیادہ دیر تک سنجیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

"اب آپ پٹڑی سے اترنے لگے ہیں' خدا حافظ۔" فاریہ نے جھینپ کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کبھی پہاڑ ' کبھی آسمان ہلاتے ہوئے
کٹی ہے عمر مری راستہ بناتے ہوئے
یہ اور بات کہ پھر بھی اٹھائے پھرتا ہوں
میں ٹوٹ پھوٹ گیا زندگی اٹھاتے ہوئے

"باجی! او باجی۔" پیرو دروازے سے ہی شور مچاتا آ رہا تھا۔

"یہیں ہوں بھئی' کیا ہو گیا۔" وہ گونگی بوا کا بستر جھاڑنے کے بعد چادر بچھا کر انہیں سہارے سے چارپائی پر بٹھا کر مڑی۔

پیرو کو اس نے یاسین ورائٹی سنٹر پر ایک دو تصویریں دے کر بھیجا تھا۔ واپس آیا تو رقم کے

لفافے کے ساتھ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائجسٹ سائز کا میگزین بھی تھا۔

"وہ جو مالک نہیں ہے دکان کا' اس نے دیا ہے۔ کہہ رہا تھا ارشین بی بی کو دے دینا۔ اس کے اندر ایک رقعہ بھی ہے' آپ پڑھ لو۔" وہ برآمدے کی دیوار کے ساتھ بنے سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھ گیا۔

"کیا لکھا ہے' تم پڑھ کر سناؤ۔"

ارشین نے ڈائجسٹ کے صفحات کھنگال کر سفید تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور پیرو کی طرف بڑھا دیا۔

"لو جی۔" پیرو منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ "او باجی! مجھے کون سا پڑھنا آتا ہے۔"

"مگر تم اتنے بڑے ہو گئے ہو' کیا سکول نہیں گئے کبھی۔" ارشین نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس عمر کے لڑکے میٹرک تک ضرور پہنچ جاتے ہیں۔

"سکول یہاں ہو تو کوئی جائے ناں۔" پیرو نے لاپروائی سے بال سنوارے۔ "جو اکا دکا لوگ پڑھ رہے ہیں' وہ شہر کے سکول جاتے ہیں۔"

"کیا اس گاؤں میں کوئی سکول نہیں ہے؟" ارشین کو سخت تعجب ہوا۔

"مسجد کے ساتھ ایک کمرہ اور برآمدہ ہے' جہاں پڑھنے والے بچے قاعدہ اور تختی لے کر آ جاتے ہیں۔ ساتھ والے گاؤں سے ایک میٹرک پاس ماسٹر جی آتا ہے پڑھانے۔ وہ بھی جب اس کا جی چاہے یا بچوں کی مار پیٹ کے لمبا ٹائم گزر گیا ہو۔ ہر مہینے تنخواہ لے لیتا ہے سرکار سے اور موج کرتا ہے خیر سے۔" پیرو ہنسا۔

"تنخواہ کے ساتھ ساتھ تیرے میرے گھر سے دودھ' لسی' مکھن' پیڑے' گنا' چاول اور روٹی بوٹی جو کچھ ملے بچوں سے منگوا لیتا ہے اور جاتے وقت سامان کو پوٹلی باندھ کے گھر لے جاتا ہے۔"

ارشین کو یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی۔

چھوٹی چھوٹی تحصیلوں اور دیہاتوں میں حکومت کی طرف سے تعینات کئے گئے اساتذہ اکرام کا ہمیشہ سے یہی وتیرہ رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر شاگردوں کی چمڑی ادھیڑ دینا اور ان سے ہر طرح کی جسمانی و مالی خدمت کروانا وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان کی مطلق العنانی' غرعونیت اور حاکم مزاجی کو بچوں کے والدین بھی چیلنج کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ وہ من مانی کے ایسے مظاہروں کو

استاد و شاگرد کے تعلقات کا لازمی جزو شمار کرتے ہیں۔

"رقعے میں کیا لکھا ہے باجی؟" پیرو نے کاغذ پر نظریں دوڑاتی ارشین کی طرف تجسس سے دیکھا تھا۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" ارشین نے کاغذ تہہ کرتے ہوئے کچھ سوچا۔ پھر ڈائجسٹ کے ٹائٹل پر سرسری نگاہ ڈالی۔ "سوشل ڈائجسٹ" نام مزے کا ہے۔ "ہر عمر کے افراد کے لئے۔" نیچے لکھا تھا۔

یاسین ورائٹی سنٹر کے مالک نے رقعے میں اسی ڈائجسٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس میں مختلف کہانیوں' مضامین اور مکالمہ جات وغیرہ کو اسکیچز کے ذریعے واضح کیا جاتا ہے۔ آج کل انہیں آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ پرچہ راولپنڈی سے نکلتا تھا' اس کا سب آفس یہاں تھا۔ یاسین صاحب نے سب آفس کا ایڈریس لکھ دیا تھا اور تجویز دی تھی کہ جا کر متعلقہ بندے سے مل لیں۔

"چلو دیکھتے ہیں۔ اگر ڈھنگ کا کام ہوا تو جوائن کر لوں گی۔ چار پیسے ہی ہاتھ آئیں گے۔" اس نے سوچا اور دوبارہ ابتدائی صفحات پر نگاہ ڈالی جہاں رسالے کے ایڈیٹر اور معاونین کی فہرست درج تھی۔ ایک نام چیف ایڈیٹر کے نام کے بعد ناپ پر تھا۔ انتظامی ایڈیٹر داور صدیقی۔

☆☆☆☆☆

"امبرین باجی! خدا کے لئے یہ دھواں چھوڑنا بند کر دیں اب۔ سارے کمرے میں حبس ہو رہا ہے۔ نیچے سے اچانک کوئی آ گیا تو قیامت آ جائے گی۔"

شاہین بے طرح پھٹ پڑی تھی۔ بڑی دیر سے اسے انجن بنی چھکا چھک دھواں نکالتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ابھی اور اسی وقت بابا جان کو بلا لائے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے پلی پلائی جوان بیٹی کو بربادی و تباہی بلکہ موت کے کنوئیں میں گرتے دیکھ لیں۔ مگر وہ فطرتاً بزدل اور کمزور سی لڑکی تھی۔ اتنی ہمت نہیں رکھتی تھی کہ امبرین کے غیظ و غضب کو للکارتے ہوئے گھر والوں کو اس کے کرتوت بتا دے۔ ماں یا باپ جس کو بھی پتا چلتا گھر میدان حشر بن جاتا تھا۔ وہ طوفانی جھکڑ چلتے کہ الاماں۔

"گھبرائی کیوں ہو' میری ننھی چڑیا۔" امبرین نے ہنستے ہوئے اس کا گال چھوا۔ "لو مسل دی ہم نے سگریٹ۔ تمہاری خاطر۔"

"اُفوہ' میرے ساتھ ایسے چیپ انداز میں بات نہ کیا کریں۔" شاہین خجالت سے بولی۔

امبرین کے لب و لہجے میں سارے رنگ لیلیٰ شاہ کے اتر آئے تھے۔ اس نے بی اے فائنل کے پیپرز دینے کے بعد لیلیٰ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ باقاعدہ جوائن کرلیا تھا۔ اب تو ایک ماہ ہو چکا تھا۔

گھر والوں سے اجازت لینا بھی گویا اک مرحلہ تھا مگر طے ہو ہی گیا۔

"لڑکیوں کا انسٹی ٹیوٹ ہے بی بی جان! یہاں کوکنگ' سلائی کڑھائی' کپڑوں کی ڈیزائننگ اور کمپیوٹر وغیرہ کی کلاسز ہوتی ہیں۔ ہنر سیکھنا تو کوئی بری بات نہیں ہے پھر سکھانے والی بھی عورتیں ہیں۔ گاڑی دروازے سے لے گی اور واپسی پر چھوڑا کرے گی۔ ٹائمنگ بھی دن کے ہیں۔ گھر میں بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کوئی کام سیکھ لوں۔ انسٹی ٹیوٹ کالج کے بالکل پاس ہے۔ جگہ بھی دیکھی بھالی ہے۔"

اس کی دلیل میں خاصا وزن تھا پھر کام بھی "زنانہ" تھا یعنی امور خانہ داری سے متعلقہ تھا۔ سو ردوکد کے بعد بی بی جان نے رضامندی دے دی اور کسی طرح بابا جان سے اجازت بھی دلوادی۔ یوں بھی سعد کے معاملے میں امبرین کے ساتھ عین شادی کے دنوں میں جو زیادتی ہوئی تھی' اس نے قدرتی طور پر بی بی جان اور بابا جان کے دل میں نرم گوشہ پیدا کردیا تھا۔ انہیں اس کے ساتھ ہونے والے سانحے کا احساس تھا۔ شاید بطور تلافی اسے یہ "آسانی" فراہم کی گئی تھی۔

اب وہ ایک ماہ سے باقاعدگی سے جارہی تھی۔ دس ساڑھے دس تک لیلیٰ شاہ کی بھیجی ہوئی گاڑی آتی تھی اور سہ پہر تین چار بجے تک واپس چھوڑ جاتی تھی۔

شاہین کے میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہ بری طرح پڑھائی میں غرق تھی' تاہم امبرین کی سگریٹ نوشی اور شراب کی غلیظ لت کے ہاتھوں بری طرح تنگ تھی۔ شروع شروع میں تو وہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ بوتل میں کسی قسم کا شروب' ٹانک یا جوس وغیرہ ہوتا ہوگا مگر اب شروب کی "نوعیت" سمجھنا دشوار نہیں رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہن کی تباہ کن روش پر ہولتی رہتی تھی۔ اسے امبرین کے رجحانات سے بہت گھن آتی تھی مگر وہ اسے روکنے پر قادر نہیں تھی۔ امبرین کی خوش قسمتی تھی کہ ماں باپ اولاد کے معاملات سے حد درجہ لاپروا بلکہ بے حس رہنے کے عادی تھے۔ اولاد کی خوشی' غم' دکھ' پریشانی یا خوشگوار لمحات کی نہ انہیں کبھی خبر رہتی تھی اور نہ کبھی خود جاننے کی کوشش و خواہش کی تھی۔ وہ زندگی کو اپنے اصولوں کے تحت مخصوص روٹین کے مطابق بسر کرنے کے قائل

تھے۔ خصوصاً بابا جان کو تو "آل اوکے" کا سگنل درکار ہوتا تھا۔ ہر شے طے شدہ معمول کے مطابق سیٹ رہے' اپنی جگہ پر قائم رہے اور ہر کام ایک ترتیب سے ایک ہی طریقے سے انجام پذیر ہوتے رہے اور بس۔

بظاہر سخت گیری و حاکمیت پسندی کے ساتھ ساتھ اولاد کے معمولات سے بے خبری و بے حسی کا یہ امتزاج بڑا عجیب و غریب لگتا تھا۔ کہاں تو انتہا درجے کی سختی' شکوک و شبہات اور الزامات کی بارش اور کہاں یہ حال کہ بیٹی کے خطرناک حد تک منفی طرز فکر و عمل سے قطعی لاعلمی۔

"شاہین! یار ذرا میرا میرون اور آف وائٹ کنٹراسٹ والا سوٹ تو استری کردینا۔ مجھے انسٹی ٹیوٹ جانا ہے۔"

سگریٹ پی کر کلی کرنے اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد امبرین باتھ روم سے نکل آئی اور نرم و خوشامدی انداز میں جنرل سائنس پر جھکی مینڈک کے نظام انہضام کی ڈائی گرام بناتی شاہین سے مخاطب ہوئی۔

"باجی! میں بہت مصروف ہوں۔ پلیز خود ہی زحمت کرلیں۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ وہ بدستور جنرل سائنس پر جھکی ہوئی تھی۔

"گاڑی آنے والی ہے' اٹھ جاؤ ناں۔" امبرین جلدی جلدی بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

ناچار شاہین اٹھی اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کی فطرت میں صلح جوئی اور مصلحت پسندی کا عنصر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا کہ خواہش کے باوجود ناں نہیں کرپاتی تھی۔

تیار ہو کر وہ گاڑی کا ہارن بجتے ہی باہر نکل گئی۔

لیلیٰ منزل میں حسب معمول چہل پہل تھی۔

انسٹی ٹیوٹ والے حصے میں کلاسز ہو رہی تھیں۔ وہ دائیں ہاتھ کے مرکزی حصے میں بے دھڑک چلی آئی۔ دوسری منزل پر بنے اسٹوڈیو کا رخ کرتے ہوئے اس نے آج کے کاموں کی فہرست ذہن میں ترتیب دی۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنی ڈیوٹی سمجھتی جارہی تھی۔

تارا اس سلسلے میں اس کی بھرپور معاونت کررہی تھی۔ کاموں میں سرفہرست دن بھر آنے والی کالز اٹینڈ کرنا تھا۔ لیلیٰ شاہ بہت مصروف خاتون تھی۔ اس کے کام کی بہت مانگ تھی۔

سارا دن اسے مختلف رسالوں، اخباروں اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کی طرف سے فون آتے رہتے۔ جنہیں وہ تارا کے سکھائے گئے انداز کے مطابق ڈیل کرتی تھی۔ ماڈل گرلز بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ جب لیلیٰ شاہ آؤٹ ڈور فوٹو گرافی کے لئے نکلتی تھی تو امبرین کیمرے، لائٹس، ریفلیکٹرز اور دیگر چیزیں سنبھالنے کے لئے اس کے ساتھ جاتی تھی۔ لیلیٰ کو ہر دوسرے دن مختلف فیشن شوز اور فائیو سٹار ہوٹلوں کی رنگا رنگ تقریبات کے دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ وہ جہاں مناسب سمجھتی، شرکت کرتی تھی۔ البتہ امبرین اس کے بار بار اصرار کے باوجود بھی ہمراہ جانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود کو لیلیٰ منزل کے اسٹوڈیو اور ڈارک روم تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیلیٰ نے ڈارک روم میں ہی کلر پرنٹس کے لئے چھوٹا سا پلانٹ لگا رکھا تھا۔ یہ ایک کمپیوٹرائزڈ مشین تھی اور کئی بار امبرین بھی لیلیٰ کے ساتھ اس عجیب و غریب مشین کے ڈرائر سے رنگ برنگی تہلکہ خیز تصویریں نکلتے دیکھ چکی تھی۔ "ایسی ویسی" ٹرانسپیرینسیز دیکھ کر شروع شروع میں اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگتی تھی مگر اب آہستہ آہستہ عادی ہو رہی تھی۔

لیلیٰ شاہ کی شخصیت، انداز اور طرز کلام میں کچھ ایسا جادو تھا کہ امبرین اس پر کھلنے لگی تھی۔ لیلیٰ بڑے طریقے سلیقے سے اس سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوا لیتی تھی۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی اور روانی میں لیلیٰ کے پوچھے گئے سوالات کے جواب دیتی چلی جاتی۔ حتیٰ کہ لیلیٰ ارشین کے بیک گراؤنڈ، گھریلو حالات، تعلیمی و دفتری زندگی اور دیگر ذاتی پہلوؤں کے متعلق ہر ہر تفصیل حاصل کر لی۔ وہ "کارڈز" جمع کرتی جا رہی تھی، کسی مناسب موقعہ پر چلانے کے لئے۔ پروفیسر دانیال، ان کی فیملی، مہران آفریدی سے تعلق اور سعد اور ارشین کے باہمی جذبات کے بارے میں بھی امبرین تفصیلات بتا چکی تھی یا دوسرے لفظوں میں لیلیٰ نے چالاکی و مکاری سے اس سے من پسند بیانات حاصل کر لئے تھے۔ پروفیسر دانیال والا چکر لیلیٰ کے لئے خصوصی دلچسپی کا مرکز تھا۔ وہ عنقریب پروفیسر سے رابطہ کرنے کا سوچ رہی تھی۔

ارشین اور مہران کے خلاف ایک نئی چال چلنے اور ماضی کے زخموں کا حساب لینے کے لئے۔

ہاں، البرے سانتو ماضی کا ایک زخم ہی تھا جو انجانے میں ارشین کے ہاتھوں لگا تھا۔

☆☆☆☆☆

لیلیٰ شاہ کا ماضی کیسا تھا؟ وہ کون تھی؟ کس کی بیٹی تھی؟

یہ سوچتے ہوئے وہ آج بھی گھبراتی تھی بلکہ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اور کن کن راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔

وہ ایک کرسچین عورت جیناں کی بیٹی تھی۔ جیناں کے والدین کارپوریشن میں ملازم تھے اور سیالکوٹ کی سڑکوں پر جھاڑو دیا کرتے تھے۔ جیناں بڑی ہوئی تو وہ بھی ماں باپ کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے کے بعد ان کی اگلی ڈیوٹی لوگوں کے گھروں سے کوڑا اٹھانے کی ہوتی تھی۔ اس کا باپ گٹروں اور نالیوں کی صفائی پر بھی مامور تھا۔ برا بھلا گزارا ہو ہی رہا تھا۔ جیناں کے ماں باپ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ جاتے تھے۔ چرچ میں جیناں کی ملاقات ڈیوڈ سے ہوئی، جو چرچ میں آرگن بجاتا تھا۔ وہ ایک مدت سے جیناں کا اسیر تھا۔ جیناں بھی اس کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ دونوں کے یکساں خیالات تھے۔

"یہاں ہماری کیا عزت ہے جیناں ہیں تو ذات کے چوہڑے ناں۔ ذلیل، حقیر اور غلیظ۔ یہاں رہ کو عزت، شہرت اور دولت کے خواب نہیں دیکھے جا سکتے۔"

ڈیوڈ میوزک ڈائریکٹر بننا چاہتا تھا اور شہرت کی بلندیوں کو چھونا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں اس کی ملاقات لاہور کے کسی چھوٹے موٹے فلم پروڈیوسر سے ہو گئی۔ اس نے اسے لاہور آ کر فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا ڈیوڈ جیناں کو ہمراہ لے کر سیالکوٹ سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔

فلم نگری کس کی ہوئی ہے۔ اس کا ظاہر بھی دھوکا ہے اور باطن بھی۔ ڈیوڈ کے میوزک ڈائریکٹر بننے کا خواب تو کیا پورا ہوتا، الٹا وہ اپنی محبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایک ایکسٹرا سپلائی کرنے والے آدمی امجد شاہ کی نظر جیناں پر پڑی تو اس کا دل اس پہ آ گیا۔ سو اسے ہیروئن بنا کر سونے کی سیڑھیوں پر چڑھانے کا جھانسہ دے کر ڈیوڈ سے چھین کر اپنی آغوش میں سجا لیا۔ چند فلموں میں جیناں نے معمولی سے چھوٹے موٹے رول بھی کئے۔

"یہ تو آغاز ہے میری جان! بڑی بڑی ہیروئنوں کو انڈسٹری میں اپنی جگہ بنانے کے لئے شروع میں ایکسٹرا گرل کے طور پر نچلے درجے کے رول کرنے پڑے تھے۔ دیکھنا ایک دن کہاں سے کہاں جا پہنچو گی۔"

امجد شاہ اسے سبز باغ دکھاتا رہا۔ اسی دوران جیناں لیلیٰ شاہ کی ماں بن گئی۔ اس نے بار بار امجد

شاہ کو اس ناجائز تعلق کو جائز بنانے پر زور دیا مگر وہ ہر بار ٹال جاتا۔ بالآخر اس نے صاف صاف بتا دیا۔

"میں پہلے سے شادی شدہ ہوں' میری بیوی کراچی میں رہتی ہے' دو بیٹیوں کا باپ ہوں' دوسری شادی افورڈ نہیں کر سکتا۔"

جیناں کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اور' اور یہ تمہاری بیٹی! اس کا کیا ہوگا۔" اس نے لیلیٰ شاہ کے ننھے وجود کو گود میں بھرتے ہوئے وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

امجد شاہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کون جانتا ہے یہ کس کی بیٹی ہے۔ محض میرا نام دے دینے سے اس کی ولدیت کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ تم اتنا عرصہ ڈیوڈ کے ساتھ بھی رہی ہو اور پھر میں مسلمان ہوں اور تم کرسچین۔ بیٹی کے بارے میں کچھ پتا نہیں کہ تم نے اسے کرسچین ہی رکھنا ہے یا مسلمان بنانا ہے۔"

جیناں کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایسے میں ڈیوڈ نے ہی اسے سہارا دیا اور باقاعدہ شادی کرنے کے بعد لیلیٰ شاہ کو سیالکوٹ اس کے ننھیال بھجوایا۔

"مجھے اور تمہیں فلمی دنیا میں جگہ بنانی ہے' اپنا کیریئر بنانا ہے یوں بھی کسی بے وفا کی یادگار کو سینے سے لگا کر رکھنے کا کیا فائدہ۔ تم اپنے ماں ابا کو لکھ دینا کہ ہم میاں بیوی اپنی مصروفیات کے سبب بچی کی مناسب نگہداشت نہیں کر سکتے۔ کچھ عرصے کے لئے اسے اپنے پاس رکھ لیں۔"

یوں بے نام و نشان اور بے مذہب کی لیلیٰ شاہ اپنے کرسچین نانا نانی کے پاس پہنچ گئی اور بستی کے دوسرے چوہڑوں کی طرح غلاظت میں پلنے لگی۔ ذرا سیانی ہوئی تو ایک مشنری سکول میں داخل کرا دی گئی جہاں وظیفے کے نام پر خیرات لے کر پڑھنے لگی۔

لیلیٰ نو سال کی تھی جب اس کے نانا' نانی انتقال کر گئے۔ جیناں اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئی۔ ایکسٹرا گرل کے طور پر معمولی درجے کے رول کر کے وہ کسی نہ کسی طرح خود کو زندگی کی دوڑ میں شامل کئے ہوئے تھی۔ ڈیوڈ جو کہ اب ایک میوزک ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اس نے دو سال پہلے جیناں کو طلاق دے کر تعلق ختم کر لیا تھا۔

ڈیوڈ کا ساتھ چھوٹا تو جیناں نے عارضی سہارے تلاش کرنا شروع کر دیئے جیسا کہ اس نگری

کی ریت ہے۔ اپنے آپ کو روپوں کے عوض بیچ کر اس نے اتنا بہر حال کما لیا تھا کہ بیٹی کی پرورش کر سکے۔ انہی دنوں ایک ساٹھ سالہ آرٹسٹ سے اس کی دوستی ہو گئی۔ بوڑھے نے اسے شادی کی آف کی تو جیناں نے قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ شادی کے بعد لیلیٰ کو اس نے اپنے پاس ہی بلوا لیا تھا۔

لیلیٰ شاہ نے نوجوانی کی عمر اسی بڈھے آرٹسٹ کے گھر میں گزاری' یہیں پر اسے فوٹو گرافی سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے شوق کے پیش نظر جیناں نے اسے باقاعدہ فوٹو گرافی کی تعلیم دلوانے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ لیلیٰ نے یہاں رہ کر ماں سے حسن و جوانی کی قیمت وصول کرنے کے طریقے بھی سیکھ لئے تھے مگر جارحانہ ایکشن کی عادی تھی اس نے مردوں کو چارہ ڈالا بھی تو اس طرح کہ "ایسے ویسے" لمحات کی سٹل فوٹو گرافی اس ہوشیاری سے کی کہ وہ اس کی قربت پا کر پچھتائے۔ لیلیٰ بڑی ہوشیاری سے انہیں بلیک میل کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی اپنی ذہانت کے بدولت ہر چال سے بچ کے نکل سکتی ہے مگر پھر سیر کو سوا سیر مل گیا۔

وہ ہیروئین کا سمگلر تھا اور بین الاقوامی سطح پر "مال" ایکسپورٹ امپورٹ کرتا تھا۔ اس نے لیلیٰ شاہ کی بلیک میلنگ پر الٹا اسے پھنسوا دیا۔ پھر اپنے کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بالآخر لیلیٰ شاہ اس دھندے میں شامل ہو گئی۔

یوں بھی اس کی ماں جیناں پھیپھڑوں کے کینسر سے جانبر نہ ہوتے ہوئے پچھلے برس انتقال پا گئی تھی۔ سو لیلیٰ اپنے باس کی ہدایت پر لاہور چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اسلام آباد منتقل ہو گئی اور پھر سوشل مصروفیات کے پردے میں اپنا اصلی چہرہ چھپا لیا۔ وہ اپنا ماضی بھی لاہور دفن کر آئی تھی۔ اپنے تئیں۔

لیکن ارشین کو کسی نہ کسی طرح اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ پورا نہ سہی ادھورا سا تعارف وہ بھی جان گئی تھی مگر اس نے کبھی اسے جتایا نہیں۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب البرے سانتو لیلیٰ کی خواہش پر پاکستان آیا تھا۔

لیلیٰ شاہ بے شمار مردوں سے آشنا تھی مگر البرے سانتو کی سوبر' سنجیدہ اور بھرپور شخصیت نے جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ وہ سنجیدگی سے گھر بسانے کا سوچنے لگی۔ ابھی اسے البرے سانتو کے جذبات کا صحیح طرح سے اندازہ نہیں تھا۔ وہ لیلیٰ منزل میں لیلیٰ کے دوست کے طور پر رہائش پذیر

تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں آرٹس کونسل میں ارشین کی تصویروں کی نمائش تھی۔ لیلیٰ شاہ البرے سانتو کی فرمائش پر سے پاکستانی آرٹ ورک دکھانے نمائش لے آئی یہیں وہ واقعہ پیش آیا جس نے لیلیٰ شاہ کو ارشین بخاری سے انتقال لینے پر اکسایا تھا۔

"کس قدر خوب صورت تصویر ہے۔ اس کی معنویت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ مجھے اس تصویر کو تخلیق کرنے والے ذہن پہ رشک آتا ہے۔"

البرے سانتو نے تصویر میں گم ہو کر وہاں فرنچ زبان میں اظہار خیال کیا۔ لیلیٰ شاہ فرنچ جانتی تھی۔ "آقاؤں" نے اسے ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ ویسے البرے سانتو کو بھی نت نئی زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ پاکستان میں رہ کر کسی حد تک اردو سمجھنے لگا البتہ بولنے پر قادر نہیں تھا۔

"کیا تم مجھے اس تصویر کی مصورہ سے ملاؤ گی۔ میں اسے مل کے اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس منظر کا تھیم وہی ہے جو میرے ذہن میں آیا ہے۔"

البرے سانتو بہت دیر تک پینٹنگ کی شان میں قصیدہ پڑھتا اور زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔

لیلیٰ شاہ کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھنے لگا البرے سانتو کے معاملے میں وہ حد درجہ سیریس تھی۔ وہ سچ مچ اس کے دل میں جگہ بنانا چاہتی تھی۔ اسے زندگی میں شامل کرنا اور اس کی زندگی میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ لہٰذا پہلی دفعہ اسے رقابت اور حسد و جلن کے جذبات سے واسطہ پڑا۔

"ایسی بھی کیا خاص بات ہے جو آپ اس عام سی پینٹنگ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور آرٹسٹ سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ جل کر بولی۔

"تمہیں نہ سہی مجھے تو ضرورت ہے۔" وہ کچھ حیران ہو کر سادگی سے بولا۔

"مجھے آرٹ سے منسلک افراد سے ملنا اچھا لگتا ہے۔"

مجبوراً لیلیٰ شاہ کو اسے ارشین سے ملوانا پڑا۔

"ان سے ملو۔ یہ ہیں ان تصویروں کی خالق ارشین بخاری اور یہ میرے بہت عزیز دوست اور فن کے قدردان جناب البرے سانتو فرانس میں رہتے ہیں۔" لیلیٰ شاہ نے جی ہی جی میں تلملاتے ہوئے بظاہر سپاٹ سے انداز میں تعارف کروایا۔ البرے سانتو بڑا پرجوش تھا۔

"یوں تو آپ کا بنایا ہوا ہر فن پارہ نہایت عمدہ ہے مگر اس تصویر کی بات کچھ اور ہے۔" ارشین

کی سہولت کے لئے وہ فرنچ چھوڑ کر انگلش پر آ گیا۔

ارشین خاصی حیرت زدہ تھی کہ فرانسیسی اپنی زبان چھوڑ کر کسی اور زبان میں بات کرنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔

"شکریہ۔ مجھے بھی اس تصویر سے خصوصی لگاؤ ہے۔ میں نے اس پہ بہت محنت کی ہے۔"

پھر وہ اسے تصویر کا تھیم بتانے لگی۔

"یہ نارنجی سورج اصل میں انسان کی امید ہے جسے وہ مل کر مایوسی کی قبر میں دفن کر رہے ہیں۔ تیز آندھیوں سے لرزتے درخت فطرت کی پکار ہیں اور سلگتا ہوا دھواں انسان کے دل کی اس کیفیت کی غمازی کر رہا ہے جو امید کے خاتمے کے بعد لاحق ہوتی ہے۔ یعنی تھیم یہ بنتا ہے کہ بنی نوع انسان اتنی ناامید ہو چکی ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنے ارمان دفن کر دیئے ہیں۔ اپنی امید کا سورج مایوسی کے اندھیروں کے حوالے کرتے ہوئے اس کا دل سلگ رہا ہے۔ فطرت انسان کے اس عمل کے خلاف غم زدہ ہے اور اسے پکار کر روکنا چاہتی ہے۔ آندھی کی زد میں لرزتے درخت دراصل فطرت کا احتجاج ہیں۔"

"مائی گڈنیس" البرے سانتو سچ مچ متاثر ہو گیا۔ "تصویر دیکھ کر میرے ذہن میں اس سے ملتا جلتا خیال آیا تھا۔ مگر آپ کا آئیڈیا زیادہ گہرا پرمعنی اور خوب صورت ہے۔"

"کیا دوبارہ آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" البرے سانتو نے اشتیاق سے پوچھا۔ "آپ جانتی ہیں ہم فرانسیسی آرٹ، خوشبو اور موسیقی کے دیوانے کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آرٹسٹ ہمارے لئے اتنے ہی قابل احترام ہوتے ہیں جتنا مشرقی لوگوں کے لئے کوئی ولی صوفی۔"

"بلاشبہ فرانسیسی آرٹ کے سچے قدردان کے طور پر معروف ہیں، ساری دنیا جانتی ہے۔" ارشین اخلاقاً بولی۔ وہ لیلیٰ شاہ کی آنکھوں میں دہکتے الاؤ کو محسوس کر سکتی تھی اس لئے شعوری طور پر بات سمیٹ کر کترا کر دوسری طرف چلی گئی تھی۔ دوسری اتفاقی ملاقات لوک ورثہ میں ہوئی تھی۔ اور غالباً دو ہفتے بعد ہوئی تھی۔

ان دنوں ارشین دانیال مہدی کے آرٹ اینڈ آرٹ سنٹر میں کام کرتی تھی انہی کے ادارے کے کسی مصور کی تصویروں کی نمائش تھی، ارشین کو کولیگ ہونے کے ناطے افتتاحی تقریب میں شریک ہونا پڑا۔

لیلیٰ' البرے سانتو کی دلچسپی کے پیش نظر مجبوراً اس کے ساتھ آئی تھی۔ البرے سانتو ارشین سے مل کر پہلے سے زیادہ پرجوش ہوا۔ بڑی گرمجوشی سے حال احوال دریافت کیا پھر فن مصوری پہ طویل و پرمغز گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ لیلیٰ شاہ پیچ و تاب کھاتی بظاہر خاموش کھڑی رہی۔

"ایکسکیوزمی ارشین! مجھے آپ سے کچھ اہم بات کرنی ہے۔ جانے سے پہلے مجھ سے مل لیجئے گا' باہر لان میں۔" اس نے چبھتے ہوئے سرد انداز میں ارشین کو مخاطب کیا تھا۔ ارشین چونک کر لیلیٰ کو دیکھنے لگی البتہ بولی کچھ نہیں۔

بعد میں علیحدگی میں بات ہوئی تو لیلیٰ نے دوٹوک انداز اختیار کیا۔

"بڑی "گہری" گفتگو ہو رہی تھی البرے سانتو سے۔ چکر کیا ہے۔ کیا چاہتی ہو تم؟"

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ اس سوال کا مطلب؟" ارشین کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اسے لیلیٰ کا تشکی انداز اپنی توہین محسوس ہوا تھا۔

"مطلب یہ کہ البرے کو اپنے "مشرقی طرز مصوری" سے متاثر کرنے یا لبھانے رجھانے کی کوشش مت کرو۔ گزشتہ پندرہ دنوں سے میں اسے تمہارے فن اور ذہانت کی تعریف میں رطب اللسان دیکھ رہی ہوں۔ اس نے کئی بار مجھ سے تمہیں ملوانے کی فرمائش کی تھی اور اب بھی اتنی دیر تک تمہارے گرد منڈلاتا رہا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔" لیلیٰ بگڑے ہوئے انداز میں مخاطب ہوئی۔

"تمہارے فن کی طرح تمہاری سوچ بھی گھٹیا' بے حجاب اور بدلحاظ ہے۔" ارشین نے افسوسناک نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ "وہ ایک آرٹسٹک سوچ رکھنے والا سوبر فرانسیسی مرد ہے۔ فنون لطیفہ کی طرف فطری رجحان رکھتا ہے اس لئے تبادلہ خیالات کرنے سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا چکر ہو سکتا ہے۔"

"ایسی بات ہوتی تو اسے میری فوٹو گرافی کے شاہکار بھی پرکشش لگتے۔ اس نے میرے سٹوڈیو میں لگی شاندار تصاویر پر ایک لفظ نہیں کہا۔" لیلیٰ سلگ کر بولی۔

"اس لئے کہ جو عریانی اور بے باکی تم اپنی تصویروں میں دکھاتی ہو' اس کے چلتے پھرتے نمونے وہ اپنے ملک میں دیکھ چکا ہے۔ وہ یہاں مشرق کی پراسراریت کو کھوجنے آیا ہے۔ وہ ایشیائی رنگوں کی دھنک دیکھنا چاہتا ہے۔ لبادے سے باہر کے منظر دیکھنے کا شائق ہوتا تو یورپ یا امریکہ

کا رخ کرتا۔ کہنے کو تم اس کی دوست ہو۔ قریبی تعلق رکھتی ہو۔ تمہیں اتنا نہیں پتا چل سکا کہ وہ کس مزاج کا آدمی ہے؟" ارشین طنز کئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کھرے کھرے تبصرے نے لیلیٰ کو بھڑکا دیا۔

اس کے منہ میں جو آیا کہتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ارشین کی ذات پر بھی رکیک انداز میں حملہ کر دیا؟ وہ بھی کب تک برداشت کرتی۔ بالآخر اس کے اوچھے پن اور غلیظ لب و لہجے نے ارشین کے صبر کا پیمانہ بھی چھلکا دیا۔

"کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔ میرے اگلے پچھلوں تک جانے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لو۔ تمہارا تو نام تک مشکوک ہے۔ ولدیت کی بات تو بعد میں آتی ہے۔ ذرا بتاؤ گی مجھے تمہارا کیا مذہب ہے اور تمہارے والدین کون تھے۔ ایکسٹرا گرل جیناں بہت معروف نہ سہی مگر چند کامیاب فلموں میں چھوٹے موٹے رول کر کے اس نے اتنی پہچان ضرور بنائی تھی کہ فلمی تاریخ لکھنے والے اس کی ذات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی لیں۔ میں نے ایک پرانے فلمی رسالے میں اس کے حالات زندگی اور ماضی کے متعلق تفصیلی رپورٹ پڑھی تھی۔"

"او یو شٹ اپ۔" لیلیٰ کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ احساس ذلت اور غصے سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح لہو رنگ تھیں۔

"میرا منہ بند کر دینے سے حقائق نہیں بدل جائیں گے۔" ارشین نے خشک لہجے میں کہا وہ اسے اپنی نظروں میں شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر لیلیٰ کی اشتعال انگیزی نے اسے اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس کے ماضی کے کریہہ المنظر اور سیاہ چہرے سے نقاب اٹھانے کے درپے ہو گئی تھی۔

اور یہیں سے لیلیٰ شاہ کی زندگی میں تکلیف دہ موڑ آیا۔

دونوں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں اردگرد سے بے خبر ہو گئی تھیں۔ انہیں پتا نہیں چلا اور کچھ فاصلے پر کھڑا البرے سانتو ایک ایک بات سے آگاہ ہوتا گیا وہ اردو بول نہیں سکتا تھا مگر سمجھ بخوبی لیتا تھا۔

اسوقت اس نے کچھ نہیں کہا۔ نہ لیلیٰ شاہ کو کچھ جتایا۔

البتہ اس واقعے کے تیسرے روز اس نے پیکنگ کر لی اور فرانس واپس چلا گیا۔ جانے سے

پہلے لیلیٰ کی حیران پریشان صورت دیکھ کر اس نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔

"چھ ماہ پہلے لندن کے ٹیوب اسٹیشن پر جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ تمہارا تعلق اپنے ملک کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ مہذب گھرانے سے ہے۔ والدین کی وفات کے بعد اکیلی رہتی ہو۔ آرٹ میں قدرتی دلچسپی رکھتی ہو اور ایک معروف فوٹو گرافر ہو۔ میرے سامنے ایک سادہ مزاج' نرم دل' لطیف لطیف ذوق رکھنے والی' خوبصورت اور مہذب ایشیائی لڑکی کا نقشہ کھنچ گیا تھا۔ کیونکہ تم نے خود کو ایسا ہی پورٹریٹ کیا تھا۔ مگر یہاں آ کر' تمہارا کام دیکھ کر اور ساتھ رہ کر تمہاری شخصیت کے بہت سے پہلو میرے سامنے آئے جس نے مجھے بالآخر اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ تم وہ نہیں ہو' جو مجھے لگی تھیں۔ میں تمہارے بارے میں اتنا سنجیدہ ہو جاتا کہ شادی کر کے ہمیشہ کیلئے مضبوط تعلق بنا لیتا۔ شاید میں جلدی ایسا کرنے والا تھا مگر اب۔"

البرے سانتو نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ مجھے مس ارشین بخاری سے ملنے کا اتفاق ہو گیا اور یوں مجھ پر کھل گیا کہ تم دراصل ایک دوغلی اور دھوکے باز عورت ہو۔ تمہارے بہت سے چہرے ہیں اور ہر چہرہ دوسرے سے زیادہ بدصورت ہے۔ اگر تم صاف صاف اپنے ماضی کے متعلق بتا دیتیں تو شاید مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ مگر تم مجھ سے جھوٹ بولتی رہیں۔"

"ارشین بخاری اوگاڈ' البرے وہ ایک مکار لڑکی ہے۔ وہ سب بکواس جو اس نے کی تھی۔ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔" لیلیٰ نے آنکھوں میں التجا بھر کر اسے دیکھا۔

"اتنی اچھی اور نفیس مزاج کی لڑکی جھوٹ نہیں بول سکتی۔" البرے نے نفی میں سر ہلایا۔ لیلیٰ شاہ کے دل پر آرے چل گئے۔

"اور اگر بالفرض ایسا ہے تو بھی میں تم سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اتنے دن تمہارے ساتھ رہ کر خود کو بور اور ناخوش محسوس کیا ہے۔ ہمارے مزاج اور سوچ میں بہت فرق ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ گڈ بائے۔"

وہ چلتا بنا۔

جاتے جاتے وہ ارشین کی تصویر ہمراہ لے جانا بھول گیا تھا جو اس روز بڑے جی جان سے نمائش سے خریدی تھی۔ بعد میں وہی تصویر لیلیٰ شاہ کے ڈرائنگ روم کی زینت بنی۔

لیلیٰ جب جب اس تصویر کو دیکھتی تھی اسے البرے سانتو ارشین بخاری اور ان کے ساتھ گزرے لمحات یاد آ جاتے۔

اس نے ایک پلاننگ کے ساتھ ارشین کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کئے تھے۔ دوبارہ سامنا ہوا تو وہ اتنی گرمجوشی سے ملی کہ ارشین حیران رہ گئی۔

لیلیٰ نے یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ ماضی کی ہر تلخ بات بھلا چکی ہے۔ وہ یوں ملی جیسے ان کے درمیان برس ہا برس کی یگانگت و محبت ہی ہو۔

مگر درون دل وہ کبھی اس زخم کو نہ بھلا پائی جو ارشین کی وجہ سے البرے سانتو کے انکار کی صورت میں اس کے دل کو لگا تھا۔

اب مناسب موقعہ ہاتھ آیا تھا اس حساب کو چکانے کا' خصوصاً جب سے اس کی امبرین سے ملاقات ہوئی تھی' اس کے ذہن میں جامع منصوبہ ترتیب پا گیا تھا۔ وہ ایک خاص مقصد کی خاطر امبرین کو اپنے اتنا قریب لائی تھی۔

اب کی بار وہ بڑی ہوشیاری سے گیم کھیلنا چاہتی تھی۔

امبرین سے حاصل کردہ معلومات نے اس کے کام کو اور سہل بنا دیا تھا۔ اب وہ اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل کے لئے پروفیسر دانیال کی ذات کو باآسانی استعمال کر سکتی تھی۔

وہ جانتی تھی امبرین اور پروفیسر دانیال اسوقت یکساں طور پر ارشین کے ہاتھوں چوٹ کھائے ہوئے ہیں اور اس سے انتقام لینے کو بے چین ہیں۔

امبرین کی قوت ارادی تو اب یوں بھی ہیروئن کی ایک پڑیا اور ڈرنک تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی طرف سے لیلیٰ شاہ مطمئن تھی۔

اگلا اقدام پروفیسر دانیال سے رابطہ کرنا' انہیں اپنے کام کے لئے ہموار کرنا اور مطلوبہ "تعاون" حاصل کرنا تھا۔ ڈائریکٹری سے آرٹ اینڈ آرٹ سنٹر کا نمبر معلوم کرنے کے بعد لیلیٰ شاہ نے بالآخر ایک دن پروفیسر دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا۔

☆☆☆☆☆

"اوہو پیرو! آہستہ بھئی آہستہ ذرا آہستہ بھگاؤ اپنے پائلٹ کو۔ میں ابھی تمہاری اس ہوائی سواری کی عادی نہیں ہوئی۔"

ارشین نے بڑی مشکل سے تانگے کی لکڑی کی بنی سیٹ کو خود کو اچھل کر نیچے گرنے سے بچایا تھا۔

"میں نے کہا تو تھا باجی کہ زور سے پکڑ کے بیٹھو۔ پھر نہیں گرو گے۔" پیرو اس کی بدحواسی پر ہنسا اور گھوڑے کو ششکار کر آہستہ کرنے کے لئے ہلکی سی لگامیں کھینچیں۔

"آپ پہلے بھی ابے کے ساتھ شہر جاتے رہے ہو۔ اب تو عادت ہو جانی چاہئے۔"

"اللہ کے بندے۔ حاکو بابا تانگے کو تانگہ سمجھ کر چلاتے ہیں۔ تمہاری طرح اڑن کھٹولا نہیں بنا لیتے اور آہستہ کرو۔" اس کی خفگی سے ہدایت کی۔

"لو جی۔ آپ ہی تو کہہ رہے تھے عصر کی اذانوں سے پہلے گھر واپس پہنچنا ہے۔ میں تو اسی لئے دوڑا رہا تھا ابے کے شیر کو۔ چل بھئی ہولے ہو جا ابے دیا شیرا۔"

پیرو نے گھوڑے کو مخاطب کیا۔

ارشین سوشل ڈائجسٹ کے سب آفس گئی تھی۔ آفس انچارج جمیل صاحب سے تفصیلی بات چیت کے بعد اس نے جاب کے لئے اپنے ڈاکومینٹس جمع کروا دیئے تھے۔ انہوں نے تین دن بعد آنے کے لئے کہا تھا۔ گاؤں قریب آتا جا رہا تھا۔

"آج سوئے کی طرف جانے والا راستہ خالی پڑا ہے۔ خیر تو ہے کیا گاؤں والے اپنے مویشی سوئے پہ پانی پلانے اور نہلانے کے لئے نہیں لے کر گئے؟" ارشین نے بائیں طرف کھیتوں کے بیچ سے گزرتی کچی سڑک پر نظر دوڑائی۔

"آج کل سوا بند ہے جی۔"

"اچھا! کیا پانی بند بھی ہو جاتا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"ضرورت کے وقت بند کرتے ہیں جی۔ آج کل نہروں کی بھل صفائی ہو رہی ہے۔ فوجی جوان اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ہماری نہر بھی بند کرا دی گئی ہے۔ تاکہ اچھی طرح نہروں کا راستہ صاف کیا جا سکے۔ میں کل گیا تھا نہر کی طرف۔ وہاں ٹریکٹر ٹرالیاں اور دوسری مشینیں نہر سے مٹی نکال کر کناروں پر ڈال رہی تھیں۔ فوج کے سپاہی کام کر رہے تھے اور افسر لوگ ان کی نگرانی کر رہے تھے۔"

"ہوں۔" ارشین نے سر ہلا کر بے خیالی میں ہوں کہا۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔

جیسے کچھ یاد سا آ کے رہ گیا۔ ہاں فوجی افسر کے ذکر پر اسے سعد یاد آ گیا تھا۔

"وہ بھی کہیں بھل صفائی آپریشن کی نگرانی کر رہا ہوگا۔" اس نے سوچا پھر خود ہی اپنی سوچ کی تردید بھی کر دی۔ اس کی ڈیوٹی تو بارڈر پر تھی۔ وہ فوج کے انتظامی معاملات میں کدھر سے آ گیا؟

مگر خیر ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ کہ فوجی زندگی میں ٹرانسفر ہونا معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔

جانے دو یاد کی کون سی یکساں لہر اٹھی تھی کہ خود بخود فریکوئنسی مل گئی۔

وہ گھر داخل ہوئی تو آم کے درخت کے پاس بچھی گوگی بوا کی چارپائی کے کنارے بیٹھے یونیفارم میں ملبوس سعد کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

"اسلام وعلیکم۔" سعد اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"بوا کھلے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی میں بھی اس کے پیچھے آ گیا اور اشاروں میں بتایا کہ میں ارشین بی بی کا رشتہ دار ہوں۔ انکی رضامندی سے یہاں بیٹھ گیا۔"

وہ نظر جما کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری صحت پہلے کے مقابلے میں قدرے بہتر ہو گئی ہے۔ گھر کا نقشہ بھی بدلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ "خوش حالی" آپ کی ذاتی کاوش ہے یا شوہر نامدار کی عنایت و نوازش۔"

"یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا؟" وہ اس کا لطیف طنز نظر انداز کرتے ہوئے تکلف سے بولی۔

"میرا ٹرانسفر بارڈر سے دوبارہ اندرون ملک ہو گیا ہے۔ آتے ہی بھل صفائی کے کام کی نگرانی سونپ دی گئی۔ اتفاق سے میری ڈیوٹی اس علاقے کی نہر پہ لگی ہے۔ اتنا قریب ہوتے ہوئے تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لئے نہ آتا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔" وہ آہستگی سے بولا۔ ارشین کے انداز کی اجنبیت اور لاتعلقی نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ اس درجہ بے حسی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ محبت کرنے والا دل ہمیشہ خوش فہمی اور خوش امیدی کے حصار میں رہتا ہے۔

وہ یہی سمجھا تھا کہ اتنے عرصے بعد ہونے والی ملاقات یقیناً اس کے دل پہ جمی تغافل کی

برف پگھلا دے گی۔

"بوا! میں اٹھا لیتا ہوں۔" چارپائی اٹھانے کو تھی کہ سعد نے آگے بڑھ کر خود مونجھ کی چارپائی دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔

"رہنے دو۔ میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔"

مگر سعد اس کا احتجاج نظر انداز کر کے چارپائی کمرے میں لے گیا۔ چارپائی مقررہ جگہ پر بچھا کر سعد نے کمرے کے بائیں طرف رکھے ایزل کی طرف دیکھا۔ برش رنگ ادھوری پینٹنگ اسے بہت کچھ بتا رہے تھے۔

"گویا یہ ذریعہ ڈھونڈا ہے جینے کا۔"

سعد نے تکلیف دہ احساس دل میں دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کہتا ہے تمہارا ایس پی شوہر۔ کب ختم کرے گا تمہاری قید و مشقت۔" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلا اور گہری سانس لی۔

ارشین کا لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے بوا کی چارپائی پر بستر بچھا رہی تھی۔

"کچھ سزائیں کبھی ختم نہیں ہوا کرتیں۔ بندہ معاف کر بھی دے تو انسان کا اپنا آپ اسے سزا دیتا رہتا ہے۔ تم بیٹھو گے یا جانے کا ارادہ ہے۔"

"میں کہاں جا سکتا ہوں۔ وہیں کھڑا ہوں جہاں برسوں پہلے ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ جگہ تو تم ہی بدلتی ہو۔ کبھی دور' کبھی نزدیک' کبھی رگ جاں سے زیادہ قریب تو کبھی میلوں کی نارسائی۔ ہر احساس تمہارا دیا ہوا ہے۔ میرے پاس اپنا کیا ہے' کچھ بھی تو نہیں۔ دل و جان' سوچ' جذبے' لمحے' خواب' خواہش ہر شے تمہارے سپرد کر چکا ہوں۔ تم قبول کرو یا کوڑا کرکٹ سمجھ کر دل کی دہلیز کے باہر پھینک دو' تمہاری مرضی۔"

وہ دوسری چارپائی کے سرے پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ کے ناخن دیکھنے لگا۔

"سعد! کیوں پاگل پن کی باتیں کرتے ہو۔ پلیز اس طرح نہ کیا کرو۔ مجھے تمہاری دیوانگی سے ڈر لگتا ہے۔ اپنا آپ مجرم لگنے لگتا ہے۔ کیوں کر رہے ہو ایسا۔" وہ شکستہ لہجے میں گویا تھی۔

"کیا کر رہا ہوں۔" سعد نے سکون سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم اپنا وقت اور اپنی سونا سی عمر برباد کر رہے ہو۔"

"مجھے اپنی نہیں' تمہاری بربادی کا دکھ ہے۔" سعد کی آواز میں کرب تھا۔ "اگر تم آباد ہو جاتیں' تمہاری زندگی میں سکھ اور شانتی ہوتی تو شاید میرے دل کو بھی صبر آ جاتا مگر اس طرح۔"

وہ چپ ہو گیا۔

"آباد تو میں ہوں' شادی کا مطلب ہی خانہ آبادی ہے۔" وہ زبردستی بشاشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

سعد محض اک نگاہ اس پر ڈال کر رہ گیا۔ اس کی نگاہ کہہ رہی تھی۔

اس چکی کی مشقت کو آبادکاری کا نام دے کر تم کس کو دھوکا دے رہی ہو۔ گھر ہے کہ اک ویرانہ ہے۔

دل ہے کہ مقبرے کی طرح سنسان پڑا ہے۔

روح ہے کہ ناکردہ گناہوں کی سزا سہتے سہتے آبلہ بن گئی ہے۔

جسم ہے کہ پیٹ کا ایندھن بھرنے اور جینے کا سامان کرتے کرتے دھول مٹی میں ملنے لگا ہے۔

اس پہ کہتی ہو کہ آباد ہو۔ کیا اپنی ہنسی اڑانا تمہیں اچھا لگتا ہے۔

ارشین اسے سوچ میں گم دیکھ کر باہر نکل گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں سلور کی ٹرے تھی جس میں تین چائے کی پیالیاں تھیں۔ گونگی بوا اور سعد کو دینے کے بعد تیسری پیالی خود لے کر وہ بوا کی چارپائی کے کنارے تک گئی۔

"گھر گئے تھے؟" سکوت میں ارشین کا دھیما لہجہ اچانک ابھرا تھا۔

"نہیں۔" سعد نے سر جھکا لیا۔

ارشین کچھ دیر تک شرمندگی دلانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کیوں دکھ دیتے ہو انکل' آنٹی کو۔ ان کا کیا قصور ہے۔ خرابی تو تمہارے دل و دماغ کی ہے۔" سعد نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"ان کے پاس جاؤ' ان سے ملو اور اپنی غلطی کی معافی طلب کرو۔ تمہاری وجہ سے انہیں کس درجہ ذلت اٹھانی پڑی ہو گی اور نازو وہ بھی اپنے سسرالیوں کے سامنے شرمندہ ہوئی ہو گی۔"

"سب کے جذبات کا خیال ہے تمہیں' سوائے میرے۔" اس کا لہجہ شاکی ہو گیا۔ ارشین نے سنی ان سنی کر دی۔

"کب تک ہو تم یہاں؟"

"آج آخری دن تھا۔ کام مکمل ہو گیا ہے۔ رات آٹھ بجے تک ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔" گویا وہ جاتے جاتے ملنے آیا تھا۔ ارشین نے سکھ کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ارشین بڑی دیر تک اسے سمجھاتی رہی تھی۔

"تمہاری یہ بات مان سکتا ہوں کہ اسلام آباد واپس جا کر امی' ابو سے مل کے معافی مانگ لوں لیکن ان کی یا تمہاری حسب خواہش شادی کی شرط میں کبھی نہیں مان سکتا۔ آئی ایم سوری۔"

وہ خدا حافظ کہہ کر بوا کو اشارے سے سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔

"مان جاؤ گے' ایک دن ضرور مان جاؤ گے۔" ارشین اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"وقت بڑا زور آور ہے ڈیئر میجر! سب کچھ منوا لیتا ہے۔"

رات کا کھانا پکا کر فارغ ہونے کے بعد وہ بستر میں جا گھسی۔ چادر گردن تک تان کر سیدھی لیٹی وہ بڑی دیر تک لالٹین کی کمزور ٹمٹماتی پیلی روشنی میں چھت کی کڑیاں گنتی رہی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ ابھی تک آنکھ میں نیند کی جھپک نہ اتری تھی۔

باہر گلی میں چوکیدار لال دین کا ہوکا گاہے گاہے سناٹے کو چیرتا کانوں میں گونج رہا تھا۔

"جاگتے رہنا' بھئی او۔ جاگتے رہنا۔"

ساتھ میں لاٹھی کی مخصوص ٹک ٹک بھی سنائی دے رہی تھی۔ پس منظر میں مختلف جانوروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں پھر اچانک اس "روٹین" میں خلل پڑ گیا۔

لال دین کی آواز آنا بند ہو گئی۔

اک شور سا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی بھاگتے دوڑتے ہوئے لوگوں کی دھاڑیں سنائی دینے لگیں۔

"ڈاکو آ گئے ہیں۔ اوئے پنڈ کو ڈاکو پڑ گئے ہیں۔ لوگو بچو۔"

لال دین نے کراہتے ہوئے چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو خبردار کرنا چاہا تھا پھر اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بند کر دی گئی۔

پھر تو جیسے اک قیامت آ گئی۔ ارشین دال کر چادر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کانوں سے بہری بوا البتہ گہری نیند میں تھی۔

بچوں اور عورتوں کی چیخیں اور مردوں کی پکاریں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ کواڑ کھل رہے تھے' گولیاں چل رہی تھیں اور چھینا جھپٹی جاری تھی کہ اسی اثناء میں اس کے گھر کا بند کواڑ پوری قوت سے دھکیل کر توڑ دیا گیا۔ اگلے لمحے بندوقیں تھامے پانچ چھ لمبے تڑنگے وحشی نما مرد سیاہ ڈھاٹے منہ پر باندھے دھڑ دھڑ کرتے اندر آ گئے۔ اب ارشین ان کے درمیان بے یار و مددگار کھڑی تھی۔

گاؤں میں چوری ڈاکے کی واردات اچنبھے کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ خصوصاً چھوٹے موٹے دیہاتوں میں جہاں پولیس تھانے بھی کوسوں دور واقع ہوتے ہیں' وہاں ڈاکو دیدہ دلیری سے گروہ کی شکل میں حملہ آور ہوتے ہیں اور اطمینان کے ساتھ دیہاتیوں کے گھروں کو لوٹ کر مال اسباب جمع کر کے ویگن یا جیپ میں رخصت ہو جاتے ہیں۔ گاؤں والوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے دو چار ہوائی فائر ہی کافی ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے لوگ اسلحے کی جھلک دیکھ کر ویسے ہی سہم کے پتھر ہو جاتے ہیں' سو جوابی کارروائی کیا عمل میں آئے اور رہا گاؤں کا چوکیدار تو ایک بوڑھا لاٹھی بردار ہٹے کٹے مسلح افراد سے کیا اور کہاں تک لڑ سکتا ہے۔

لہٰذا انہوں نے آتے ہی لال دین کو دبوچ کر ہاتھ پیر باندھ کے گلی میں پھینک دیا تھا۔ اب بے خوفی سے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کر رہے تھے۔ اسی دوران پھرتے پھراتے ارشین کی طرف آ نکلے تھے۔ وہ بچوں اور عورتوں کے ہذیانی انداز میں چلانے پر کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ گئی تھی۔ اس کے لئے چونکہ اپنی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ لہٰذا یہ بات ذہن میں مجھے میں ہی تھی کہ چار پانچ افراد دندناتے ہوئے ادھر آ نکلے۔

"لڑکی! جو کچھ ہے ہمارے حوالے کر دے۔" ایک دیو قامت ڈھاٹا بردار نے کھردرے اور وحشیانہ لب و لہجے میں غرا کر مخاطب کیا تھا۔

"م..... میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔" وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلد سے بولی۔ اس کا پورا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی نکل کر باہر آ پڑے گا۔ تاہم وہ اپنے مختل ہوتے حواس پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی' اس وقت اللہ کے بعد اس کی حاضر دماغی اور سیلف کنٹرول ہی اسے بچا سکتا ہے۔ کسی اور طرف سے

امداد ملنے کی قطعی توقع نہیں تھی۔ سعد دو گھنٹے پہلے یہاں سے رخصت ہو گیا تھا اور مہران اسلام آباد میں تھا۔ اس کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسے ہی کرنا تھا۔

"سیدھی طرح بتا دے' زیور پیسہ کہاں رکھا ہے۔ ورنہ....." دوسرے نے خوفناک انداز میں دھمکی دی۔ ان کے لہجے اکھڑے ہوئے اور تہذیب و تمیز سے ناآشنا تھے۔

"بھائی! مجھے کچھ مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ اکیلی رہتی ہوں۔ محنت مزدوری کر کے روکھی سوکھی کماتی ہوں پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی تو اندر جا کر دیکھ لو' جو ملے لے لو۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔"

وہ مصلحتاً عاجزی سے کام لے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی' ان بے رحم جنم جنم کے اجڈ وحشی جانوروں کو للکارنے یا اشتعال دلانے میں سراسر اپنا نقصان تھا۔ ان کے دماغ کی رو پلٹ جاتی تو مال و متاع کے ساتھ ساتھ عزت و آبرو کے لالے بھی پڑ جاتے۔ وہ چاہتی تھی جو لینا ہے' لے کر جلدی سے یہاں سے دفعان ہو جائیں۔

"خبردار' چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یہیں بھون کے رکھ دوں گا۔"

ایک ڈاکو نے اس کے پہلو میں بندوق کی نال چبھو کر عادتاً دھمکی دی تھی۔ باقی ساتھی کمروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ جھلائے ہوئے واپس آ گئے۔

"ہونہہ۔ اندر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ چار ہزار روپے ملے ہیں الماری سے' باقی کاغذوں پر تصویریں بنانے کا سامان تھا اور چھریاں' چاقو' خنجر وغیرہ۔ وہ ہمارے کس کام کے۔ چلو استاد' اس کو ایک ہاتھ دے دو۔ کہیں تیزی نہ دکھا جائے۔"

اس کے ساتھ ہی ارشین کے سر پر بندوق کا ہلکا سا بٹ لگا' وہ چکرا کر زمین پر گری اور ہوش و حواس سے عاری ہو گئی۔

دو گھنٹے بعد وہ اپنے حواس میں واپس لوٹی تو بہت سارے مردوں اور عورتوں کو اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے باتیں کرتے پایا۔ ماسی برکتے اور اس کی بہو رانو اس کے پاس بیٹھی اس کی ہتھیلیاں سہلا رہی تھیں۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

"شکر ہے پتر! رب سائیں نے خیر رکھی۔ ہم تو ڈر ہی گئے تھے۔" تاجی کے باپ غلام علی ترکھان نے نرمی سے ارشین کو مخاطب کیا۔

"سب طرف خیریت رہی چاچا.....؟"

وہ خود پر قابو پاتے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھی اور چکراتے ہوئے سر کو تھاما۔

"خیریت کہاں دھیے۔ برباد ہو گئے ہم غریب نمانے۔" برکتے دہائی دینے لگی۔ "اللہ رکھی نائن کی بیٹی کی چار دن بعد بارات تھی۔ اس بے چاری کا سارا زیور لتا لوٹ کے لے گئے۔ بالے قصائی کے بیٹے کی دس ہزار کی کمیٹی نکلی تھی' وہ بھی چھین کے لے گئے۔ مقبولاں تنور والی کے آٹھ ہزار روپے اور منجھلی بہو کا دس تولے کا زیور لے گئے۔ باقی جن کے ہاں سے تھوڑا بہت ملا' تھیلے میں ڈالتے گئے۔ اللہ سمجھے ان ظالموں کو۔ خون پسینے کی جمع کی ہوئی پائی پائی بٹور لی۔" برکتے نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر آنسو جذب کیے۔

"خیر دین اور امیر دین کی کمائی سے پیسے جوڑ کر میں نے لاڈو کے لئے سونے کے جھمکے اور موتیوں کا دزلڑی کا ہار بنوایا تھا کہ سال چھ ماہ بعد اس کا بیاہ کروں گی تو کام آئے گا۔ لاڈو کو بھائیوں کا تحفہ پہن کر استعمال کرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ اللہ ان نامرادوں کو ہدایت دے۔" برکتے کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

صحن میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی تھیں۔ تین چار لوگوں کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں۔ گاؤں کے کچھ پرجوش نوجوان ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ٹھنڈے مزاج کے تجربہ کار بزرگ حضرات انہیں منع کر رہے تھے۔ ڈاکو مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ جیپ میں بھی سوار تھے۔ جبکہ گاؤں میں آمد و رفت کا واحد ذریعہ تانگہ تھا۔ تانگے اور جیپ کی رفتار کا کیا مقابلہ۔

"کیا ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے؟" ارشین نے برکتے سے دریافت کیا۔

"ہاں دھیے!" برکتے نے ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ ہمارے لئے نواں تماشا نہیں ہے۔ چور ڈاکوؤں کا جب داؤ چل جائے' واردات کے لئے آ نکلتے ہیں۔ ہر چھ سات ماہ بعد اس گاؤں میں لوٹ مار کے لئے آ جاتے ہیں۔"

"پولیس کچھ نہیں کہتی؟ وہ مجرموں کو پکڑتی کیوں نہیں ہے؟"

ارشین کی بات پر ایک بزرگ استہزائیہ ہنسے۔

"جان بوجھ کر سیاپا کون مول لیتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ سن کر انجان بن جاتے ہیں۔ افسر

پوچھ گچھ کریں تو ایک سے بڑھ کر ایک بہانا ہوتا ہے۔ ناکافی اسلحہ' نفری کی کمی' ٹرانسپورٹ کی سہولت کا نہ ہونا یا پھر بروقت اطلاع نہ ملنا۔ کچھ بھی کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں۔"

"او جی میں تو کہتا ہوں یہ ڈاکے بھی پولیس اور ڈاکوؤں کے آپس کے گٹھ جوڑ سے ہوتے ہیں۔ پولیس والوں کو ان کے پروگرام کا سارا پتا ہوتا ہے۔ کہاں جائیں گے' کس وقت پہنچیں گے اور کب واپسی ہوگی۔ یہ معلومات ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔" کسی دل جلے نے کڑھتے ہوئے اظہار خیال کیا تھا۔

مختلف گھروں سے رونے پیٹنے کے ساتھ ساتھ تسلی تشفی کرانے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس ہنگامے میں کیسی نیند اور کہاں کی نیند۔ پورا گاؤں جاگ رہا تھا۔ یوں بھی اب فجر کی اذان ہونے میں آدھ پون گھنٹہ ہی رہ گیا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ گلیوں سے بھیڑ چھٹتی گئی۔

چوٹ کھائے ہوئے لٹے پٹے دیہاتی تھکے۔ ماندے مایوس قدموں سے گھروں کو لوٹ کر نئے طلوع ہونے والے دن کے کام دھندوں کا آغاز کر رہے تھے۔ زندگی کی سکرین کتنی ہی دھندلی ہو جائے اس پر ابھرا معمولات کار کا منظر نہیں بدلتا۔ وہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔ حالات کو دھندلاہٹ فرائض زندگانی سے چھٹکارا بہرحال نہیں دلوا سکتی۔

فجر کے بعد نکو کی ہٹی کھلی تو ارشین نے رانو کے بھائی کو بھیج کر پیراسٹامول کی دو گولیاں منگوائیں اور دودھ کے ساتھ کھا کر غافل ہو گئی۔ گزرنے والی اعصاب شکن رات نے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کی چولیں بھی ہلا کر رکھ دی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر خود کو نڈھال اور شکستہ محسوس کر رہی تھی۔ صبح واردات کے بعد اس نے دو تین لوگوں کو بے انداز میں کہتے سنا تھا۔

"یہ بی بی پولیس افسر کی رشتے دار تھی۔ کیا یہ اس سے بات کر کے ڈاکوؤں کو پکڑوا نہیں سکتی؟ اس افسر کو ہمارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے۔ آخر کب تک ہم اپنی حق حلال کی کمائی لٹیروں کے حوالے کرتے رہیں گے۔" ان سادہ دل لوگوں کو یہ خبر نہیں تھی کہ ایسے "سلسلے" جن کی جڑیں صدیوں پر محیط ہوں' یکبارگی اور سہولت سے ختم نہیں کروائے جا سکتے۔ جب آتشیں اسلحہ نہیں ہوتا تھا تو چاقو' ڈنڈے یا جسمانی طاقت کے زور پر شریف لوگوں کی جیبیں خالی کرائی جاتی تھیں۔ اب سائنس کی مہربانی کی بدولت ایک سے بڑھ کر ایک جدید ہتھیار لوٹ مار اور دہشت

گردی کے میدان میں استعمال ہو رہا ہے اور اسی حساب سے پولیس والوں کی بے بسی اور ناکامی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

شدت پسندی کیا ہوتی ہے۔

اسکی وضاحت شدت پسند شخص کی ذات کے کسی بھی پہلو کا جائزہ لینے سے مل سکتی ہے۔

یہ اگر رویے میں ہو تو ایسے شخص کی دوستی اور دشمنی دونوں انتہا کی ہوتی ہیں۔ اگر جذبوں میں ہو تو اس کی خوشی اور غمی کی کیفیات بہت شدید ہوتی ہیں۔ اگر سوچ میں ہو تو ایسا شخص لوگوں کو صرف دو تناظر میں دیکھے گا۔ بہت برے یا پھر بہت اچھے۔

اگر عمل میں ہو تو دو چیزوں یا معاملات کو فقط دو کیٹگریز میں جانچے گا۔ غلط یا صحیح۔

مختصراً یہ کہ اس کی سوچ' جذبات' رویے اور عمل میں توازن نام کو بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ درمیانی راستہ اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کی ٹرین کو ایک ہی پٹڑی پہ چلاتے رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

کچھ لوگ تو سرتاپا شدت پسندی کی مثال ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی ایک خاص زاویے سے انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی ایک مثال پروفیسر دانیال مہدی کی شخصیت تھی۔ وہ ویسے تو ایک کامیاب' مکمل اور سنجیدہ طبع متین مرد تھے مگر اپنے رویے کے معاملے میں اعلیٰ درجے کے شدت پسند تھے۔ دوستی میں انتہاؤں پر سفر کر جانا اور دشمنی میں حد سے گزر جانا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب لیلیٰ شاہ نے ان سے رابطہ کر کے ارشین کے خلاف مشترکہ محاذ کھولنے کی دعوت دی تو انہوں نے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لی۔

"دشمن مشترکہ ہو تو وار بھی مشترکہ ہونا چاہئے۔ تاکہ ایک ہی حملے میں کام تمام ہو جائے۔" لیلیٰ شاہ نے معنی خیز انداز میں بات کی تھی۔

"آپ کی حکمت عملی کیا ہے۔ مجھے تفصیلات درکار ہیں۔" وہ سنجیدہ تھے۔

"تفصیلات فون کی لائن کے ذریعے تھوڑا انڈیلی جا سکتی ہیں۔" وہ دلربائی سے ہنسی۔

"اس کے لئے آپ کو غریب خانے پر تشریف لانا پڑے گا یا پھر یوں کریں کہ اپنی چند اچھی سی سولو تصویریں لفافے میں ڈال کر مجھے بھجوا دیں۔"

وہ شاطر و خطرناک جال بچھانے کے تمام انتظامات مکمل کر چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں خود آپ کے پاس آؤں گا۔" انہوں نے فیصلہ کر لیا۔

"میں منتظر رہوں گی۔" وہ چہک کر بولی۔

"ایسا کاری وار ہوگا کہ ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ آپ ایس پی صاحب سے جی بھر کر اپنی شکست کا بدلہ لے سکیں گے۔ ان کی راتوں کی نیندیں حرام نہ ہو گئیں تو کہیے گا۔"

"میں ارشین کو ایک بار اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا ہوں۔ اب وہ میری ضد بن گئی ہے۔ اسے تسخیر کرنے اور مہران کی اکڑی گردن جھکانے کے لئے میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوں۔" پروفیسر دانیال کے لہجے میں کوئی بھوکا بھیڑیا غرایا تھا۔

لیلیٰ نے اپنی کامیابی پر مسرور ہوتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

حسب معمول امبرین لیلیٰ منزل میں موجود تھی۔

آج بڑے دنوں بعد اس کا لیلیٰ سے سامنا ہوا تھا۔ لیلیٰ کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ دن کو گھر پر ٹھہرنا کم کم ہی نصیب ہوتا تھا۔ یوں بھی امبرین چار بجے تک واپس چلی جاتی تھی۔ نشے کے لئے "ڈوز" تارا سے مل جاتی تھی مگر آج خصوصی طور پر لیلیٰ نے اپنے ہاتھ سے خفیہ خانے سے ہیروئن کی تھیلی نکال کر اسے دی تھی۔

امبرین "آب حیات" دیکھ کر ندیدوں کی طرح تھیلی کھولنے لگی۔

لیلیٰ ہاتھ میں بیگ لئے اسکی طرف سے پشت کر کے ارشین کی بنائی ہوئی پینٹنگ کے آگے کھڑی ہو گئی اور غور سے تصویر کے خدوخال ٹٹولنے لگی۔

"بڑی محنت کی ہوگی تمہاری بہن نے اس تصویر پر؟"

وہ اسی طرح پشت موڑے مخاطب ہوئی۔ لہجے سے اس کے موڈ یا مدعا کا کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "جی ہاں' کافی وقت لگا تھا۔" امبرین کپکپاتے ہاتھوں سے یہ نشہ آور زہریلا مواد اپنے حلق میں اتار رہی تھی۔ "امید کا سورج مایوسی کی قبر میں اتارا جاتا ہے۔" لیلیٰ بغور تصویر دیکھتی ہوئی سوچ کر بڑبڑائی۔ "اور فطرت دھوئیں اور آندھی کے ذریعے اپنا احتجاج ظاہر کر رہی ہے۔ خاصی عجیب سی تھیم ہے اس تصویر کی۔"

وہ خود سے باتیں کر رہی تھی۔

"جی۔" امبرین۔ مخمور انداز میں جیسے ہنکارا بھرنے کا فرض ادا کیا۔ اس کی بھرپور توجہ ہیروئین کی تھیلی پر تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ ڈارلنگ۔" دفعتاً لیلیٰ اس کی طرف مڑی۔

"تم ارشین سے دشمنی میں کس حد تک جا سکتی ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"دشمنی؟" نشے نے اس کی سمجھ بوجھ کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں جیسے بات پلے نہ پڑی ہو۔

"سنو میری جان! تمہاری بہن نے تمہارا حق مارتے ہوئے تمہارے منگیتر کو اپنے جال میں پھنسایا اور تمہارا رشتہ تڑوایا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

ٹھکرائے جانے کی ذلت برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو زندگی کی حقیقی خوشیوں اور اعتماد کے رشتوں سے محروم رہا ہو۔ لہٰذا ردعمل کے طور پر وہ ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے اسے ٹھکرایا گیا اور اس کی واحد محبوب ہستی اس سے چھن گئی۔

لیلیٰ شاہ نے انسانی نفسیات کے اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے امبرین کے دل میں ارشین کے خلاف بھرے غبار کو شدید نفرت میں تبدیل کرنے کی تدبیر کی تھی۔

"تمہارا جسم ہو بہو ارشین کی کاپی ہے۔ گردن سے لے کر ایڑی تک تم بنی بنائی ارشین ہو۔ فقط چہرہ' رنگ اور نقش مختلف ہیں۔"

لیلیٰ کی نظریں ایکسرے مشین کی طرح اس کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔

امبرین کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔

"آؤ اوپر چلتے ہیں' سٹوڈیو۔" کچھ دیر تک اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد لیلیٰ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ چپک کر رہ گئی تھی۔ امبرین حکم کی تعمیل میں اٹھی تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔

"مجھے چکر آ رہے ہیں۔" اس نے مخل ہوتے ہوئے حواس سمیت سر تھاما۔ پلکوں پر جیسے کسی نے منوں بوجھ ڈال دیا تھا۔ آنکھیں کھل کر نہیں دے رہی تھیں۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔

"میں اپنی جان کو خود سہارا دے کر اوپر لے جاتی ہوں۔" لیلیٰ نے بڑے پیار بھرے انداز میں اس کو سنبھال لیا تھا۔

سٹوڈیو میں خوبصورتی سے آراستہ سنگل بیڈ پر اسے بٹھانے کے بعد لیلیٰ کیمرہ سیٹ کرنے لگی۔

"آپ کام شروع کرنے لگی ہیں؟" امبرین نے بیڈ کی پشت پر سر ٹکا کر مندی مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس کی طرف مڑی۔ "آج ایک خاص الخاص کام شروع کرنے لگی ہوں۔ ایک مدت سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔"

پھر اس نے الماری کھول کر پیاز کے چھلکے سے بھی زیادہ باریک اور نرم ملائم ہلکا گلابی سلیپنگ گاؤن نکال کر اس کی طرف اچھالا۔

"لو تم یہ لباس بدل لو۔"

"یہ..... یہ....." اتنا ہوش تو بہر حال تھا کہ وہ لباس کے نام پر بے حجابی کا کھلم کھلا اعلان کرتا بے ہودہ لبادہ پہننے سے انکار کر دیتی۔ اس نے گاؤن پرے اچھال دیا۔ "نہیں میڈم۔"

لیلیٰ شاہ کے تیور سخت ہو گئے۔ البتہ بولی کچھ نہیں۔ چپ چاپ دیوار گیر وال کلاک پر نظریں جما دیں۔

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے میڈم۔" کچھ دیر بعد امبرین کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"مجھے تھوڑا سا اور نشہ دے دیں۔ پلیز۔" اس نے التجا کی تو لیلیٰ نے کچھ سوچ کر خاموشی سے ایک پڑیا اسے تھما دی۔

بیس پچیس منٹ کے وقفے کے بعد صورت حال لیلیٰ کے قابو میں آ چکی تھی۔ امبرین بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اب وہ کئی گھنٹوں کے لئے ہوش کی وادی میں لوٹنے سے قاصر تھی۔ لہٰذا لیلیٰ نے اطمینان سے اپنا کام شروع کر دیا۔

☆☆☆☆☆

جانے کتنی دیر بعد امبرین کی آنکھ کھلی تھی۔

کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"اف اتنی دیر ہو گئی۔ مجھے گھر بھی جانا ہے۔" جونہی اس نے اپنے جسم کو حرکت دی تو اس پر عجیب و غریب اور خوفزدہ کر دینے والا انکشاف ہوا۔

اوہ میرے خدایا۔ کیا ہوا ہے میرے ساتھ

ایک سرد لہر اسے سر تا پا ٹھٹھرا گئی۔ اس نے جلدی سے دونوں بازو سکیڑ کر اپنے آپ کو ڈھانپا اور پھر پاگلوں کی طرح بستر ٹٹول کر اپنا لباس تلاش کرنے لگی۔ ستر پوشی کرنے کے بعد وہ کانپتی ٹانگوں سمیت کھڑی ہوئی اور ابھی دیوار پر سوئچ بورڈ ٹٹول کر لائٹ جلانے ہی والی تھی کہ کمرہ خود بخود روشن ہو گیا۔ کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"آ..... آپ نے کیا کیا ہے میرے ساتھ؟" لیلیٰ شاہ کی مسکراتی صورت دیکھ کر وہ وحشت زدہ انداز میں اس کی طرف لپکی تھی۔ اس کا رواں رواں شرم و غیرت سے لرز رہا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں کیا۔ پریشان کیوں ہوتی ہو میری چڑیا۔" لیلیٰ شاہ ہشاش بشاش اور پرسکون تھی۔ اس کے ہاتھ میں تصویروں کے تازہ پرنٹس تھے۔ غالباً ابھی ابھی ڈرائر سے نکالے گئے تھے۔ کیونکہ وہ ہلکے ہلکے گیلے لگ رہے تھے۔

"تمہاری وجہ سے تو میرا کام آسان ہو گیا ہے۔ تمہیں نقصان کیوں پہنچاؤں گی میں۔"

"تمہاری تصویریں کب لی ہیں۔ یہ تو تمہاری بہن کی ہیں۔ لو دیکھو۔ مجھے ان تصویروں کو پروفیسر دانیال کو بھی بھجوانا ہے۔ میں چاہتی ہوں اب کی دفعہ میں پس پردہ رہوں اور پروفیسر کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاؤں۔ یوں بھی یہ بم ان کے ہاتھوں مہران صاحب کے اعصاب پر پھٹے تو زیادہ مزہ آئے گا۔ لو دیکھو یہ تصویریں۔ اس کے بعد منہ ہاتھ دھو کر گھر چلی جانا۔ ڈرائیور کو میں نے کہہ دیا ہے۔"

☆☆☆☆☆

"مہران! میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ مجھے ارشین کے پاس لے چلو۔ اس کے بعد ہرگز نہیں کہوں گی لیکن زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گی۔"

نازش نے دھمکی و خفگی بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

"آپ کی ان ہی ضدوں کی بدولت میں ان حالوں کو پہنچا ہوں۔"

وہ جوتے کے تسمے کھولنے کے لئے جھکتا ہوا چڑ کر گویا ہوا۔

"زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے سب نے مل کر۔ نینی مجھ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ گئی ہیں۔ سفیان الگ خفا خفا پھرتا ہے۔ دریاب کی نظریں روز سوال کرتی ہیں کہ ہم تاریخ لینے کب ان کے گھر آئیں گے۔ داور اپنی جگہ شکوؤں کے دفتر جمع کیے ہوئے ہے۔ اوپر سے ان "محترمہ" کی ذمہ داری اور فکریں۔ میں تو عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔" وہ سچ مچ جھنجھلایا ہوا تھا۔

"آپ کیا کریں گی وہاں جا کر؟"

"بھئی اس سے ملوں گی۔ حال چال دریافت کروں گی۔"

"کیوں اپنی شامت بلواتی ہیں۔ اپنے محترم خاوند پروفیسر دانیال صاحب کا پتا ہے ناں۔" اس کے لہجے میں طنزیہ تلخی تھی۔

"پہلے ہی آپ کا "کیس" خراب ہے۔ "بگ باس" سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ کیوں مزید بگاڑ اور پیچیدگی پیدا کر رہی ہیں آرام سے گھر بیٹھیں اور اپنے میاں کو مٹھی میں کرنے کی کوشش کریں انہیں کچھ شرم دلائیں پتا نہیں نازش کی باتوں نے اعصاب کو جھنجوڑ کر بیدار کیا تھا یا اتنے عرصے کی تحقیق کے نتیجے میں اس کی کھل کر سامنے آنے والی بے گناہی کی علامت نے دل موم کر دیا تھا یا پھر ماضی کے کسی نرم جھونکے جیسے لمحے نے احساسات پر پڑا بوجھ کم کر دیا تھا کہ وہ بڑے موڈ میں ون کوٹ روانہ ہوا تھا۔ وہ پھلوں کے بہت سے ٹوکرے بے شمار کپڑے جوتے اور دیگر ضرورت کی چیزیں بھی ہمراہ لایا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ اتنے دبے قدموں سے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو کر اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے اسٹور نما کمرے میں آیا تھا کہ پینٹنگ میں مصروف ارشین کے ہاتھ سے برش گر پڑا۔

از خود سلام اور وہ بھی اتنے خوشگوار اور اپنائیت آمیز لہجے میں۔ اس نے بے یقینی سے مڑ کر دیکھا۔

سیاہ باف بازوؤں والی شرٹ اور سیاہ جینز میں اس کی کھلتی ہوئی سرخ و سفید رنگت دھوپ کی تمازت سے دہک رہی تھی۔ وہ کسی ٹھہرے ہوئے فطری منظر کی طرح حسین دلکش اور سحر طراز لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔ ڈر گئیں؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

ارشین آنکھیں پھاڑے اس کا بڑھا ہوا خوبصورت مردانہ ہاتھ دیکھتی رہ گئی۔

"کیا ہاتھ نہیں ملاؤ گی۔ بھئی مصافحہ کرنا دوستی کی علامت ہوا کرتا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرا کر سرتاپا اس کا جائزہ لینے لگا۔

"ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔" وہ سنبھل کر گویا ہوئی۔ لہجہ بالکل سادہ تھا۔

"خیر۔ دوستی کا نہ سہی ایک رشتہ تو بہرحال ہے جس کی رو سے مصافحہ ہی نہیں معانقہ بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ۔" وہ معنی خیز لہجے میں کہتا ہوا شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا تھا۔ ارشین کوشش کے باوجود اپنا اعتماد برقرار نہ رکھ سکی اور کنفیوژ سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تم کچھ کمزور ہو گئی ہو اور یہ فضول سے گھسے پٹے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ ڈریسز لایا ہوں۔ ان میں سے کوئی نکال کر پہنو۔ استعمال کی اور چیزیں بھی ہیں۔ میں تمہیں فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرے کپڑوں کا کمزوری کا اور استعمال کی چیزوں کا خیال اتنی جلدی آ گیا صاحب۔ ابھی تو میں پوری طرح مٹی میں مل کر دھول بھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو جسم میں جان باقی ہے ڈیئر سر۔

وہ دل ہی دل میں تلخی سے مسکرائی تھی۔

جی کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ اب کسی گرم و سرد سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ گویا بے حسی نے چادر کی طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"تم تیار ہو جاؤ پھر شہر چلتے ہیں۔ تھوڑی سی سیر و تفریح کریں گے۔ رات کو کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔ میں رات دس گیارہ بجے واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ ایک بہت ضروری کام ہے لیکن چند دن بعد آ جاؤں گا تب تک تم اپنی چیزیں سمیٹ لینا۔ اب تمہیں یہاں نہیں رہنا۔"

کیوں۔ کیا اب ہمارے مقدر بدل گئے ہیں۔

ہمارے ماتھے پر لگا کلنک کا ٹیکہ اتر گیا ہے۔

ہمارے گناہوں کی سیاہی دھل گئی ہے۔

ہماری چنری کے داغ صاف ہو گئے ہیں۔

کڑی ذہنی وجسمانی مشقت سے ٹوٹتے بدن کا رواں رواں سوال کر رہا تھا مگر زبان چپ تھی۔

"فی الحال اسلام آباد کے فلیٹ میں بندوبست کیا ہے۔ کچھ عرصے بعد نینی سے کامیاب مذاکرات کے نتیجے میں عنقریب "آفریدی ہاؤس" میں تمہاری جگہ نکل آئے گی۔"

وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے اس کا سارا ماضی دھواں بن کر تحلیل ہو گیا ہو اور ان کے درمیان ہمیشہ سے نارمل تعلقات رہے ہوں۔

"یہ کیا بنا رہی ہو۔"

وہ چند قدم بڑھا کر اس کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اتنا قریب کہ شمیل کی مسحور کن خوشبو ارشین کے حس شامہ پر چھا گئی۔ وہ ایزل کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"یہ تو غالباً کسی گاؤں کا منظر ہے۔ کچھ لوگ گھروں سے چیزیں لوٹ رہے ہیں۔ شاید یہاں ڈاکہ پڑا ہے۔"

اس کی اتنی قربت محسوس کرتے ہوئے ارشین سٹپٹا کر وہاں سے ہٹنا چاہتی تھی مگر اس اثناء میں اس نے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیلا کر گویا اپنی گرفت میں لے لیا۔

"بہت خوب۔ تم نے بڑی، خوبصورتی سے گاؤں والوں کی دہشت، پریشانی اور خوف کا تاثر ابھارا ہے۔" وہ بہت آرام اور فرصت سے کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے گرم اور پرجوش ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

ارشین کو اس کے استحقاقانہ لمس کے لپکتے شعلوں سے وحشت ہونے لگی۔

"یہ محض پینٹنگ نہیں ہے۔ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔" وہ اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"کیا مطلب؟" وہ اچنبھے سے بولا۔

"ایک ہفتہ پہلے یہاں سچ مچ ڈاکہ پڑا تھا۔ ڈاکو تمام گھروں میں لوٹ مار کر کے لے گئے تھے۔"

انکشاف اتنا فوری اور ان ہونا تھا کہ مہران نے اسے گھما کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور تفصیل طلب نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ارشین نے دھیرے دھیرے سارا واقعہ بتا دیا۔

"تم نے اسی دن مجھے کیوں نہ اطلاع کی؟"

"کیسے کرتی۔" اس نے پلکیں اٹھائیں۔

"فون کر دیتیں۔ شہر میں بے شمار پی سی او ہیں۔ میں نے اپنا کارڈ تمہیں دیا تھا۔ اس پر گھر اور آفس دونوں کے نمبر درج تھے۔ وہ خفا ہو رہا تھا۔

"آپ نے کبھی میری ذمہ داری قبول نہیں کی۔ کس ناطے پر اور کس حق کے تحت مطلع کرتی۔ آپ کہہ دیتے یہ میرا نہیں تمہارا مسئلہ ہے۔ وہ برجستہ بولی۔ مہران لاجواب ہو گیا۔

"وہ بہرحال میں مقامی ایس پی سے بات کروں گا۔"

"اب کیا فائدہ۔ ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔"

"آئندہ کے لیے تو احتیاطی تدبیر کی جا سکتی ہے ناں۔" وہ کچھ سوچ کر دوبارہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ "ڈاکوؤں کا سامنا کرتے ہوئے ڈر تو لگا ہو گا؟"

"ہاں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "مگر ڈرنے سے مصیبت ٹل نہیں سکتی تھی اس لیے کسی نہ کسی طرح اپنی ہمت بندھاتی رہی۔"

"کتنا نقصان ہوا؟"

"مالی نقصان کا کیا ہے۔ تھوڑی سی محنت زیادہ کر لو تو پورا ہو جاتا ہے" اس کا انداز کہہ رہا تھا۔ آپ اس نقصان کی بات کریں جو پورا نہیں ہوتا۔ یہاں تو خسارہ ہی خسارہ ہے۔

عمر کا، وقت کا، جسم کا، دل کا۔ غرضیکہ ہر شے کا۔

"تم واقعی بہادر اور ثابت قدم ہو۔ پہلے میں سمجھتا تھا پوز کرتی ہو، کوئی کمزور دل لڑکی اتنے سخت حالات میں سروائیو نہیں کر سکتی۔" مہران نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کی زنجیر سی بنا کر رہا سہا فاصلہ بھی مٹا دیا۔ وہ بڑی بے ساختگی کے عالم میں اسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ انداز دوستانہ اور گرم جوش تھا۔ یوں جیسے کبھی کوئی چپقلش نہ رہی ہو۔ آنکھوں میں لطف احساسات کی بھرپور چمک مچل رہی تھی۔

"غلط سمجھتے ہیں آپ ڈیئر سر۔ اتنی بہادر ہوتی تو ان بانہوں کا استحقاق سے لبریز حلقہ توڑ کر کب کی نکل چکی ہوتی۔ یوں بے بسی اور کوفت سے پھڑ پھڑا کر تو نہ رہ جاتی۔ یہ اپنائیت کا مظاہرہ مجھے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف لگ رہا ہے۔ یہ مسکراتا لہجہ مجھے اپنی توہین محسوس ہو رہا ہے۔"

اس کا انا اور عزت نفس پر مہران کا التفات کوڑے کی طرح ضرب لگا رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اس کے بالوں کو جھٹکتا محویت سے اس کے چہرے کے مختلف نقوش کی تراش کو نظروں میں جذب کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی حدت تھی کہ ارشین کا چہرہ جل اٹھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اسے اس طرح پورے اختیارات سمیت گہری نظروں سے دیکھنے سے روک بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کا شوہر تھا۔

"کل سے تم اس دڑبے کے بجائے میرے والے کمرے میں رہا کرنا۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آخر اتنے عرصے سے بھی تو رہ رہی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"میں کچن میں جا کر دیکھوں۔ گونگی بوا کے لیے دلیہ بنایا ہے۔" اس نے اب کی بار مزاحمت کی تو مہران نے ہاتھ ہٹا لئے۔ ارشین نے شکر کا کلمہ پڑھا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

بانہوں کے اس حصار میں اس کے لیے کوئی خواب پرور کیف و سرور نہیں تھا۔ جب تک عزت نفس پر پڑی چوٹ کا اثر زائل نہ ہو جسم آرام و آسائش محسوس کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کا "اندر" بھڑ بھڑ جل رہا تھا۔ باہر سے ٹھنڈی پھوار میں بھیگنے سے کیا فرق پڑتا۔

پیار تو روح تھی زخمی تو دل تھا بلہ یا تو ذہن تھا پھر جسم سکون پا کر کیا کرتا۔

مہران کے پروگرام تو بہت تھے مگر ابھی وہ اپنے کمرے میں آ کر چلیج کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل پر آفس سے کال آ گئی۔ ایمرجنسی طور پر اسے فوری ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا تھا۔ مجبوراً اسے عجلت میں لوٹنا پڑا۔

"میں چند دنوں میں آؤں گا۔" وہ جاتے جاتے اس کے پاس رکا تھا۔

"تم چاہو تو گونگی بوا کو بھی ساتھ لے لو۔ ان کا یہاں کون ہے۔ او کے خدا حافظ۔" "خدا حافظ۔" وہ اس کے گال تھپتھپا کر رخصت ہو گیا۔

خدا جانے کیوں اس کے اپنائیت جتاتے رویے نے ارشین کو ہسٹریا میں مبتلا کر دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چارپائی پر پڑ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا روئی اتنا روئی کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ آنکھیں سوج گئیں مگر پھر بھی دل نہیں بھرا۔

کیا ہوں میں۔ ہر کسی نے اپنے اپنے طریقے سے اپنے پیمانے سے میری شخصیت کا وزن کیا ہے۔

اپنی خواہشوں اور سوچوں کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ کیا اس دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو مجھے میری ذات کے حوالے سے پہچانے مقام دے اپنائیت کا احساس دلائے۔ اے خدا عذابوں کے یہ سلسلے کہاں جا کر ختم ہوں گے۔ محرومی پر خالی پن اور تشنگی کا احساس ہو تو ہو مل جانے پر بھی دل کی خانماں بربادی نہ جائے تو کوئی کیا کرے۔ کس طرح چین پائے۔ اس التفات کے مظاہرے نے تو اور زخم ہرے کر دیے ہیں۔

اپنی ذات کی پامالی کم مائیگی اور بے وقعتی کا احساس سوا تر ہو گیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس قدر افزائی اور تعظیم و تحسین کے مظاہرہ میں سرتاپا اس کا شکر مندی کی تفسیر بن جاتی مگر دل کو یوں محسوس ہوا جیسے سبھی نے تاک تاک کر زخموں پر پتھر مارے ہوں۔

کیا ہے یہ انسانی نفسیات کی کہانی۔ انسان کی خود اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ وہ روتے روتے تھک گئی اور جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆☆☆

"سر! یہ آج کی ڈاک۔" پیون نے اجازت پا کر ادب سے کچھ لفافے میز پر رکھ دیے۔ مہران انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دیگر سرکاری کاغذات کے علاوہ ایک پوسٹ کارڈ سائز کا پھولا ہوا خاکی لفافہ بھی تھا۔ چھونے پر محسوس ہوا جیسے اندر کوئی کارڈ یا فوٹو گراف ہو۔

"یہ کہاں سے آیا ہے؟" اس نے سرسری سا جائزہ لے کر تحکم سے پوچھا۔

"سر! یہ بھی ڈاک کے ساتھ موصول ہوا ہے۔" سامنے کھڑے اے ایس آئی نے جلدی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں نے اپنی موجودگی میں سارا سامان رکھوا دیا ہے۔ ضرورت کی ہر شے موجود ہے سر۔" اے ایس آئی نے ایڑیاں بجائیں۔

"گڈ۔ اب تم جاؤ اور ہاں میں تھوڑی دیر بعد اسلام آباد سے باہر جا رہا ہوں۔ اوپر سے فون آئے تو بتا دینا۔ کل صبح واپس آ جاؤں گا۔"

"یس سر۔"

اے ایس آئی کے جانے کے بعد وہ بڑی ترنگ میں خاکی لفافہ کھولنے لگا۔ سب سے پہلے ایک سفید پرچی سامنے آئی۔

"ڈیئر ایس پی! ان تصاویر کو دیکھ کر تمہیں ثبوت مل جائے گا کہ میں اور ارشین ایک دوسرے کے کتنا "قریب" رہے ہیں اور یہ کہ ارشین کے لیلیٰ شاہ سے تعلقات کس حد تک رازدارانہ و بے تکلفانہ تھے۔ فوٹو گرافی ارشین کے اصرار پر لیلیٰ ہی نے کی تھی۔ کیونکہ ایسی "رنگین" تصاویر کھنچوانے کے لیے کسی وفادار دوست پہ ہی بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ دیکھو اور انجوائے کرو۔

پروفیسر دانیال

مہران کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اس نے اضطراری انداز میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے جونہی ان تصاویر پر نظر ڈالی اس کے نیچے سے زمین نکل کر رہ گئی۔

اس کا چہرہ یوں سرخ ہوا جیسے آگ میں تپ کر دہک اٹھنے والا تانبا۔ جھٹکا اس قدر زوردار تھا کہ وہ کرسی پر نہ بیٹھ سکا۔

طوفانی انداز میں کرسی پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر کاغذ کی عبارت اور تصاویر پر نظر ڈالی پھر انہیں تہ میں ڈال کر لفافہ جیب میں ڈالا اور مجسم قہر بنا آفس سے نکل گیا۔

آج تم میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گی ارشین! میں تمہارے جسم کی کھال کھینچ ڈالوں گا۔ ایک ہنٹر کھا کر تم ہفتوں اٹھنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ آج اس ہنٹر سے میں تمہارے وجود کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔ تمہارے جسم کے ایک ایک ریشے کو دردناک عذاب سے آشنا نہ کروایا تو میرا نام بھی مہران نہیں۔

تم درحقیقت اس قابل ہی نہیں تھیں کہ مجھ جیسے آدمی کی بیوی بنتیں۔ تم اس منصب کی مستحق ہی نہ تھیں۔ یہ حق دنیا میں جیسی کسی سادہ پاکیزہ لڑکی کو ہی جچتا ہے۔

اف کس درجہ گری ہوئی اور غلیظ عورت ہو تم۔ بلکہ تم جیسی بلا وس کو عورت کہنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ عورت ذات کی توہین ہوگی۔

جیپ کا اسٹیرنگ وہیل کھلونے کی طرح اس کے ہاتھ میں گھوم رہا تھا۔ وہ جلد از جلد وسن کوٹ پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اسے سزا دے کر اپنی غیرت پر لگنے والا داغ مٹا سکے۔

☆☆☆☆☆

"اے بیٹی امبر! ادھر تو آؤ۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ چہرہ کیسا پیلا پھٹک ہو رہا ہے۔ جسم بھی دبلا ہو گیا ہے۔ صباحت! تم نے دھیان نہیں دیا اس کی صحت پر۔"

دادی بڑے عرصے بعد گوٹھ سے واپس آئی تھیں۔ امبرین کو لیلیٰ انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی ابھی ابھی ڈراپ کر کے گئی تھی۔ وہ اپنا پرس سنبھالتے ہوئے سلام کر کے چپکے سے اوپر کھسکنے کو تھی کہ دادی نے پکار لیا۔

"میں کس کس کی صحت پر دھیان دوں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ اپنی جان سے بیزار بیٹھے ہیں۔" صباحت گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں چاولوں کی پرات تھی۔

"دادی! میں ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں کافی موٹی ہو گئی تھی اس لیے آج کل ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔" امبرین نے تسلی کے لیے فرانے سے بہانہ گھڑا۔

"آگ لگے اس موئی ڈائٹنگ کو۔ اے بیٹی! کیا سوکھا اچھور بنا ہے۔ سیدھی طرح کھانا کھا کر تھوڑی چربی قدری کیا کرو۔ موٹاپے کی شکایت نہیں رہے گی۔ کھانا چھوڑنے سے موٹاپا تو خیر کیا جائے گا اور بہت سی بیماریاں لگ جائیں گی جسم کو توانائی اور طاقت نہ ملے تو خلیے ٹوٹنے پھوٹنے لگتے ہیں۔ بندہ وقت سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔"

"اچھا دادی! اب خیال رکھوں گی۔" وہ انہیں ٹال کر اوپر آ گئی۔ شاہین کے میٹرک کے سالانہ پرچے ہو رہے تھے۔ وہ سینٹر گئی ہوئی تھی۔

امبرین درمیانی رفتار پر پنکھا چلا کر بیڈ پر چت لیٹ گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

پچھلے چند دنوں سے اسے ایک عجیب سا احساس پشیمانی ہو رہا تھا۔ جیسے رہ رہ کر ضمیر ڈنک مار رہا تھا۔ گو لیلیٰ منزل جا کر وہ ضمیر کے ان کچوکوں کو بھول جاتی تھی مگر جب بھی چند لمحوں کے لیے خود کو حال میں اور ہوش و حواس میں محسوس کرتی یہ احساس اس کے دماغ میں کنڈلی جما کر بیٹھ جاتا۔

ہلکی سی گڑبڑ کا احساس اسے دس پندرہ دن پہلے بھی ہوا تھا جب لیلیٰ شاہ نے اس سے ارشین کی تصاویر منگوائی تھیں۔

"ایسی تصویریں لانا جن میں اس کا چہرہ اور نقوش واضح ہوں۔"

"آپ ان تصویروں کا کیا کریں گی؟"

"بتائیں گے تمہیں جانم۔" اس نے اس کے گال چھو کر ٹالا تھا۔

پھر تین چار دن پہلے جس طرح لیلیٰ شاہ نے اس کی مدہوش کر کے بے خبری میں اس کی عریاں تصاویر کھینچی تھیں۔ اس واقعے نے بھی اس کو ہراساں کر دیا تھا۔ خاص طور پر جس انداز میں

بعد میں پروفیسر کی تصویروں کو اس کی اور ارشین کی تصاویر کیساتھ کمبائن کر فائنل روپ دیا گیا تھا۔ اس نے امبرین کو تھرا کے رکھ دیا تھا۔ یہ تصاویر ایس پی مہران کے پاس جائیں گی تو وہ انہیں دیکھ کر آپی کا کیا حشر کرے گا۔ وہ سوچ کر کانپ کانپ جاتی مگر نشے کے لالچ نے اس کی قوت ارادی کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔

اس کی لگامیں اب اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں رہی تھیں۔ اس کی حیثیت محض ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی تھی۔

کبھی کبھی تو وہ اپنے انجام کا سوچ کر خوف سے منجمد ہو جاتی۔ اسی روش پر چلتی رہی تو "اینڈ" کیا ہوگا۔

اگر لیلیٰ شاہ نے ناراض ہو کر نشہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا تو کیا بنے گا؟ کہاں سے میں اپنی طلب پوری کروں گی اور نشہ نہ ملا تو کس طرح سسک سسک کر مروں گی۔

لیکن یہ سوچیں محض لمحاتی ہوتی تھیں۔ اب اس کے خیالات کا محور فقط یہ رہ گیا تھا کہ کب اس وقت اور کہاں سے ہروئین کی فراہمی ہوتی ہے۔ وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کرے جس سے لیلیٰ خفا ہو جائے۔ کیونکہ اب اس کی زندگی کا انحصار لیلیٰ کے فراہم کردہ نشے پر ہی تھا۔ اس کی کیفیت حد درجہ قابل رحم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا سیلف کنٹرول زیرو ہو گیا تھا اور دن بدن وہ تباہی کے دہانے کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

"ارے نینی! آپ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ ناظر نے گیٹ کھولتے ہی پہلے چیخ ماری پھر بے اختیار آنکھیں ملنے لگا۔

"شریر۔" نینی نے ایک دھپ لگانے کے بعد شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہی مشفق و مہرباں انداز' شگفتہ دھلی دھلائی مسکراہٹ' پیار بھرا نرم گرم انداز۔ کتنی مدت بعد ان میں پرانی نینی کی جھلک آئی تھی۔ ناظر کا دل مسرت سے بھر گیا۔

"ارے بھئی' اتنے محترم و معتبر لوگ گئے تھے انہیں منانے اور واپس لانے۔ کیسے نہ آتیں۔" سفیان نے اپنے کالر اکڑائے۔

"مہران کدھر ہے۔" نینی کے انداز میں چاہت کی وہی سابقہ تڑپ تھی جو مہران کے لیے

خصوص تھی۔

"آفس گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے' شام کو وہیں سے وسن کوٹ روانہ ہو جاؤں گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے' وہ ارشین آپا کو لینے گئے ہیں۔" ناظر نے چور نظروں سے نینی کا چہرہ دیکھا۔ وہ ارشین کے ذکر پر نارمل رہیں۔ وہ لوگ اندر آ گئے تھے۔

"ہائیں۔ واقعی۔" سفیان اچھل ہی تو پڑا۔ نازش بھی متحیر تھی۔

"یہ انقلاب کیسے آ گیا۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"لگتا ہے آج خوش خبریوں کا دن ہے۔" سفیان خوشی سے چھلکا پڑ رہا تھا۔

"ایسا کیسے خود سے چل دیا لینے۔ ہم خود جا کر اپنی بہو کو لاتے۔ اور ابھی تو لوگوں کو بھی انفارم کرنا ہے۔ باقاعدہ شادی کی تقریب ہوگی۔ دعوت ولیمہ ہوگا۔" نینی مصنوعی خفگی سے گویا تھی۔

سفیان کا دل خوشی سے بھرتا چلا جا رہا تھا۔ شکر ہے نینی کا دل ارشین آپا کی طرف سے صاف ہوا۔ اس نے اور نازش نے محنت بھی بہت کی تھی انہیں قائل کرنے کے لیے۔ مہران کے مظالم سن کر انہیں سچ مچ سخت غصہ آیا تھا اور پھر اسی بات نے انہیں پگھلا بھی دیا تھا۔

"اور ابھی درنایاب کے والد صاحب سے معذرت بھی تو کرنا ہے۔" سفیان نے یاد دہانی کرائی۔

"ہاں' ہاں سب کچھ ہی ہوگا۔"

"نینی۔ اشارہ سمجھیں نا۔ کسی بہانے سفی میاں اپنی شادی کا ذکر کرنا چاہ رہے ہیں۔" ناظر نے شرارت کی ابتدا کی۔

"ہاں' خوب یاد دلایا۔ نازش بیٹے! ایسا نہ کریں مہران کے ولیمے کے دن سفیان کا نکاح کر دیں۔ رخصتی فاریہ کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے۔"

"بہت نیک خیال ہے۔" سفیان بے ساختہ بول' پڑا پھر تینوں کے قہقہے نے اسے اتنا شرمندہ کیا کہ جھینپ مٹانے کو فوراً وہاں سے چل دیا۔

☆☆☆☆☆

بات کتنی ہی ناقابل برداشت سہی' لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان ازل سے وحشی ہے۔ تاریخ کائنات شاہد ہے کہ انسان تمام جانداروں میں سے سب سے زیادہ خونخوار' منتقم مزاج اور بے رحم

رہا ہے۔ اتنی تباہی جانوروں، درندوں یا دیگر جنگلی باشندوں نے نہیں مچائی ہوگی جتنی قیامت خود انسان نے دوسرے انسانوں اور زمین پر بسنے والی بے زبان مخلوق پر ڈھائی ہے۔ اگر اسے عقل و تہذیب اور اخلاقیات کے جال میں نہ جکڑا جاتا تو شاید روئے زمین پر اس سے زیادہ ظالم مخلوق اور کوئی نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب جہاں اور جس جس موڑ پر اس پر سے تہذیب و تمدن کا اوڑھا ہوا لبادہ سرکتا ہے، اس کے اندر چھپ کے بیٹھا وحشی درندہ باہر آ جاتا ہے اور اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔

مہران کسی خونی بلا کی طرح وسن کوٹ کے اس گمنام اور تہذیب نو کی روشنی سے محروم گاؤں میں داخل ہوا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ تصویروں والا خاکی لفافہ شرٹ کی اوپری جیب میں تھا۔ لفافے کا لمس یوں محسوس ہوتا تھا گویا سانپوں کی پٹاری سینے پر دھری ہوئی ہے جہاں سے دو شاخہ زبان لہراتے بے شمار کالے ناگ مسلسل اس کو ڈس رہے تھے اور اس کالے کا اثر اتنا سریع تھا کہ اس کا دل زہر سے نیل و نیل ہو گیا تھا۔

ارشین گونگی بوا کے پاس بیٹھی اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ ساتھ میں حسب عادت باتیں بھی کرتی جا رہی تھی باوجود یہ جاننے کے کہ بوا بے چاری بولنے کے ساتھ ساتھ سننے سے بھی معذور ہے، وہ اسی طرح، خود کو بہلانے اور احساس تنہائی مٹانے کے لیے اس کے ساتھ باتوں میں لگی رہتی تھی۔

"اوپر سے فیصلہ آیا ہے بوا! اب ہمیں اس سینٹرل جیل سے کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہماری قید بامشقت ختم کر دی گئی ہے۔ البتہ اسیری کے دن بدستور رہیں گے۔ شنید ہے کہ اسلام آباد کے کسی ٹھکانے پر "نظر بندی" کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ تمہیں قید سخت اور نظر بندی کے درمیان فرق کرنا آیا ہے بوا؟"

دونوں صحن میں لگے آم کے عمر رسیدہ درخت کے نیچے چارپائی بچھائے بیٹھی تھیں۔ اس کے استفسار پر بوا نے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ناقابل فہم انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہیں تو دونوں ہی قانونی سزاؤں کی قسمیں۔ فرق صرف ماحول اور نوعیت کا ہے۔ نظر بندی کی سزا میں اتنی رعایت مل جاتی ہے کہ انسان اپنی مرضی سے کھا پی اور سو سکتا ہے۔ محدود شرائط کے ساتھ من پسند کام کر سکتا ہے۔ قدرے آزادی سے سانس لے سکتا ہے۔ یہ سہولیات قید سخت کی سزا

کاٹنے والوں کا حاصل نہیں ہوتیں۔"

اس کے لبوں پر تلخی حالات سے کشید کی گئی ایک تلخ و مجروح مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اسی لمحے کھٹکا ہوا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس لیے آنے والے کو تردد نہیں کرنا پڑا۔ وردی میں ملبوس مہران سیدھا ان کی طرف آیا تھا۔

ارشین کو حیرانی ہوئی۔ بڑی جلدی پھیرا ڈالا ہے اب کے۔

وہ اضطراری کیفیت میں چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دیکھا، پھر جیسے یکبارگی اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

مقابل کے تیور ہی ایسے تھے۔ ہولا دینے والے۔ رگوں میں بہتے خون کو منجمد کر دینے والے۔

بھنچے ہوئے ہونٹ، رخ خون چھلکاتی آنکھیں، سلوٹ زدہ پیشانی اور قہر و غیض سے تپتے گلابی رخسار۔

"السلام علیکم!" ارشین نے دل ہی دل میں خائف ہوتے ہوئے قدرے سہم کر سلام کیا۔

"اندر آؤ۔" عجیب سا سرد لہجہ تھا اس کا۔

ارشین کو بظاہر ہر برف کی طرح جمے سپاٹ انداز کے پیچھے غضب کے ہزاروں الاؤ بھڑکتے محسوس ہوئے۔

وہ قدم بڑھا چکا تھا اس کا رخ اسی کوٹھڑی کی طرف تھا جو ارشین کا ٹھکانا تھی اور جہاں ہرے پینٹ والی لکڑی کی الماری میں بے شمار اوزار بھرے پڑے تھے۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔" ارشین اس کے پیچھے آتی ہوئی بوکھلا رہی تھی۔ وہ جواباً چپ رہا۔ حتیٰ کہ وہ کمرے میں پہنچ گئے۔

دو چارپائیاں ساتھ ساتھ جڑی ہوئیں۔ پائنتی کی طرف کونے میں رکھا ایزل اور دیوار گیر الماری یہی کل اثاثہ تھا اس اسٹور نما کمرے کا۔

مہران الماری کے ساتھ پشت ٹکا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر ایک جلتی ہوئی گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

ارشین اس کے اس طرح دیکھنے بلکہ نظروں سے بھسم کرنے کے سے انداز پر گھبرا گئی۔ اس کا

دل کہہ رہا تھا کوئی انہونی ہو چکی ہے۔

اسے مہران سے بے طرح خوف محسوس ہوا۔

"مس ارشین بخاری۔" طرز تخاطب ہی نئی افتاد کا تعارف ثابت ہوا تھا۔ وہ جواب میں ہاں ناں کچھ بھی نہ بول سکی۔ ٹکر ٹکر صورت دیکھا کی۔

"جب انسان کو اپنے اندر کے بدصورت اور گندے روپ پر شرمساری محسوس نہیں ہوتی تو پھر وہ دنیا دکھاوے کو اس متعفن روح کو نیک و پاک لبادوں میں لپیٹ کر پیش کیوں کرتا ہے؟"

عجیب ناقابل فہم انداز تھا اس کا۔

"میں تو اول روز سے تمہاری 'لائن' سمجھ چکا تھا۔ بس چانسز دیتا رہا کہ شاید کسی پہلو سے بے گناہی تردید بن کر سامنے آ جائے۔ نیکی گناہ پر غالب آ جائے' ہو سکتا ہے میرے خدشات اور الزامات محض مغالطہ ہوں۔ مگر نہیں تم نے ثابت کر دیا کہ انسان کا اصل نہیں بدلا کرتا۔ بے وقوف تو میں بنا۔ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی ملاقاتوں اسٹامپ پیپر پر لکھے راضی نامے کے ناقابل تردید ثبوت کے باوجود رعایت دے کر معافی کی سرحدوں پر لانے کا سوچ رہا تھا۔ شاید عمل بھی کر گزرتا اگر۔"

وہ پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ لپک تھی۔ ان میں انسانی خون کی پیاس واضح نمایاں تھی۔ بے پناہ خوف تیز سمندری رو کی طرح ارشین کے وجود میں اترتا چلا گیا۔ وہ لب بستہ و ساکت کھڑی رہ گئی۔

کیا ہوا ہے میرے مالک۔

یہ لمحہ لمحہ روح کو ذبح کرنے والا شعلہ فطرت شخص میرے کس کس قصور پر لاوا اگل رہا ہے۔

"مس ارشین بخاری۔"

"جی۔" بمشکل وہ حلق سے آواز نکال پائی تھی۔

"قلبی و جسمانی طور پر عورت پر سب سے زیادہ حق کس کا ہوتا ہے؟" بہت دھیمے استفسار میں بلا کی چبھن اور تلخی تھی۔ وہ چپ رہی۔ جواب میں پوری قوت سے مہران کا تھپڑ اس کے منہ پہ پڑا۔

"بتاؤ۔" اس کی دھاڑ کے ساتھ ہی اس کے حواس جواب دینے لگے۔ پولیس آفیسر کا

بھرپور ورزشی ہاتھ بڑے کٹے مجرموں کا پانی پتا کر دیا ہے۔ وہ تو ایک کمزور سی لڑکی تھی۔

"میرے پاس ڈراموں کے لیے ٹائم نہیں ہے۔ نہ لمبی چوڑی عدالت لگانے کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی صفائی بیان کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ اس کے بعد تمہیں سزا سنا دی جائے گی۔"

"لگا لیں عدالتیں۔ جو مرضی سزا سنا دیں۔ اب یہ تماشا میرے لیے نیا نہیں رہا۔ پہلے یہ فرمائیں جرم کیا سرزد ہوا ہے۔ کون سی دفعہ لگی ہے اب کے۔" وہ سنبھل کر گویا ہوئی۔

مہران نے خاکی لفافہ نکال کر اس کے منہ پر دے مارا۔

"اسے کھولو دیکھو اور اس میں رکھی ہوئی پرچی کو بھی پڑھو۔" ارشین نے کانپتے ہاتھوں سے زمین پر گرا لفافہ کھولا۔

اس کا دل کہہ رہا تھا۔ وہ کسی گھناؤنی مکر و سازش میں ملوث کر دی گئی ہے۔

گو کہ وہ ذہنی طور پر "بدترین" کے لیے تیار ہو چکی تھی' مگر پھر بھی جب لفافہ کھول کر تصاویر دیکھیں اور پرچہ پڑھا تو اس کے حواس معطل ہو گئے۔

اس کی آنکھوں کے آگے گہری تاریکی چھا رہی تھی۔

یوں لگا گویا قدموں تلے کی زمین اور سر کا آسمان چھن گیا ہو۔ اس کا وجود خلا میں معلق ہو گیا تھا۔

"اب میرے سوال کا مطلب سمجھ میں آیا؟" وہ بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"چلو میں دوبارہ دہراتا ہوں۔ عورت کے دل' روح اور جسم کا مالک کون ہوتا ہے؟ جواب بھی میں تمہیں خود دوں گا۔ ایک شریف اور عفت مآب عورت تو یہ استحقاق فقط اپنے شوہر کو دیتی ہے' البتہ عصمت و ناموس کے مفہوم سے ناآشنا عورت کا وجود عوامی گزرگاہ کی مانند ہوتا ہے جسے جو چاہے بقدر ضرورت و استطاعت استعمال کر لے۔ تمہارا دونوں میں سے کس کیٹگری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ خود کر لو۔"

وہ دیوار گیر الماری کی چابی کی ہول میں گمانے لگا۔

"کہو کیا رشتہ ہے تمہارا پروفیسر دانیال سے؟" وہ الماری کے خانے کھنگال رہا تھا۔

اس کی سانسیں پھنکاریں مار رہی تھیں۔

وہ چونک پڑی اور پھر جیسے کسی خواب سے جاگ کر بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔ مہران کے ہاتھ میں وہی ہنٹر لہرا رہا تھا۔ جس کا کاری وار اس کا بدن ابھی بھولا نہیں تھا۔

"ایس پی صاحب پلیز میری بات سنیں۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا لگی۔

"جس کی مرضی قسم لے لیں۔ یہ تصویریں میری نہیں ہیں۔"

"کیا یہ چہرہ تمہارا نہیں ہے؟ یہ نقوش تمہارے نہیں ہیں۔ کیا اپنی پہچان بھی دشوار ہو گئی ہے۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"کہو تو آئینہ دکھا دوں!" یوں لگتا تھا جیسے وہ اسکے وجود کے پرخچے اڑا دے گا۔

"چہرہ بے شک میرا ہے مگر۔" وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔ مہران کی موجودگی میں وہ ان تصاویر پر دوسری نظر ڈالنے سے بھی کترا رہی تھی۔

اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ شاک اتنا شدید تھا کہ وہ حواس یکجا کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

انسان کتنا بھی گر جائے تھوڑا بہت تو انسان رہتا ہے۔ اس میں انسانیت کی کوئی رمق تو باقی رہتی ہے۔

پروفیسر دانیال مہدی۔ آپ اس حد کو بھی پار کر گئے!

اس نے پرچی پر لکھی عبارت پر دوبارہ نگاہ دوڑائی اور بے اختیار جھرجھری لے کر اسے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس کا چہرہ رنگ پہ رنگ بدل رہا تھا۔ کنپٹی کے پاس کوئی رگ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ ہمت کر کے اس نے ان تصاویر کو دوبارہ دیکھا۔

بیڈ روم کا منظر تھا۔ ایک تصویر میں وہ بیڈ پر نیم دراز پروفیسر دانیال کے کندھے پر سر رکھے ہوئے تھی۔ دوسری میں بیڈ کی پائنتی سے سر ٹکائے مسکراتی ہوئی پاس بیٹھے پروفیسر کی طرف لگاوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ تیسری تصویر میں وہ کھڑکی سے لگ کر کھڑی تھی اور ساتھ میں پروفیسر اس کے کندھوں پر ہاتھوں پھیلائے کھڑے تھے۔ ہر تصویر میں اس کا سراپا لباس سے محروم تھا۔ اس کا زندہ زمین میں دفن ہو جانے کو جی چاہنے لگا۔

پھر گویا شعور پر ایک ضرب پڑی۔

اس نے پلکیں جھپکا کر بے یقینی سے تصویر کو دوبارہ دیکھا۔ دائیں پسلی کے پاس چوٹی کے

برابر گول براؤن نشان تھا اور اس نشان کو وہ ہزاروں لاکھوں میں شناخت کر سکتی تھی۔ چار پانچ سال پہلے اس جگہ امبرین کو ایک پھوڑا نکل آیا تھا۔ زخم خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ ہفتے تک تکلیف ختم نہیں ہوئی تھی۔ اینٹی بائیوٹک گولیوں اور مرہم وغیرہ کے استعمال کے بعد کہیں جا کر مرض میں افاقہ ہوا تھا۔ ایک ماہ بعد پھوڑا ٹھیک ہو گیا مگر اپنا نشان چھوڑ گیا۔ یہ نشان اب بھی اس طرح موجود تھا امبرین متعدد بار اس منحوس نشان کو کوس کر اسے مٹانے کی ناکام تدابیر کر چکی تھی۔

اب کے نئے سرے سے ارشین نے تصویر کے سراپے کو دیکھا اور پھر خود بخود گتھی سلجھ گئی۔ بے شک دیکھنے والا قد و قامت اور جسامت کی مماثلت کے باعث تفریق نہ کر پاتا مگر وہ تو اپنے وجود کے روئیں روئیں سے باخبر تھی۔ تصویر میں بائیں ہاتھ میں پہنی ہوئی فیروزے کی انگوٹھی نے رہا سہا شک بھی دور کر دیا۔ ایک دفعہ راشد انکل (سعد کے والد) سوات کے ٹور سے واپسی پر دو انگوٹھیاں تحفتاً لائے تھے۔ ایک سرخ عقیق کی اور دوسری فیروزے کی۔ ارشین نے اپنے لیے عقیق جڑی انگوٹھی پسند کی تھی۔ رقیہ آنٹی نے اسے اور امبرین کو اپنے ہاتھ سے دونوں انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔

امبرین فیروزے کی یہ انگوٹھی سعد کی امی کے ہاتھوں پہن کر بہت خوش تھی۔ دادو نے تو دبے انداز میں چھیڑا بھی تھا۔

"لو بھئی امبر! تمہاری ساس تمہیں انگوٹھی پہنا گئی ہیں۔"

پھر یہ انگوٹھی کبھی امبرین کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے جدا نہیں ہوئی۔

کیا لیلیٰ اور پروفیسر دانیال نے گٹھ جوڑ کر کے امبرین کو اس سازش کے لیے تیار کیا ہے یا خود امبرین اس کی دشمنی میں اتنی آگے چلی گئی کہ شرم و حیا کا ہر لبادہ اتار پھینکا۔

اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

"اگر یہ تصویریں تمہاری نہیں ہیں تو پھر کس کی ہیں؟" وہ شاید آخری مرتبہ اسے صفائی کا موقعہ دے رہا تھا۔

وہ بے گناہ تھی مگر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بہن کے منہ پر کیچڑ نہیں مل سکتی تھی۔

کس منہ سے کہتی یہ سیاہ منظر نامہ اس کی بہن کے تعاون سے پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ وہ تصدیق کے لیے سیدھا بخاری لاج جاتا۔ بابا جان اور بی بی جان کو دوسرے صاحبزادی کا کارنامہ

پتا چلتا تو گویا نیا بھونچال برپا ہو جاتا۔ امبرین کی جو گت بنتی سو بنتی اور انکشاف سے جو بدنامی پھیلتی اس کے بعد کوئی اسے بیاہنے نہ آتا' کیا خبر بابا جان اشتعال میں آ کر امبرین کی جان ہی لے لیں۔ یا خود کو کچھ کر ڈالیں۔ انتہا پرست شخص سے کیا بعید۔ اور پھر خود مہران کی نظر میں اس کی بہن کی کیا عزت رہتی۔

وہ اپنے متوقع انجام سے بے نیاز اس فکر میں غلطاں تھی کہ امبرین لیلیٰ شاہ اور پروفیسر تک کیسے پہنچی۔

وہ بے وقوف سی جذباتی لڑکی ان مکار بلاؤں کے ہتھے کس طرح چڑھی۔ اس نے گھر کے تنگ' دبے دبائے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر باہر کی دنیا تک کیونکر رسائی حاصل کی۔

اور گھر والے کس حد تک اس بات سے واقف ہیں۔

امبرین کا ان خطرناک لوگوں سے میل جول حد درجہ تشویش ناک امر تھا۔ کاش وہ اپنے گھر لوٹ کر ساری صورت حال سنبھال سکتی۔

اپنے ہاتھوں سے لگائیے اور سینچے گئے پودے کی جڑ میں کیڑا لگ جائے تو مالی کی پریشانی دیدنی ہوتی ہے۔

وہ بری طرح بے چین تھی۔ یہ احساس نہیں تھا کہ بہن کے ہاتھوں وہ کس طرح ذلت و رسوائی کے گہرے گڑھے میں سرتاپا غرق ہو چکی ہے۔ اسے تو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ امبرین غلط قسم کے لوگوں میں پھنس گئی ہے اور اب اسے ان کے چنگل سے نکالنا بہت ضروری ہے ورنہ دوسرا عظیم نقصان ہو جائے گا۔ پہلی زک تو میرے ہاتھوں گھر والے اٹھا ہی چکے ہیں' اللہ نہ کرے جو دوسرا چرکا لگے۔

"تمہاری خاموشی تمہارے جرم کی آئینہ دار ہے۔" مہران نے گہری سانس لے کر بالآخر فیصلہ سنا دیا۔

"اور مقدس شرعی رشتے کی بے حرمتی کی ایک یہی سزا ہوتی ہے۔" اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔

"سزائے موت۔" وہ آگے بڑھا یوں جیسے اس کی تکا بوٹی کر ڈالے گا۔

"نہیں پلیز۔" موت کو سامنے دیکھ کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آخر تھی تو انسان۔ چوٹ

پڑنے پر درد سب کو ایک سا ہوتا ہے۔ اس کا جسم لوہے یا پتھر سے نہیں بنا تھا کہ تکلیف سہہ کر اف نہ کرتا۔ مہران نے اندھا دھند ہنٹر گھما کر مارا ارشین لاشعوری طور پر بچاؤ کے لیے ایک سمت کو ہو گئی تھی اس لیے وار ترچھا پڑا اور اس کے بائیں بازو کو انگارے کی طرح دہکا کر دیوار سے ٹکرا کر واپس آ گیا۔ اگر براہ راست قوت سے گھومتا ہوا ہنٹر اس کے جسم پر لگتا تو اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیتا، یقیناً وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہتی ابھی بھی بازو پر لگتے ہی ارشین کے منہ سے دلدوز چیخ نکل گئی۔ وہ زمین پر گر پڑی تھی۔

"تمہارا زندہ رہنا انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔" وہ دوسرے وار کے لیے پر تولنے لگا جوں ہی اس نے ہاتھ تول کر اوپر اٹھایا اسی لمحے کسی کمزور نقاہت سے چور بوڑھے ہاتھ نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ تعجب سے پلٹا۔

خدا جانے گونگی بوا کب اندر آئی تھی۔ یقیناً بڑی دشواری کے بعد صحن سے اٹھ کر یہاں تک پہنچی تھی۔ وہ سن نہیں سکتی تھی' بول نہیں سکتی تھی مگر دیکھ ضرور سکتی تھی۔ بوڑھی اور ضعیف ولا چار سہی احساسات تو بہر حال رکھتی تھی۔ مہران ارشین کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا کون سا مشکل تھا کہ یہ تعلق میاں بیوی سے زیادہ آقا اور غلام کا سا ہے۔ پھر ارشین کی نیک دلی' مہربان طبیعت' ہمدردانہ انداز اور اخلاص سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ سچائی کتنے عرصے تک چھپی رہ سکتی ہے۔

"آپ آگے سے ہٹ جائیں بوا۔" وہ ناگواری دبا کر بولا "مجھے اپنا حساب کتاب کرنے دیں۔" مگر بوا اس لمحے چٹان بن گئی۔ غوں غاں کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ہنٹر چھیننے لگی۔ جب ناکامی ہوئی تو آخری چارہ کار کے طور پر وہ ارشین کے آگے آ گئی اور اس کے وجود پر اپنے ناتواں بازو پھیلا کر گویا ڈھانپ لی۔

"اس پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے تمہیں مجھ پر وار کرنا ہوگا۔" بوا کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھنا مشکل نہیں تھا۔ مہران پر انتہا درجے کی جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ لاکھ بے رحم سہی بزرگوں سے ادب لحاظ سے پیش آنے کی بنیادی تربیت فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے بوا۔ تمہاری جان کے صدقے میں اس کی جان بخشی کر رہا ہوں۔"

اس نے شکست خوردہ انداز میں ہنٹر پھینک دیا۔ بوا ارشین کے بازو کو سہارا دے کر اٹھا رہی

تھی۔اس کے گال تھپتھپا کر ہوش میں لا رہی تھی۔

"مگر یہ طے شدہ امر ہے کہ اب میرے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہے گا۔ میں شہر جاتے ہی طلاق کے کاغذات بھجوا دوں گا۔ اس کے فوراً بعد میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔" وہ باہر نکل گیا۔

ارشین زخمی ضرور تھی مگر بے ہوش بہر حال نہیں تھی، اس نے اس کے الفاظ سن لیے تھے۔

وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے جاتا دیکھنے لگی۔

بوا اشاروں سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں بوا۔" وہ سسکی دبا کر کراہتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور بائیں بازو کی آستین اوپر چڑھا کر زخم کا جائزہ لینے لگی۔ دو انچ چوڑی لمبی سرخ لائن سے خون رسنے لگا تھا۔

"یہ پہلی دفعہ کی بات تو نہیں ہے۔ میں عادی ہو گئی ہوں اب۔ کہتے ہیں پہلی ناکامی، پہلی ذلت اور پہلی جدائی کا درد بہت شدت سے اٹھتا ہے اس کے بعد بندہ بے حسی لپیٹ لیتا ہے۔ سب کچھ ایک جیسا لگنے لگتا ہے، مجھے بار بار اپنی روح اور جسم و جاں کو قتل کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب نیا الزام یا نئی ضرب بھی نئی نہیں لگتی۔ ایک دن کا معاملہ تھوڑی ہے۔ الزامات بھی سر لیتے رہے ہیں اور معتوب بھی ہوتے رہے ہیں، کبھی ایک کے لیے کبھی دوسرے کے لیے۔" اس کی آنکھوں میں پانی گرم ریلے کی طرح اترا "چلو ایک بار اور سہی۔ مشق ستم۔ یہ سنگ باری خدا دکھ سے بھی تو انہیں ہی نوازتا ہے جو برداشت کے قابل نظر آتے ہیں۔ مجھے تھوڑی سی ہلدی لا دو باروچی خانے سے۔ اسے لگانے سے شاید آرام آ جائے۔ بہت جلن ہو رہی ہے۔" بے چاری بوا سن کہاں سکتی تھی۔ ارشین تو یونہی عادتاً بول رہی تھی۔ ہلدی کے لیے اس نے اشارہ سے زخم پر انگلی لگا کر سمجھایا تو وہ سمجھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ ارشین چارپائی کے پائے کا سہارا لے کر بمشکل اٹھی اور چارپائی پر دراز ہو کر چھت پر نظر جما دی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا امبرین۔" خاموش آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے نکل کر کنپٹیاں بھگوتے تکیے پر گر رہے تھے۔ بوا ہلدی اور سرسوں کا تیل ملا کر لے آئی اور ارشین کے منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے اس کے بازو پر لگانے لگی۔

☆☆☆☆☆

نہ تو آئے گی

اور نہ ہی چین آئے گا

میرے آنگن کی ہری بیلوں کا

پتا پتا سوکھتا جائے گا

نہ تو آئے گی۔

ایف ایم ون ہنڈرڈ سے جنید جمشید کا گیت پورے زور و شور سے نشر ہو رہا تھا اور ایف ایم کے دو ازلی دیوانے ناظر اور سفیان لہک لہک کر گلوکار کے ساتھ تان ملا رہے تھے۔

"بے فکر رہو سیفی! اسکو بھی پکڑ لائیں گے۔ لہٰذا آنگن کی بیلوں کے سوکھنے کا کوئی امکان نہیں ہے فی الحال۔"

لاؤنج میں نینی کے ساتھ گپ شپ کرتی نازش نے کھلکھلاتے ہوئے ہانک لگائی تھی۔ نینی نے اصرار سے اسے رات کے کھانے پر روک لیا تھا۔ پروفیسر دانیال کسی کام کے سلسلے میں کل سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ آج آنے کا ارادہ نہیں تھا لہٰذا نازش کو بھی واپسی کی خاص جلدی نہیں تھی۔

اس نے سفیان کو بھیج کر مہوش کو سکول سے چھٹی پر ادھر ہی بلوا لیا تھا۔ اب وہ لوگ مہران کا انتظار کر رہے تھے۔

"مہران کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔" نینی دو تین بار اپنی بے چینی کا اظہار کر چکی تھی۔

"خدا جانے وہ ارشین کو بھی لے کر آئیں گے یا۔ ناظر کیا کہہ کر گئے تھے وہ۔"

"کہہ رہے تھے وہ آفس سے دس کوٹ جائیں گے۔ میں نے پوچھا۔ بھابھی جان کو لینے جا رہے ہیں؟ تو جواباً گھور کر آگے بڑھ گئے اب اس گھوری کا مطلب ہاں تھا یا ناں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

وہ کوک کی بوتلیں ٹرے میں سجا کر لایا تھا۔

"رہنے دو بھئی۔ دوپہر سے تین بار پی چکے ہیں۔ ابھی تو اپریل ہے۔ گرمی کا اصل آغاز تو مئی جون میں ہوگا۔" نازش نے منع کیا۔

"خیر ہے اپیا! ایک بوتل پی لینے سے کیا ہو جاتا ہے۔ یوں بھی بے بی کو پسند ہے۔" اس نے زرد اور آسمانی کاٹن کے جدید تراش کے خوبصورت سے فراک میں ملبوس سرخ پھولے پھولے

گالوں والی بچی کو بوتل تھمائی۔ بڑی پیاری اور ہنس مکھ بچی تھی۔ ناظر اور سفیان سے خوب بے تکلف تھی۔ دھڑلے سے فرمائشیں منواتی تھی۔ وہ بھی جی بھر کے لاڈ اٹھاتے تھے کہ انسانی وجود کی رونقوں کو ترسے ہوئے تھے۔

"منی ماموں! مجھے چپس لادیں۔"

مہوش نے نزاکت سے بوتل تھام کر ڈیک کے بٹنوں سے کھیلتے سفیان کو آرڈر دیا۔ انداز میں حاکمانہ قسم کا قطعی پن تھا۔ سفیان بے ساختہ مسکرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"اچھا ملکہ عالیہ! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ لائیے نکالئے پیسے۔ ابھی "پھر" سے اڑ کر چپس لادیتے ہیں۔" اس نے ہتھیلی اس کے سامنے کی اور مسکی صورت بنا کر بولا۔

"جی نہیں۔" وہ چڑ کر ڈپٹنے لگی۔ "پیسے آپ اپنی جیب سے نکالیں۔ سمجھ آئی۔"

"واہ! اپنی جیب سے کیوں؟" سفیان لڑاکا انداز میں ہاتھ نچانے لگا۔ "ملکہ عالیہ تم ہو۔ پیسے بھی تم ہی تو گی۔ ہم تو غلام قسم کے غریب سے عوام ہیں۔ ہمارے پاس پیسے کہاں۔"

"مہوش بیٹے! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اتنی چپڑ تو آپ کبھی نہیں تھیں۔" نازش اس کی خبر لے رہی تھی۔ "خوامخواہ ماموں کو تنگ کر رہی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ڈنر شروع ہو جائے گا۔ یہ کون سا ٹائم ہے چپس کھانے کا۔"

"یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ پرائے پھڈے میں ٹانگ نہ اڑائیں جی۔ ہم ڈنر کے بعد مارکیٹ کا چکر لگائیں گے اور آئس کریم اور چپس دونوں لیں گے۔" سفیان مہوش کے گرد بازو پھیلا کر اسے خوش کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

"اسی طرح بگاڑو گے اسے۔" نازش نے مصنوعی خفگی سے سفیان کو دیکھا۔ اس کے پہلے کہ وہ جواباً کوئی چلبلی سی بات کہتا' جیپ کے مخصوص ہارن نے گویا سارے آفریدی ہاؤس کو دھڑکا کے رکھ دیا۔

"بھائی جان آ گئے ہیں۔" سفیان جلدی سے مہوش کو گود سے اتار کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں مسرت آمیز لرزش تھی۔

نجی بھی غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اتنی طویل جدائی کے بعد لاڈلے بیٹے کی صورت دیکھنے کو ملی تھی۔ ان کے دل سے ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔

"ارشین آپا بھی ہوں گی نا۔ ساتھ میں۔" ناظر اشتیاق سے پوچھتا ہوا سفیان کے پیچھے لپکا۔

"عجیب طبیعت پائی ہے اس بچے نے۔ ہر کام خلاف توقع ہی کریں گے۔ اب بھلا بغیر بتائے بہو کو خود جا کر لانے کی کیا تک بنتی ہے۔ جہاں اتنی تاخیر ہوئی وہاں تھوڑی اور سہی۔ ذرا رنگ ڈھنگ سے سلیقے طریقے سے یہاں لاتے۔" نجی قدم آگے بڑھاتے ہوئے قدرے خفا خفا سی نازش سے مخاطب تھیں۔

"بہر حال ناظر سے کہہ کر گیسٹ بیڈروم سیٹ کرا دیتی ہوں۔"

"مگر نجی! مہران کا بیڈروم سیٹ ہی ہے اور وہاں اتنی گنجائش ہے کہ دوسرا فرد آسانی سے سیٹ ہو سکے....."

نازش نے حیرانی سے ان کی صورت دیکھتے ہوئے کچھ احساس دلانا چاہا۔ شادی کو سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ لہٰذا اس تکلف کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹے! لیکن ماں ہونے کے ناطے میرے بھی مان ارمان ہیں۔ میری خواہش ہے اپنے ہاتھوں سے بیٹے کے سر پر سہرا سجا کر بجی سجائی دلہن کے ہمراہ اس کے کمرے تک لے کر جاؤں اور چاؤ سے دلہن کو بیٹے کے حوالے کروں۔ ابھی نہ تو گھر سجا ہے نہ مہران کا کمرہ اور نہ گھر کا آنگن مہمانوں سے بھرا ہے۔ ایسے نہیں بھئی۔"

وہ مسکرائیں۔ ان کا چہرہ خواہشوں کی یلغار سے گلنار سا ہو گیا تھا۔ اسی لمحے مہران اندر آ گیا۔

"بھائی جان اکیلے آئے ہیں نجی۔" ناظر اور سفیان اس کے ارد گرد تھے۔ نجی نے سنا ہی کہاں۔ وہ تو بیٹے کا چہرہ دیکھتے ہی جیسے کسی جادو کے اثر سے اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی تھیں۔

"السلام علیکم نجی۔" ایک چور مجرمانہ دھیمی آواز انہیں بہت قریب سے سنائی دی۔ مہران عین ان کے سامنے نظر اور سر جھکا کر کھڑا تھا۔ ایک مدت بعد ان کی آنکھوں کا آنگن اولاد کی دید سے سیراب ہو رہا تھا۔ وہ تشنہ نظروں سے دیکھتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ آنکھوں سے سیلاب بہنا شروع ہو گیا۔

"نینی!" مہران اسی طرح سر جھکائے چند قدم اور آگے آیا۔ وہ ان سے جھجک رہا تھا۔ اپنے کیے کی شرمساری پاؤں میں زنجیر بن کر چھنک رہی تھی۔ پھر نینی کے آنسوؤں نے اس ہچکچاہٹ کا ہالہ توڑ دیا۔ وہ بے ساختہ ان کے گلے سے لگ گیا۔

"میرے بچے' میرے بیٹے' میرے چاند۔" نینی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں اور پھر اس کے سر کے بوسے لینے لگیں۔ وہ ان کے آنسو پونچھتا ہوا انہیں چپ کرا رہا تھا۔ "کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"کہیں بھی نہیں نینی۔" اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"ناظر! پانی لاؤ۔" وہ انہیں لئے صوفے کی طرف بڑھا۔ ناظر نے حکم کی تعمیل کی۔

"لیں نینی! پانی پئیں۔ آپ کے آنسو مجھے کتنی تکلیف دیتے ہیں۔ آپ جانتی تو ہیں۔" وہ انہیں بٹھا کر پانی پلانے لگا۔

"بہو کہاں ہے؟" کافی دیر بعد وہ سنبھلنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

مہران چونکا۔ ان کی صورت دیکھی پھر سوال کی نوعیت سمجھ گیا۔

"وہ تو نینی! آپ لائیں گی اس گھر میں' اپنی مرضی سے۔" وہ جان کر تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا تھا۔

"آپ جب جی چاہے درنایاب کے والد صاحب سے بات فائنل کر لیں۔ میں خود بھی اب یہی چاہتا ہوں کہ اس گھر کو سنبھالنے اور آپ کی مدد کے لئے ایک خاتون آ جانی چاہئے۔ آپ بے شک اسی ماہ شادی کی تاریخ طے کریں۔" وہ خلاف مزاج بڑے آرام سے اپنی شادی کی بات کر رہا تھا۔

"درنایاب؟" نینی سمیت سب ہی آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور نازش تو مہران کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اسے دال میں کچھ کالا کالا نظر آنے لگا۔ یہ تو اچھی طرح جانتی تھی کہ مہران کے دل میں ارشین کے خلاف چھایا ہوا غبار چھٹا نہیں تھا۔

"آپ سمجھے نہیں بھائی جان! نینی ارشین آپا کے لئے راضی ہو چکی ہیں۔ وہ انہیں اپنی بہو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔" سفیان سمجھا' شاید وہ نینی کی خوشنودی کے لئے کہہ رہا ہے۔

"مگر اب میں انہیں بیوی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" وہ دو ٹوک بولا۔ "دو ایک

دن میں فیصلہ ہو جائے گا۔ میں کورٹ سے طلاق کے کاغذات تیار کروا رہا ہوں۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"تم ہوش میں تو ہو مہران۔" نازش غصے سے پھٹ پڑی۔

"اب جبکہ سارے دلدر دور ہو چکے ہیں' راستہ صاف ہو چکا ہے تو تم نے نئی ڈرامے بازی شروع کر دی۔" نازش کو سچ مچ اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اسی لئے اس کا لہجہ بے مروت ہو گیا تھا۔

"میں نے طویل عرصے سے چلنے والی اس ڈرامے بازی کا اختتام کیا ہے مسز دانیال۔" وہ خشک لہجے میں گویا ہوا۔

"میں نے ارشین کو بیوی بنا کر نہیں رکھنا' پہلی بات۔ اور دوسری بات یہ کہ میں درنایاب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اینڈ دیٹس آل۔" اس کے انداز میں حتمی پن تھا۔

نینی صدمے کی حالت میں سینے پر ہاتھ رکھے اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

"اتنی بے رحمی' خونخواری اور سنگدلی میری تربیت کا حصہ تو نہیں تھی۔ کس نے دیا ہے آپ کو یہ وحشیانہ روپ۔" وہ سخت دکھی تھیں۔

سفیان اور ناظر گم صم بیٹھے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ سفیان نے ریڈیو کا بٹن آف کر دیا تھا۔ معاملے کی سنگینی کے پیش نظر وہ مہوش کو ساتھ والے کمرے میں کارٹون فلم لگا کر بٹھا آیا تھا۔

"آخر بات کیا ہوئی' کچھ پتا تو چلے۔" نازش نے پریشانی سے کہا۔

"بات کل بھی وہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ "وہ میرے قابل نہیں ہے۔"

"گویا سات آٹھ ماہ پہلے آپ کے قابل تھی' جب آپ نے اس سے شادی کی تھی؟" نینی تلخی سے گویا ہوئیں۔

"نہیں' اس وقت بھی نہیں تھی۔ محض نازش کی خاطر یہ پھندا گلے میں ڈالا تھا۔" وہ برجستہ بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یا تو میں بہت بوڑھی اور کند ذہن ہو گئی ہوں یا پھر میری اولاد

نے مجھ پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس درجہ بے تربیتی اور بدنظمی کبھی اس گھر میں دیکھنے کو نہیں آئی اور وہ بھی شادی بیاہ جیسے سنجیدہ معاملات میں۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"آپ ناراض نہ ہوں تائی۔" مہران نے ان کی دلجوئی کے لئے بمشکل لہجے میں نرمی اور ملائمت پیدا کی۔ "جو ہوا سے میری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں اور سب کچھ بھلا کر نئے سرے سے بات کا آغاز کریں۔ اور یوں بھی آپ ارشین کی وجہ سے ہی مجھ سے خفا ہوئی تھیں۔ میں آپ کی خفگی دور کرنے کے لئے اس "وجہ" کو اپنی زندگی سے خارج کر رہا ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔"

"اس وقت تک مجھے آپ کے "کارناموں" کا علم نہیں تھا۔" تائی سختی سے بولیں۔ "اب تک کیا سلوک روا رکھا ہے آپ نے اس کے ساتھ۔ ذرا بتائیں گے مجھے۔"

مہران ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آپ نے اپنے باپ دادا کا نام بھی ڈبو دیا۔ میری تربیت تو ایک طرف رہی۔ اتنا تماشا لگانے کے بعد بھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" وہ سیدھے سجاؤ سرزنش کر رہی تھیں۔

"ہم لوگ کل جا رہے ہیں اپنی بہو کو لانے۔" انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

"نہیں آپ لوگ وہاں نہیں جائیں گے۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے۔" تائی اپنا غصہ ضبط نہ کر سکیں۔

"مجھے آرڈر دے رہے ہیں آپ؟ ہم کیوں نہ جائیں۔ ہماری بہو ہمارے خاندان کی عزت ویرانوں میں پڑی رل رہی ہے۔ یہاں رہنا بسنا اس کا حق ہے۔ اور خبردار جو آپ نے طلاق کا لفظ منہ سے نکالا۔"

"تائی! میری بات....."

"میں نے کہا ناں۔ اگر تم نے ارشین کو طلاق دی یا اس بارے میں سوچا تو میرا مرا منہ دیکھنا۔" وہ جلالی موڈ میں نظر آ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے طلاق نہیں دیتا۔" وہ بادل نخواستہ کڑوا گھونٹ پی کر بولا۔ "لیکن اس کے لئے میری دو شرائط ماننا ہوں گی۔ نمبر ایک۔ کوئی اس سے ملنے گاؤں نہیں جائے گا۔ نمبر دو۔ آپ کو دریاب کے ہاں جا کر میری شادی کی بات کرنا ہوگی۔ بیوی میری بہرحال وہی

کہلائے گی۔ میں کسی ارشین بخاری کو مسز مہران کے طور پر نہیں جانتا۔ میرا اس عورت سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔"

وہ سرخ چہرے سمیت تیزی سے اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔

لاؤنج میں بیٹھے حاضرین بت بنے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

"پروفیسر دانیال مہدی آئے ہیں میڈم۔" تارا کی اطلاع پر لیلیٰ شاہ اپنے باب کٹ سرخی مائل چمکدار سلکی بالوں میں انگلیاں گھماتی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"ہیلو پروفیسر! کیسے راستہ بھول پڑے جناب۔ کہاں تھے اتنے دنوں سے۔" اس نے گرمجوشی سے ان کے ہاتھ ملایا۔ وہ اس وقت سفاری سوٹ میں نک سک سے تیار مردانہ وجاہت و متانت کے بہترین ماڈل نظر آ رہے تھے۔

"ایک کام کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ ویسے تو جب سے ان تصویروں کو دیکھا ہے اپنا کام تمام ہو گیا ہے۔ سمجھیں کہ کام سے گئے ہم۔" انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بے تابی و تشنہ لبی کا اظہار کیا۔ صوفے کی پشت پر بازو پھیلائے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے وہ بڑے شاہانہ سٹائل میں بیٹھے ہوئے تھے۔

لیلیٰ شاہ نے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

"جی چاہ رہا ہے اس شعلہ بدن فتنہ ساماں قیامت کو روبرو دیکھیں۔ "وہ" نہ سہی اس کی بہن سہی۔ نسبت تو بہرحال بہت قریب کی ہے۔"

"وہ" کیوں نہ سہی بھئی۔" وہ خوشگواریت سے گویا تھی۔ "اچھی امید رکھیے۔ "رزلٹ" کا انتظار کیجئے۔ پھر دیکھیے گا محبوب کھٹ سے قدموں میں ہوگا۔" وہ کھل کر ہنسی۔

"ایسی تصویریں دیکھ کر بے غیرت سے بے غیرت شوہر کا بھی میٹر گھوم جاتا ہے۔ وہ تو پھر ٹھہرے پٹھان۔ غیرت مند خون والے ایسی عورت کو گھر میں بسانے کے بجائے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں غرق کر دیتے ہیں۔ بلکہ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں سچ مچ وہ اس کا خون نہ کر دے۔ مجھے تو بہرحال اس کے اس عمل سے تسکین ہی ہوگی مگر آپ کی مہم ادھوری رہ جائے گی۔"

"اطمینان رکھیں۔ خونریزی تک نوبت نہیں آئے گی۔" وہ مطمئن تھے۔

"قانونی بندہ ہے۔ بلکہ قانون کا رکھوالا۔" وہ طنزیہ ہوئے۔ "تشدد بھلے سے جتنا کرلے جان سے مارنے کا رسک بھی نہیں لے گا۔ "اس" کو تو بہرحال ایک نہ ایک دن فتح کر ہی لیں گے۔ فی الحال آپ اس کی بہن کا دیدار کرائیے۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو میری تصویریں ہیں جو اس کے اتنے قریب ہیں۔"

وہ نیم مزاحیہ انداز میں گویا ہوئے۔

"داد دیجئے میری فن کاری کی۔" وہ بدستور ہلکے پھلکے موڈ میں تھی۔ پروفیسر کی منتقمانہ فطرت اس کی اپنی فطرت سے لگا کھائی تھی اس لئے دو دنوں میں ہی ان سے گھل مل گئی تھی۔

"کس طرح "کیمرہ ٹرک" کے ذریعے کیا سے کیا بنا ڈالا۔ تین مختلف لوگوں کی تصویروں کو آپس میں ضم کرکے حسب منشا فطری انداز میں سین "ترتیب" دینا آسان کام نہیں تھا۔"

"مانتے ہیں جناب! آپ کی فن کاری کو۔ کہیے کس طرح داد لیں گی۔" لیلیٰ شاہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

"سنا ہے آپ اپنے سینٹر کی کچھ تصویریں امریکہ میں ہونے والی بین الاقوامی نمائش میں بھیج رہے ہیں؟"

"ہاں۔ اگلے ہفتے نمائش ہو رہی ہے۔ میں چند دنوں میں روانہ ہو رہا ہوں۔ نمائش کے بعد بھی تقریباً ایک ماہ تک میرا وہاں قیام ہوگا۔ آپ کو کچھ منگوانا ہے؟"

"منگوانا نہیں "بھجوانا" ہے۔" وہ برجستہ گویا ہوئی۔

"کیا؟"

"آپ پینٹنگز یہیں بھجوا دیجئے۔ ہم خود ان کے اندر سامان "لوڈ" کر دیں گے۔"

"ایسی کون سی چیز ہے جو پینٹنگز کے اندر بھری جا سکتی ہے۔" وہ الجھنے لگے۔ ان کی سوالیہ نظریں لیلیٰ کے چہرے پر تھیں۔

"آپ خود سمجھدار ہیں۔" لیلیٰ ان کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ نتیجے پر پہنچ گئے۔

"اوہ۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "مگر دیکھ لیجئے مروانہ دیجئے گا۔ میں آپ سے دوستی نبھانے کے لئے یہ رسک لینے کو تیار ہوں مگر۔"

"بے فکر رہیے جناب! ایسا پکا انتظام کریں گے کہ ایئرپورٹ سیکیورٹی والے پینٹنگز کو ادھیڑ بھی ڈالیں تو انہیں ہیروئن کی پڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔ مہارت سے چھپانا ہمارا ذمہ اور ہاں وطن واپسی پر آمدنی میں سے اپنا کمیشن لینا نہ بھولیے گا۔"

"مجھے کمیشن سے دلچسپی نہیں۔ جس "چیز" سے دلچسپی تھی اس کی آتے ہی ڈیمانڈ کر دی تھی۔"

لیلیٰ نے کچھ سوچ کر سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کی خاطر کیا ہم "اتنا" سا کام بھی نہ کریں۔ آپ امریکہ سے واپس آ جائیں پھر کسی دن اپنا "حساب" بے باق کر لیجئے گا۔ آپ سے دوستی بھی ہے، رازداری بھی۔ پھر آپ کی خواہش کیونکر ادھوری رہے۔ میں نے اس لڑکی کو نشے کی عادی بنا کر اس حد تک کھوکھلا کر دیا ہے کہ اب وہ ایک پڑیا کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جائے گی۔"

"یوں تو مجھے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ارشین کی بہن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اسے پامال کرکے گویا میں ارشین سے انتقام لوں گا۔ میں اس عورت کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں۔ اسے بتا دینا چاہتا ہوں کہ پروفیسر دانیال کو ٹھکرانے اور دھوکا دینے والوں کا کیا انجام ہوا کرتا ہے۔"

ان کی آنکھوں میں انگارے سلگ رہے تھے۔ لیلیٰ شاہ کو ان کے جذبات دلی تسکین بخش رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنے حریف سے عبرتناک انتقام لینے کی قائل تھی۔

"آپ کا "سامان" وصول کون کرے گا۔" معاً انہیں خیال آیا۔

"بے فکر رہیں۔ جیسے ہی آپ نیویارک ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ دو آدمی آپ کو ریسیو کرنے آ جائیں گے۔ آپ ان کے ساتھ گاڑی میں ان کے گھر تک جائیں گے۔ وہاں فقط ایک گھنٹہ انتظار کرنا ہوگا۔ وہ "سامان" نکال کر دوبارہ پینٹنگز کے فریم جوڑ کر پیک کر دیں گے اور آپ کو مطلوبہ جگہ پر ڈراپ کر دیں گے۔"

☆☆☆☆☆

نازش مہوش کو سلانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو پروفیسر دانیال کو بستر پر دراز کسی سوچ میں گم پایا۔

"کیا "رپورٹ" ہے ادھر کی؟"

معاان کی مخصوص طنز و بیگانگی میں ڈوبی آواز ابھری۔ بہت مدت بعد انہوں نے از خود اسے مخاطب کیا تھا۔ وگرنہ بہت ضروری بات پر بادل نخواستہ ہاں ناں میں جواب دیتے تھے اور وہ بھی زہر میں بجھے ہوئے انداز میں۔ وہ نجی کی جسمانی و ذہنی کیفیت کے پیش نظر ایمرجنسی میں دو ماہ قبل اسے کراچی سے واپس اسلام آباد تو لے آئے تھے مگر سلوک ایسا ہی تھا جیسے انتہائی ناپسندیدہ اجنبی شخص کو مجبوراً گھر میں رکھا جائے۔ نازش کی ہر طرح کی دل داری' معافی تلافی اور عاجزی و انکساری بھی ان کی بے حسی و بے گانگی کی دیوار میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ وہ یوں اجنبی بنے فاصلوں پر رہتے گویا کبھی تعلق واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ان کے انداز اور لب و لہجے کی یہ بے مہری و لاتعلقی نازش کے شیشہ سے دل کو چور چور کر دیتی مگر وہ یہ سب سہنے پر مجبور تھی۔

مہران کے بار بار جھلانے اور تلملانے کے باوجود اس کے پاس ایک ہی ٹھنڈا میٹھا اور سیدھا سادا جواب و جواز ہوتا تھا۔

"وہ نہ سہی' میں تو انہیں چاہتی ہوں۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ جو لوگ زندگی کے لیے لازم و ملزوم ہوں' ان کو اپنا بنانے اور اپنے سے قریب رکھنے کے لیے انسان ان کے ہر طرح کے نخرے اور ستم اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے دیے ہوئے زخم پھول کی طرح دامن میں بھر لینا چاہتا ہے۔ مجھے ان کی ذات کی ہر شے عزیز ہے۔ ایک ایک ادا' ایک ایک انداز' غصہ' پیار' نرمی' سختی' ظلم یا کرم۔ جو دیں دل سے قبول ہے۔"

بندہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جائے تو اسی طرح خوار ہوتا ہے۔ رلتا اور تڑپتا ہے اور کوشش کے باوجود اس نازش بھی ایسی ہی "قلبی مجبوری" کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔

"کدھر کی رپورٹ؟ میں سمجھی نہیں۔" وہ نائٹ بلب جلا کر اپنی جگہ پر آ کر تعجب سے ان کی سمت دیکھنے لگی۔

"جہاں کل رات بتا کر آئی ہو۔ ان ہی تمہارے ہمدردوں کے گھر کی رپورٹ۔" وہ ترشی سے گویا تھے۔

"اوہ۔" اس نے گہری سانس لی اور جیسے اپنے آپ کو جواب دینے کے لیے تیار کیا۔

"نجی ارشین کو بہو تسلیم کرنے پر راضی ہو گئی ہیں۔"

پروفیسر دانیال کو شاک پہنچا۔ وہ نجی کی جانب سے اس درجے لچک کی امید نہیں کر رہے

تھے۔

"مگر۔" وہ رکی۔

"مگر کیا؟" پروفیسر دانیال کو یہ توقف ناگوار گزرا۔

"مگر اب مہران اسے گھر لانے اور بیوی کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہے۔" پروفیسر کے قلب میں مسرت کی لہریں گردش کرتی محسوس ہوئیں۔

"کیوں؟" بظاہر وہ سرسری انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"خدا جانے کیا وجہ ہے۔" وہ ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ "اس کے دماغ کی رو جیسے ایکدم الٹ گئی ہے۔ نجی کے بے حد سمجھانے بجھانے کے باوجود اپنی ضد پر قائم ہے۔ وہ ارشین کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ گویا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔" وہ دل ہی دل میں شاد و کامران ہو کر سوچ رہے تھے۔

"امریکہ کا چکر لگا آئیں۔ تب تک "منظر نامہ" مزید صاف ہو جائے گا۔ پھر نئی حکمت عملی کا آغاز کریں گے۔ ایس پی سے چھین کر بس ایک بار اپنے کھونٹے سے باندھ کر اس کا غرور توڑ دوں پھر عمر بھر کے لیے شانتی مل جائے گی۔" اس رات انہیں خوب اچھی طرح ٹوٹ کر نیند آئی۔

☆☆☆☆☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ سختی' دھمکی' خفگی' پیار' محبت۔ ہر حربہ آپنا دیکھا مگر وہ مان کر نہ دیا۔

"نجی! میں آپ سے بدتمیزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کی حکم عدولی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے مگر فقط اس معاملے میں مجھے معاف کر دیں۔ آپ جان مانگ لیں یا جان سے پیاری چیز طلب کر لیں۔ کہیں تو میں عمر بھر آپ کو اپنی شکل نہ دکھاؤں۔ یہ جگہ' یہ ملک' بلکہ یہ براعظم چھوڑ دوں۔ جو سزا تجویز کریں گی' قبول کر لوں گا مگر فقط اس معاملے میں مجبور نہ کریں۔ میں اس عورت کو گھر میں نہیں بسا سکتا۔ یہ میری آن اور مردانگی کا مسئلہ ہے۔ میں کیسے اپنی غیرت و حمیت اور خودداری کو کچل دوں۔ کس طرح بے غیرتی کا لبادہ اوڑھ کر بے حس ہو جاؤں۔ دل پر پتھر رکھ کر میں آپ کی بات مانتے ہوئے اسے کاغذات نہیں بھجوائے مگر اس سے میرے احساسات پر کیا

فرق پڑتا ہے۔ میرے لیے اس بندھن کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔"

"نینی! روٹیاں بنا دوں یا بھائی جان کے آنے تک انتظار کروں۔" ناظر نے لاؤنج میں آ کر پوچھا۔ جہاں وہ اداس صورت لیے صوفے پر بیٹھی گہری سوچ میں غلطاں تھیں۔

"آپ کو بخار ہے۔ بس کرو کچن کا کام۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ سفیان بازار سے نان لے آئے گا۔" انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ ناظر کو کل سے بخار اور فلو تھا۔

"میں بنا لوں گا نینی۔" اس نے کمزور سے لہجے میں اصرار کیا۔

"بالکل نہیں۔ چلو آپ چل کر لیٹو اور ہاں یخنی پینا نہیں بھولنا۔ میں نے آپ کے لیے بنا کر فریج میں رکھ دی تھی۔"

"شکریہ نینی۔" وہ جذبہ تشکر لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"سفیان! بیٹے! بازار سے نان لے آؤ۔ ناظر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اٹھ کر کچن میں گھس گیا اور سبزی بنا دی۔ میں منع کرتی رہ گئی۔ آج تو یوں بھی سبزی نہیں بنانی تھی۔ میں نے چکن قورمہ بنا لیا تھا۔ دوپہر کے بنے ہوئے کچھ چاول بھی فریج میں رکھے ہیں۔ گرمیوں میں زیادہ ڈشز دیکھ کر دل اوب جاتا ہے۔"

سفیان ابھی ابھی سیڑھیاں اترا تھا۔

"میں لے آتا ہوں نینی۔" وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

اسی دم مہران بھی آ گیا۔ آفس سے تو سر شام ہی آ گیا تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے داور کے بلاوے پر اس کے ہمراہ اسپورٹس کمپلیکس میں لگنے والی صنعتی نمائش کا چکر لگانے نکلا تھا۔ داور کو رپورٹ تیار کرنا تھی اور مہران گھر کے گم صم ماحول کے تاثر سے آزاد ہونے کے لیے چل دیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے نینی؟" وہ اخلاقاً انہیں کمپنی دینے کے لیے صوفے پر ان کے پاس بیٹھ گیا اور ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر چینل بدلنے لگا۔

لاشعوری طور پر وہ ان سے اس "خاص" موضوع پر بات کرنے سے کترا رہا تھا۔

"میں سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں آپ کو اپنے نام کا مطلب معلوم ہے یا نہیں۔" انہوں نے جیسے پینترا بدل کر اپنی دلچسپی کے موضوع کا آغاز کیا۔

"مہران کا مطلب ہے مہر و محبت کا دریا۔ میں نے لغت میں پڑھا تھا۔" اس نے جواب تو

دے دیا تاہم اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ (یقیناً یہ اسی موضوع پر بات کرنے والی ہیں۔ گھیر گھار کر اس لائن پہ لانے کا ارادہ کر رہی ہیں۔) وہ چوکنا ہو گیا۔

"سندھ کے لوگ دریائے سندھ کو مہران کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مہران ایک شہزادے کا نام تھا جس نے اس دیس پر برسوں تک راج کیا۔ اور آج تک کوئی اس راجہ جیسا رحم دل، ہمدرد، پیار کرنے والا اور مہربان حکمران نہیں گزرا۔ وہ شہزادہ بے تحاشا خوبصورت اور حسین تھا۔ اس کا ایک ایک نقش بولتا تھا۔ گال شفق رنگ اور تمتماتے ہوئے، آنکھیں ہیروں کی طرح دمکتی ہوئی اور بال سیاہ چمک دار کالی رات ایسے۔ وہ اتنا شاندار، باوقار اور دلکش تھا کہ شاعر اس کے لاثانی حسن و جمال کی توصیف میں لفظوں کی قلت کی شکایت کرتے تھے۔"

"بھائی جان کا نام کس نے تجویز کیا تھا نینی۔"

سفیان روٹیاں لے کر آ گیا تھا۔ وہ بھی قدرے متحیر کا سا ہو کر ان کے پاس بیٹھ کر انہماک سے بات سننے لگا۔

"یہ بھی ہو بہو اس شہزادے جیسے ہیں۔" اس نے تحسین آمیز نظروں سے اپنے بھائی کے سحر انگیز سراپے کا جائزہ لیا۔

"ان کا نام میں نے تجویز کیا تھا اور بھائی صاحب نے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا۔ مگر ابھی میری داستان مکمل نہیں ہوئی۔ آگے بھی تو سنو۔"

"بزرگ کہتے ہیں۔ شہزادہ مہران ہمیشہ سے ہمدرد و مہربان نہیں تھا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں وہ بہت خود سر، مغرور اور سرکش ہوا کرتا تھا۔ جوانی اور اقتدار کے نشے، حسن و جمال کے زعم اور طاقت کے گھمنڈ نے اسے ایک جابر اور ظالم حکمران بنا دیا تھا اس کی رعایا اس کے ظلم و ستم اور قہر و غضب سے پناہ مانگتی تھی ایک بار وہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ شکار کرنے گیا۔ اس نے ایک بہت خوبصورت ہرن کا شکار کیا۔ جب وہ آخری سانسیں لیتے ہرن کے پاس پہنچ کر اس کے گلے پر خنجر پھیرنے لگا تو اس نے زندگی سے مایوس ہوتے ہرن کی آنکھوں میں موت کے سائے رقصاں دیکھے۔ یکلخت اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ وہ سوچنے لگا جس طرح یہ ہرن مرنے کے قریب ہے اسی طرح ایک دن میری بھی باری آئے گی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے اور دائمی زندگی پانے کے لیے آب حیات کے چشمے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بالآخر ایک دن اس نے وہ جگہ ڈھونڈ لی۔

"تو پھر کیا شہزادے نے آب حیات پی لیا؟" سفیان نے تجسس کے عالم میں دریافت کیا۔

نجی کے انداز کلام میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ خود مہران بھی ان کے لہجے کے زیر و بم میں ڈوب گیا تھا۔

"جب وہ چشمے پر پہنچا تو اس نے ایک بے حد خوبصورت سنہری مچھلی کو پانی میں تیرتے دیکھا۔ یہ مچھلی آب حیات پینے کی وجہ سے ہزاروں سالوں سے زندہ تھی۔ وہ شہزادے کی آمد کا مقصد جان گئی تھی۔ اس نے اسے مخاطب کیا اور سمجھایا کہ برے اور ظالمانہ کام کرتے ہوئے طویل اور نہ ختم ہونے والی زندگی گزارنا بذات خود دنیا و آخرت کی خواری ہے۔ اگر تم ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو اور اپنا نام امر کرنا چاہتے ہو تو کچھ ایسے کام کر جاؤ جس کی بدولت خلق خدا تمہیں رہتی دنیا تک یاد رکھے۔ اگر تم مخلوق خدا کے ساتھ رحم و انصاف سے پیش آؤ گے ان کے دکھ درد میں کام آؤ گے ان کے حقوق کا خیال رکھو گے اور انہیں ہر طرح سے خوش و خرم رکھو گے تو خود بخود تمہاری ذات امر ہو جائے گی۔ تمہاری نیکیاں صدیوں تک لوگوں کو تمہاری یاد دلاتی رہیں گی اور مثال بن کر دوسروں کے سامنے رہیں گی۔ ایسے میں تمہیں آب حیات پینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"کیا عالم فاضل مچھلی تھی۔" سفیان کی رگ شرارت پھڑکی۔

"پھر آگے کیا ہوا نجی؟" مہران نے اسے گھور کر نجی سے دریافت کیا۔

"شہزادہ مچھلی کی نصیحت آموز باتیں سن کر آبدیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پشیمانی اور ندامت کے آنسو تھے۔ پھر وہ ایک نئے عزم سے اپنے دیس میں واپس لوٹا اور اپنی رعایا کی بھلائی کے کاموں میں اپنے آپ کو غرق کر لیا۔ حتیٰ کہ اس کا علاقہ خوشی و خوشحالی اور امن و امان کا مثالی نمونہ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ مرا تو ہر طرف سے لوگ اس کا سوگ منانے کے لئے جمع ہو گئے۔ وہ ایسے ہر دلعزیز اور مہربان حکمران کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ سوچ بچار کے بعد انہوں نے سندھ کے دریا کو اس کے نام سے موسوم کر دیا۔ تاکہ جب تک یہ دریا بہتا رہے شہزادہ مہران کا نام زندہ رہے۔"

انہوں نے اپنی بات ختم کی تو دونوں بھائی اس سحر سے نکلے۔

سفیان معنی خیز نظروں سے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ مہران کوئی تاثر دیئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے کھانا کھاتے ہیں۔ بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

"پھر تم نے کیا سوچا؟" نجی نے پر امید نظروں سے اسے ٹٹولا۔

"میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ بلاوجہ جبر و زیادتی کی فضا قائم نہیں کی۔ نہ کسی کا حق غصب کیا ہے کہ پشیمانی کے ردعمل کے طور پر اپنا فیصلہ بدل لوں۔ ظلم تو مجھ پر ہوا ہے۔ کاش میں آپ کو سمجھا سکوں۔ نجی! جب کوئی شخص آزادی سے اپنا آپ استعمال کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کے اندر ایک عظیم توڑ پھوڑ ہوتی ہے۔ وہ اپنے اوپر دیوار کی مانند ٹوٹ کے گرتا ہے گویا۔ میں اس اذیت سے گزرا ہوں اس لئے میں ہی اس دورانیئے کی گھٹن آلود بے بسی کو محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ اس مستقل کسک کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔" وہ ڈائننگ روم میں داخل ہو گیا۔

نجی۔ سفیان کے مشورے پر داور سے رابطہ کیا تھا۔ "بیٹے! آپ ہی کچھ کہہ دیکھو۔ شاید آپ کی زبان کی تاثیر سے وہ اپنی ضد سے باز آ جائے۔ حاصل نہ وصول۔ محض انتقامی رو میں اتنے سارے لوگوں کو عذاب میں ڈال دیا ہے۔

"ٹھیک ہے نجی! میں شام کو گھر آ کر اس سے بات کروں گا۔"

داور حسب وعدہ پہنچ گیا۔ وہ سیدھا مہران کے کمرے میں گیا تھا۔ تادیر اس سے محو گفتگو رہا۔

مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

مہران اس کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

اس کا اپنا ذہنی فریم ورک تھا۔ وہ اسی حساب سے لائحہ عمل تیار کرتا تھا۔ داور تھک کر باہر آ گیا اور سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب سفیان اندر داخل ہوا۔

"مجھے اس خوش نصیب کا نام جاننے کا ازحد تجسس ہو رہا ہے جس نے آپ جیسے انسان کو اپنے خیالوں کی ڈور سے باندھ دیا ہے۔" سفیان نے بہت سلیقے اور سبھاؤ سے شرارت کا آغاز کیا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ برخوردار۔" داور بدستور اپنی سوچوں میں مگن تھا۔ "انسان حقیقت پسندی سے کام لینا کب سیکھے گا؟ فیملسٹ یا انتہا پرست بن کر ہم کب تک اپنی اولادوں کی زندگیاں دوزخ بناتے رہیں گے یہ تو سراسر آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ کہ شدت مثبت میں منفی میں دونوں نقصان دہ ہیں۔"

وہ جیسے کسی عظیم سوچ بچار کر رہا تھا۔ آفاقی نوعیت کی۔

"طلاق ہونے کے بعد گھر بس جاتے ہیں۔ بیوہ یا رنڈاوکو حیات کا دوسرا ساتھی مل جاتا ہے۔ دل ایک جگہ سے اجڑ کر دوسرے کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ رانجھے، مجنوں اور ہیریں لیلائیں بدل جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسی فطری و حقیقی سچائی ہے جو ہزار بار جھٹلانے کے باوجود اپنی جگہ موجود محسوس کی جا سکتی ہے۔ تمہارا بھائی خدا جانے کن بھول بھلیوں میں گم ہو گیا ہے۔

یہ دوسری شادی کا ارادہ نہ صرف ارادہ بلکہ ضد اور پختہ عزم۔ میری عقل جواب دے گئی یار! کچھ تم ہی "اصل" سے پردہ ہٹاؤ۔"

سفیان۔ ارشین کی زبان سے سنی داستان کا ایک ایک لفظ دہرایا۔ داور کی میٹھی طبیعت میں کچھ تھا کہ اگلا بندہ بن پوچھے حال دل اگل دیتا تھا۔

"کاش آپ اسی وقت آگاہ کر دیتے جب شادی کی خبر آپ کے علم میں آئی تھی۔" سفیان نے تاسف سے کہا۔ داور آہستگی سے مسکرا دیا۔ پھر گویا ہوا۔

منیراب مان بھی لے آ مقدر کی حقیقت کو
جو ہے وہ بھی ضروری ہے، جو گزرا وہ بھی ضروری تھا

ہر چیز، ہر سانحہ اپنے وقت پر ہوتا ہے، ہمارے تمہارے واقف حال ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

"کیا بھائی جان نہیں مانے؟" سفیان پر مایوسی حاوی ہونے لگی۔

"اس کے ذہن میں جو گرہ پڑ گئی ہے اسے کھولنا ہمارے تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اس کی طبیعت سے واقف ہوں۔ میرا خیال ہے، خدا کے سوا اب کوئی طاقت سے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔" داور نے یقینی سے کہا۔

سفیان ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆

"سر! سب انسپکٹر درنایاب آئی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں، آپ نے بلوایا تھا۔" سپاہی نے سلیوٹ مارنے کے بعد مودبانہ اطلاع دی۔

"ہاں، بھیج دو اندر۔" مہران نے قلم ہولڈر میں لٹکانے کے بعد فائل اپنے آگے سے کھسکا

دی۔

"سر! مے آئی کم ان۔" وہی گھبرائی دکھلائی اعتماد سے محروم آواز کان میں پڑی تھی۔

مہران نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر بے نیازی سے دروازے کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

درنایاب اس کے اشارے پر مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بڑے دنوں کی "خاموشی" کے بعد بلاوا آیا تھا۔ اب پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ منتظر تھی۔

"لئیق احمد صاحب کس وقت گھر پر ہوتے ہیں؟" وہ کافی دیر تک پیپر ویٹ گھمانے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔

"جی؟" ایک لمحے کو وہ عادت کے مطابق گھبرائی۔

"جی چونکہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اس لئے گھر پر ہی ہوتے ہیں۔"

"اوکے، میری والدہ اور بہن کچھ روز میں ان سے ملنے آپ کے گھر آئیں گی۔ انہیں مطلع کر دیجئے گا۔"

وہ عام سے انداز میں بولا۔

"ان سے ملنے؟" درنایاب کی بڑی بڑی سحر کار آنکھوں میں پہلے تحیر اور پھر شرم کے ڈورے تیرنے لگے۔ اس کی گھنی پلکیں شعلہ فشاں رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

"اپنا فون نمبر لکھ دیں۔ تاکہ آمد سے پہلے آپ کو اطلاع کر دی جائے۔" درنایاب دھیرے دھیرے بوجھل قدموں سے باہر نکل گئی۔

"اس کا ساتھ زندگی کا حاصل محسوس ہوتا ہے مگر یہ اتنا سخت "دل" بے نیاز اور پتھر صفت دکھائی دیتا ہے کہ دل اس کی ہمراہی کے خوف سے بہت نیچے کسی گہرائی میں ڈوبنے لگتا ہے۔"

اسے اپنی بے تکلف دوست عروسہ کی کہی ہوئی بات یاد آ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

"نہیں! میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا ہے۔ اب زبان دے کر پیچھے ہٹنا مجھے گوارا نہیں۔"

مہران نے ناشتے کی میز پر ترشی سے گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ بحال کیا۔

"آپ بس مجھے یہ بتائیے آپ اور نازش کب لئیق صاحب کے گھر چل رہی ہیں۔ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

"مہران بیٹے! کچھ تو سوچو تم۔" نمی بے بسی سے اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ "ارشین میں کس شے کی کمی ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ خشک انداز میں گویا ہوا۔ "میں یہاں ان محترمہ کی شخصیت کی کمی بیشی تولنے نہیں بیٹھا۔ آپ صرف اتنا بتایئے آپ درنایاب کے والد سے کب مل رہی ہیں۔"

سفیان کو بڑے بھائی کا لہجہ بہت گراں گزرا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا مہران کا لب و لہجہ' انداز اور تیور تلخ سے تلخ تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کمپرومائز کرنا' دوسرے کی بات پر ہمدردانہ غور کرنا اور مقابل کے احساسات کا خیال رکھنا بھول چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ نمی کے جذبات و احساسات اور شخصیت کا احترام قطعی فراموش کر بیٹھا تھا۔ اسے شاید خود بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ ان سے کس لب و لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

سفیان نمی کے اندر برپا ہونے والے بھونچال کا اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ کمال ضبط سے اپنے جذباتی اتار چڑھاؤ کو روکے ہوئے تھیں۔ مگر ان کے پھیکے پڑتے چہرے سے ان کے دل کا حال عیاں تھا۔

"دیکھیے نمی! میں اس مسلسل کشمکش سے تنگ آ چکا ہوں۔ اب سکون اور ٹھہراؤ چاہتا ہوں۔ میں آپ کو صاف لفظوں میں بتا رہا ہوں کہ میں اپنی فیملی لائف بنانا چاہتا ہوں۔ خود کو سیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میں آپ کو اپنی رائٹ چوائس بھی بتا چکا ہوں۔ اب اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ ہاں اگر آپ کی طرف سے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر میرا دوسرا آپشن بھی سن لیجئے۔ ایسی صورت میں' میں یہ ملک چھوڑ دوں گا اور ہمیشہ کے لئے انگلینڈ شفٹ ہو جاؤں گا۔ بس میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں اس سے زیادہ خود پر جبر نہیں کر سکتا۔ میں اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں کب تک آپ لوگوں کی ڈگڈگی پر ناچتا رہوں گا۔ پہلے نازش کے کہنے پر میں نے خود سے زبردستی کی۔ اب آپ کی خواہش پر خود سے دوسری زیادتی کروں۔ کیوں' میری زندگی پر میرا اپنا بھی کچھ حق ہے۔"

اس کی آواز بلند' بے رحم اور کسی قسم کے جذبات و احساسات سے عاری ہو گئی تھی۔

نمی صدمے کی سی کیفیت میں اس کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

"میرا تمہارے ساتھ زور زبردستی والا رشتہ نہیں ہے۔ میں اپنا مقام پہچانتی ہوں بیٹے! وہ تو

بس ایک ماں کا مان تھا جس کے ناطے تم سے اصرار کر رہی تھی۔ لیکن اگر تم چاہتے تو میں دوبارہ نہیں کہوں گی۔ میں تم پر ظلم یا جبر نہیں کرنا چاہتی' نہ اس کا حق رکھتی ہوں۔ ٹھیک ہے جو تم کہو گے وہی ہوگا۔ میں تمہاری رضا میں راضی ہوں۔"

وہ ٹیبل سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سفیان! تم نازش کا نمبر ملاؤ' میں اس سے آج مصروفیات پوچھتی ہوں۔ اگر وہ فارغ ہوئی تو ہم آج شام درنایاب کی طرف چلے جائیں گے اور اب خالی اقرار نہیں تاریخ لے کر ہی واپس آئیں گے۔"

ان کا انداز حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

سفیان نے بے چینی سے ان کی صورت دیکھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر مہران پر نظر ڈال کر لب بھینچ لئے۔

مہران بڑے اطمینان سے اخبار کی سرخیوں میں گم تھا۔

بے حس' خود پرست' شقی۔

سفیان پہلی مرتبہ اپنے دل کو بھائی کے خلاف ذہن میں جاگنے والی بدگمانی اور نفرت سے نہ بچا سکا۔

نمی کے چہرے پر اترتا ہوا احساس شکست اور ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیاں چھپائے نہیں چھپ رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

کوئی ابر اڑے کسی قلزم سے
رس برسے میرے ویرانے پر
کوئی کڑھتا ہو' کوئی جلتا ہوں
میرے دیر سے واپس آنے پر
کوئی بیٹھے میرے پہلو میں
کوئی ہاتھ دھرے میرے شانے پر
کوئی دبے دبے لہجے میں کہے

تم نے اب تک بڑے درد سے
چلو تنہا چلنا کھیل نہیں
چلو ساتھ تمہارے چلتے ہیں

سعد ایک مدت بعد پلٹ کر واپس اسلام آباد آیا تھا۔

رقیہ بیگم اور راشد صاحب نے اول اول ناراضگی و برہمی دکھائی۔ مگر کب تک۔

آخر کو والدین تھے پگھل ہی گئے۔

اور جب پگھل گئے تو گویا سارے گلے شکوے بھی دھل گئے۔ نازو نے البتہ جی بھر کر خفگی بھرا موڈ دکھایا۔ بڑی دقتوں سے منا کر دی۔

سب کچھ ہو گیا۔

سارے معاملات طے ہو گئے۔

مگر اک دل تھا کہ جس کی خانہ ویرانی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ بخاری لاج نہیں گیا تھا۔ ظاہر ہے اب رشتہ ٹوٹنے کے بعد جانے کی کوئی تک بھی نہیں تھی۔

مگر وہ جب بھی ادھر نگاہ دوڑاتا' گزرے ہوئے ایام کا ایک ایک نقش نظروں میں پھر جاتا۔

اس ستم گر کی صورت اس کی باتیں اس کا انداز اس سے ملنے ملانے کے سارے مناظر تصور کے پردے پر تھرک تھرک جاتے۔ وہ یاد کے نقوش کو جتنا مٹاتا وہ اتنی ہی قوت سے پھر ابھر جاتے۔

"وہ اب پرائی ہو چکی ہے۔ نہ کبھی میری تھی' نہ ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ پھر یہ جنون' یہ سودا' یہ خود فراموشی آخر کب تک؟" وہ بار بار خود کو سمجھا کر تھک چکا تھا۔

مگر دل برباد سمجھنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

نازو صبح بھی سر کھپا کر گئی تھی۔

"بھئی ٹھیک ہے' امبرین تمہیں ناپسند تھی۔ چلو معاملہ ختم ہوا مگر دنیا میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں۔ اب کیا جو لوگ بجوگ کے چکر چلاؤ گے تم؟ میں گھر میں بھابھی لانے کے شوق میں مری جا رہی ہوں اور موصوف اکلوتے پن کا فائدہ اٹھا کر میرا صبر آزما رہے ہیں۔"

وہ ایک مبہم مسکراہٹ میں جواب ڈھالتا انجان بنا رہا۔

وہ کیسے سمجھا پاتا۔

کہ ہر صحرا کی پیاس مختلف ہوا کرتی ہے

جیسے ریت کے صحرا کی پیاس بارش سے مٹتی ہے۔

ہجر کے صحرا کی پیاس دید سے بجھتی ہے۔

اسی طرح دل کے صحرا کی پیاس جذبوں سے بجھتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہم وہ بے درد لوگ ہیں' خواب گنوا کر بھی جنہیں نیند آ جاتی ہے۔

سوچ سوچ کر بھی جن کے ذہنوں کو کچھ نہیں ہوتا۔

ٹوٹ پھوٹ کر بھی جن کے دل دھڑکنا بھول جاتے ہیں۔

ٹوٹ کر رونے کی کوشش میں جو بات بے بات مسکراتے ہیں۔

شام سے پہلے مر جانے کی خواہش میں جو جیتے ہیں اور جیتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سو وہی مثال ارشین کی تھی۔

طبیعت بحال ہوتے ہی اس نے سوشل ڈائجسٹ کے جمیل صاحب کا سب آفس جوائن کر لیا تھا۔ آنے جانے کا انتظام حاکو بابا کے تانگے کے ذریعے ممکن ہوا تھا۔

وہ کام میں گم ہو کر اپنے تکلیف دہ حال کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گو نگی بوا حتی الامکان اس کا خیال رکھنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس دن مہران کا ہاتھ روکنے کے بعد سے ان کے اندر عجیب سی توانائی دوڑنے لگی تھی۔ وہ جیسے اب ارشین کی محافظ بن گئی تھیں۔ اکثر بساط بھر دلجوئی کرتیں۔

خالہ برکتے نے بڑے دنوں بعد چکر لگایا تھا۔

"اللہ رکھے لاڈو کی تاریخ طے کر دی ہے بیٹی! تمہیں رسمی دعوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر سے تمہاری اپنی بہن ہے اور ہمارے ہاں تو شادی سے آدھا آدھا مہینہ پہلے شادی کی رونقیں جاگ جاتی ہیں۔ بس بتا رہی ہوں' روز شام کو چکر لگانا ہوگا۔" انہوں نے مان سے کہا تھا۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے خالہ!" وہ خوش دلی سے گویا ہوئی۔ "آپ بتائیں کچھ خریداری کرنا ہو' بازار سے کچھ لانا ہو تو میں لے آؤں گی۔ میرا تو روز ہی نکلنا ہوتا ہے۔"

"بیٹی تو جس دن پیدا ہوئی مائیں اسی دن سے اس کے لئے جوڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ اللہ سلامت رکھے اس کے بھائیوں کو۔ امیر دین اور خیر دین دونوں پیسے ملتے ہی بہن کے لئے کچھ نہ کچھ لے لیتے ہیں۔"

"ہاں اکلوتی بھی تو ہے ناں۔"

"پھر بھی تم غیر تھوڑی ہو۔ جو ضرورت ہوئی کہہ دوں گی۔" پھر وہ کچھ ہچکچا کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگیں۔

"بیٹی! برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔"

"جی خالہ!" بظاہر اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا مگر ٹھٹھک سی گئی۔ ان کا انداز سمجھا رہا تھا کہ وہ کیا پوچھنے جا رہی ہیں۔

"تم اتنے عرصے سے یہاں ہو۔ آٹھ نو مہینے کم نہیں ہوتے۔ سارے گاؤں والے تمہیں جانتے ہیں۔ تم یقیناً کسی شریف اور نیک ماں باپ کی اولاد ہو۔ تمہارا چال چلن، اٹھنا بیٹھنا، بول چال، اخلاق سب ہمارے سامنے ہے۔ تم نے جس طرح اپنی عزت بنا کے اور بچا کے رکھی ہوئی ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر بیٹی! زمانے میں رہنے سہنے کے جو قاعدے قانون ہوتے ہیں ان سے ہٹ کر کوئی بات سامنے آئے تو حیران ضرور کرتی ہے۔ تم اکیلی یہاں پڑی ہوئی ہو، محنت مزدوری کر کے کما رہی ہوں۔ نہ کبھی کوئی تمہاری خبر گیری کو آیا، نہ تم گئیں۔ پولیس والا بابو کبھی آئے تو آئے۔ اگر تم اس کی رشتہ دار ہو تو وہ تمہیں یہاں کیوں رکھے ہوئے ہے۔ اپنے ساتھ شہر لے جائے۔ جہاں تم پہلے رہتی تھیں۔ دیکھو بیٹی! میری باتوں کو دل پر مت لینا۔ میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ مجھے یا گاؤں والوں کو تمہارے یہاں رہنے پر اعتراض ہے۔ بھلا ہم کون ہوتے ہیں اس طرح اعتراض کرنے والے۔ اور سچی بات ہے ہمارا حق بھی نہیں بنتا۔ بس جو بات سب کے ذہن میں کھٹک رہی تھی میں نے تمہیں بتا دی۔"

ارشین چند لمحوں کے لئے لب بستہ بیٹھی رہی۔

"میں جانتی ہوں خالہ! کہ یہ سوال کسی روز ضرور کوئی نہ کوئی پوچھے گا۔ میں اس کا جواب بھی دوں گی خالہ مگر کبھی فرصت میں۔"

خالہ کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھی اپنی ہتھیلیوں کو گھورتی رہی۔

"خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھنا لکھا ہے نصیب میں۔"

☆☆☆☆☆

"نجی! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ سفیان بتا رہا ہے آپ نے مہران کی بات طے کر دی ہے درنایاب سے۔"

نازش چند دنوں کے لئے اپنے میکے میں کراچی گئی ہوئی تھی۔ اس دن نجی کے فون کرنے پر نوکرانی نے بتایا تھا اس لئے لامحالہ نجی سفیان کے ہمراہ اکیلے ہی درنایاب کے ہاں چلی گئی تھیں۔

"ہاں بیٹی! تم ادھر نہیں تھیں اور مجھے جلدی تھی اس لئے جا کر نپٹا آئی۔ تم دل میں کوئی خیال نہ کرو۔ اصل مرحلے تو ابھی آگے آنے ہیں۔ تم بہنوں والے سارے مان اور ارمان پورے کرنا۔" وہ زبردستی مسکرائی تھیں۔

نازش نے محسوس کیا، ان کی مسکراہٹ کے پس پردہ شکستگی کی ایک عمیق تہہ پوشیدہ تھی۔

"کیسے مان ارمان نجی! آپ نے مہران کو سمجھایا ہوتا۔ کیا ضرورت تھی اب یہ نیا کھڑاک پالنے کی۔"

"تم مجھ سے زیادہ اس سے قریب ہو۔ تمہاری نہیں سنی تو میری کیا سنتا۔ چھوڑو بیٹے! میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے۔ جب اولاد والدین سے مشورہ طلب کرنے کے بجائے حکم دینے کی پوزیشن میں آ جائے تو والدین کو خواہ مخواہ بحث و تمحیص میں پڑ کر اپنا لحاظ نہیں گنوانا چاہئے۔ جب وہ ٹھان ہی چکا ہے تو پھر میرا ضد میں آ کر فیصلہ رد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں بھی تو حاصل وصول کچھ نہیں ہوگا۔ الٹا تلخیاں مزید بڑھ جائیں گی۔ کیا فائدہ دلوں میں فاصلے بڑھانے اور دوریاں پیدا کرنے کا۔ ٹھیک ہے زندگی اس کی ہے۔ اسے کس کے ساتھ گزارنا چاہئے، اس فیصلے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہونا چاہئے۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔"

نازش ان کی وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی کی قائل ہو گئی۔

"میں نے تم کو اس لئے بلایا تھا کہ آج ناظر سے سٹور روم میں رکھی گئی پیٹی اور دیگر سوٹ کیس کھلوائے ہیں۔ اپنے طور پر میں نے مہران اور سفیان دونوں کی بیویوں کے لئے بری کے کپڑے اور زیور لتا جمع کر رکھا ہے۔ تم ان میں سے دیکھ لو۔ کسی قسم کی کمی بیشی ہو یا نئے ڈیزائن بنوانے ہوں تو بتا دو۔"

"کیا مطلب۔ کیا سفیان کی بھی ساتھ ہی شادی کر رہی ہیں؟" نازش ان کی عجلت پسندی پر چونکی۔

"شادی تو نہیں البتہ نکاح کا ارادہ ہے۔ اچھا ہے نیک کام اب ساتھ نپٹ جائیں۔ میں تو شادی کے لئے بھی تیار تھی مگر سفیان نے خود ہی منع کر دیا۔ اس کی نئی نئی جاب شروع ہوئی ہے۔ وہ چاہتا ہے سیٹل ہونے کے بعد دلہن کو گھر لائے۔ سال چھ ماہ رخصتی ہو جائے گی۔ میں نے فاریہ کی والدہ سے سرسری انداز میں فون پر نکاح کا پروگرام ڈسکس کیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ پرخیال انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

نازش نے بظاہر سر ہلا کر تائید کی مگر وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔

"نینی! اگر آپ کہیں تو میں ایک کوشش اور کر دیکھوں۔" کافی دیر بعد ان سے مخاطب ہوئی۔

"کیسی کوشش!" وہ اچنبھے سے بولیں۔

"مہران کو سمجھانے کی۔"

"چھوڑو بیٹے! میں نے کہا ناں۔ اب اس موضوع پر بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ کیوں اپنا مان گنواتی ہو۔"

"کیا آپ نے ورنایاب کے والد کو مہران کی پہلی شادی کے متعلق بتا دیا ہے؟" نازش فکرمندی سے گویا ہوئی۔ "نہیں۔ مہران کہہ رہا تھا۔ میں شادی کے بعد خود ورنایاب کو اعتماد میں لے کر پوری بات بتا دوں گا۔ فی الحال اس تذکرے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بعد میں معاملہ کھلا تو سو مسئلے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔"

نازش نے سوچتی ہوئی نظروں سے نینی کی طرف دیکھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹے!" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ تو مہران کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ اگر اس نے منع کیا ہے تو کچھ سوچ کے ہی کیا ہوگا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ ناظر سوٹ کیس وغیرہ کھول چکا ہوگا۔"

نازش نے بے دلی سے قدم آگے بڑھائے تھے۔

☆☆☆☆☆

"او کمینی ذلیل۔ اب جا کے پھوٹی مری ہے گھنٹہ بھر بکواس کرنے کے بعد۔" عروسہ فون پر چیخ رہی تھی۔

"اُفوہ چلاؤ مت۔ بتا تو رہی ہوں ناں۔"

"دو ہفتے بعد نجیب کراچی سے آ رہے ہیں اور آتے ہی واپس دبئی جانے کا پروگرام ہے۔ مجھے غصہ اس لئے آ رہا ہے کہ تیری شادی کی ڈیٹ بھی دو ہفتے بعد کی ہے۔"

"ہاں تو کیا ہے۔ مزید ایک ہفتہ یہاں قیام کر لینا۔" وہ اس کا چیخنا چلانا نظرانداز کرتے ہوئے آرام سے بولی۔

"چھ ماہ سے میں پاکستان میں تھی جب نہیں رچا سکتی تھی اپنا بیاہ" وہ سخت خفا تھی۔

"میں ڈھنگ سے انجوائے تو کرتی۔"

"اچھا چھوڑ ان بے کار باتوں کو۔ بابا جان نے تمہیں تاکید سے بلایا ہے۔ بھئی اب میں اکیلی بازاروں میں اپنی شادی کی شاپنگ کرتی اچھی لگوں گی کیا؟ بابا جان سیدھے سادے آدمی ہیں۔ انہیں ان کاموں سے کیا مطلب۔ بھیا بھابھی بھی کویت میں ہیں۔ انہیں اطلاع دے دی ہے۔ شادی سے تین دن پہلے بمشکل ان کے ٹکٹ کنفرم ہوئے ہیں۔ تم ہی نے کرنا ہے اب جو کرنا ہے۔"

"اچھا بابا' حاضر ہیں ہم حکم کے غلام۔" اس نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

داور کو کسی کام کے سلسلے میں ہنگامی طور پر سوشل ڈائجسٹ کے نارووال کے سب آفس جانا پڑا تھا۔ وہ اس میگزین کا انتظامی ایڈیٹر تھا پھر اسی ناطے دیگر شہروں میں بنے ہوئے دفاتر کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ میگزین نکالنا اس کا شوق تھا۔ دو ڈھائی سال پہلے اس نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ اخبار میں کرائم رپورٹر کی جاب کے ساتھ ساتھ ذاتی میگزین کا اجراء اور اس کی باقاعدہ اشاعت نے زندگی کو اتنا مصروف کر دیا تھا کہ ماضی کے زخم کریدنے اور یاد رفتگان کی اذیت سے گزرنے کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ جمیل صاحب حسب معمول اس کی آمد کے ساتھ ہی مستعد ہو گئے تھے۔ دفتر کے عقب میں ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ داور رہائش کے لئے وہیں ٹھہرتا تھا۔

"کیا بات ہے جمیل صاحب! اس مرتبہ میٹرا تنا لیٹ ہو گیا۔ سر! اس طرح تو کام نہیں چلے

گا۔"

وہ کرسی گھسیٹ کر سامنے رکھی فائلوں کو کھنگال رہا تھا۔

"میٹر بالکل تیار تھا جناب! اصل مسئلہ تصویروں کا تھا۔ کچھ اسکیچز بنانے تھے اور کوئی آرٹسٹ نہیں مل رہا تھا۔ یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ رضوی صاحب کچھ وجوہات کی بنا پر آرٹسٹ کی جاب چھوڑ چکے ہیں۔ ان کی جگہ کوئی معقول بندہ نہیں مل رہا تھا۔ اب جا کر کہیں انتظام ہوا ہے۔ ایک خاتون آرٹسٹ ہیں۔ مس بخاری۔ آپ کو ملواؤں کا ان سے۔"

"بہر حال اب اور زیادہ لیٹ نہیں ہونا چاہئے۔"

"سر! ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ یکم تاریخ تک رسالہ مارکیٹ میں آ جایا کرے مگر کبھی کبھار تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیجئے وہ خاتون آ گئیں۔"

داور نے سرسری انداز میں دیکھا۔

سبز عام سے پرنٹ کا کافی دفعہ کا پہنا ہوا سوٹ۔ پیلاہٹ لئے ہوئے کمزوری کی آئینہ دار رنگت' دبلا پتلا سراپا اور سیاہ آنکھوں میں تیرتی گہری خاموشی۔

بظاہر اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بلکہ سرسری نظر کے بعد دوسری نگاہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر کوئی چیز ضرور تھی جس نے داور کو بغور اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

ارشین کا تو خیر داور سے کسی قسم کا کوئی تعارف یا شناخت کا ذریعہ رہا ہی نہیں تھا کہ وہ چونکتی خود داور کے ذہن میں آشنائی کی کوئی مانوس تصویر نہیں ابھری تھی۔

وہ کرائم رپورٹر تھا' اس لئے ادب و تخلیق کے میدان میں کام کرنے والوں سے اس کا براہ راست واسطہ نہیں رہا تھا۔ دوسرے مصنفین اور آرٹسٹوں کی ذاتی شخصیت عموماً گمنام رہتی ہے۔ پبلک ان کے کام سے انہیں پہچانتی ہے۔ ذاتی حوالے سے بہت کم شناخت ہو پاتی ہے۔ ارشین کی شاید ہی کبھی تصویر اخبار میں آئی ہو۔ اگر کبھی اس کے کام کی نمائش کے حوالے سے چند سطروں کی خبر آئی تو وہ بھی اتنی نمایاں یا اہم نہیں تھی کہ یادداشت میں محفوظ رہتی۔ لہٰذا داور بحیثیت آرٹسٹ کے اس سے متعارف نہیں تھا۔ اور رہی بات ایس پی مہران کی بیوی کے حوالے کی تو وہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ داور کو جس ہنگامی صورت حال میں مہران نے گھر بلوا کر بطور باراتی اپنی شادی

میں شریک کیا تھا اور جس طرح ارشین کی بخاری لاج سے رخصتی ہوئی تھی' اس میں کہیں کوئی ایسا مرحلہ نہیں آیا تھا کہ وہ ارشین کا چہرہ دیکھ پاتا یا براہ راست متعارف ہونے کی رسم ادا کی جاتی۔ داور غائبانہ فقط یہی جانتا تھا کہ مہران کی شادی ایک آرٹسٹ خاتون ارشین سے ہوئی ہے۔

"مس بخاری! یہ ہمارے ادارے کا بنیادی ستون جناب داور صاحب ہیں۔ اس میگزین کو چلانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔" جمیل صاحب نے تعارف کروایا۔

"السلام علیکم۔" ارشین نے رسماً داور کی طرف دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑے کاغذات جمیل صاحب کی طرف کھسکا دیئے۔

"مجھے اب اجازت ہے جمیل صاحب! کام مکمل ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔ آپ کا کوچوان آ گیا؟"

جمیل صاحب نے کھڑکی کے کھلے پردے سے نیچے سڑک پر جھانک کر دیکھا۔ حاکو بابا تانگہ ارشین کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"جی!" ارشین خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

"کوچوان؟" داور نے سوالیہ نظروں سے جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔

"یہ گاؤں سے آتی ہیں سر!"

"گاؤں سے؟ کمال ہے' ٹیلنٹ کہاں کہاں خزانے کی طرح چھپا ہوتا ہے۔" وہ بڑبڑایا پھر گفتگو کا موضوع کسی اور طرف مڑ گیا۔ داور کو مہران کی شادی میں بھی شرکت کرنا تھی۔ تین چار دن بعد وہ واپس اسلام آباد آ گیا۔

☆☆☆☆☆

سن لے او گوری

تو نے چوری چوری

میرا جیا لے لیا

اوا او ہوا او

سٹاپ پر اترتے ہی حسب معمول وہ اوباش لڑکا اس کے پیچھے آ گیا تھا۔

شاہین کا ننھا سا جیا جیسا دل سینے کے پنجرے میں بری طرح پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ اس نے

لرزتی ٹانگوں سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے سر پر لئے ہوئے دوپٹے کو مزید آگے کیا اور پیشانی پر پھوٹنے والے پسینے کو پونچھا۔

"یا اللہ' کس سے کہوں یہ ماجرا۔" وہ بے بسی سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ گزشتہ ایک مہینے سے وہ یہ عذاب اٹھا رہی تھی۔ گھر میں کس سے کہتی۔ ماں تو سنتے ہی حکم جاری کر دیتی۔ "بس ٹھیک ہے' گھر بیٹھو۔ کوئی ضرورت نہیں کالج جانے کی۔ میٹرک بہت ہے۔"

اور باپ اس کے منہ سے لڑکے کا ذکر سن کر ویسے ہی غیرت کے مارے کچھ الٹا سیدھا کر گزرتا۔ وہ اپنے گھر کے ماحول سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ بہنیں زندہ مثال سامنے تھیں۔ میٹرک کا رزلٹ آنے کے بعد بڑی منتوں مرادوں سے اسے کالج میں داخلے کی اجازت ملی تھی۔ آنے جانے کے لئے کالج بس لگوائی تھی۔ بس صبح تو گلی کے موڑ سے لے لیتی تھی' مگر واپسی پر رش زیادہ ہونے کی وجہ سے روٹ بدل جاتا تھا۔ سو اسے دو گلی پیچھے اترنا پڑتا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ اس کے سٹاپ پر اور کوئی لڑکی ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔

سن او بھورے نینوں والی
تیری چال بڑی متوالی
لالالا

وہ ترنگ کے عالم میں ہمراہ چلتا ہوا بدستور گا رہا تھا۔ ساتھ یوں چل رہا تھا کہ دیکھنے والے سمجھتے اکٹھے کہیں سے آ رہے ہیں۔ شاہین یہی سوچ سوچ کر ہولتی رہتی تھی کہ کبھی جو بابا جان نے اسے اس طرح ساتھ چلتے دیکھ لیا تو جان سے مار دیں گے۔ وضاحتیں سننے کے وہ عادی کہاں تھے۔ وہ سطحی نظر کا استعمال کرتے تھے۔ جو دیکھتے اسی کو سچ سمجھتے تھے۔

"سنو' کبھی تو نظر ملا لیا کرو میری جان۔ آئے ہائے۔ بھوری آنکھیں' بھورے بال' سنہری رنگ اور اس پر یہ لچکیلی شاخ کا سا سراپا۔ عاشقاں دے دل لے گئی سینے وچوں کڈ کے۔"

وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا کچھ اور قریب ہو کر چلنے لگا۔

شاہین کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ دیکھیے' میں۔"

"واللہ۔ سرور آپ کا۔ کیا آواز ہے' کیا نغمگی ہے۔ شکر ہے کسی بہانے آپ نے ہمارے کانوں میں رس تو ٹپکایا۔"

وہ عاشقانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میرا نام قیصر ہے۔ آپ کے محلے میں ہی رہتا ہوں۔ جس اسٹاپ پر اترتی ہیں یہاں میرے بڑے بھائی ناصر کی آڈیو ویڈیو کی شاپ ہے۔ میں نے انٹر کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اب بھائی کے ساتھ شاپ پر بیٹھا ہوں۔ لیکن اصل میں میرا پیشہ عاشقی ہے۔ حسینوں ماہ جبینوں کی خاطر سیوا....." وہ ڈھٹائی سے ہنسا اور پھر ایکدم اس کے سامنے آ کر راستہ روک لیا۔ "جان من ایک منٹ کو رک کے آنکھ تو ملاؤ مجھ سے۔" شاہین کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ اسے لگا مارے خوف کے اس کا دل بند ہو جائے گا۔

اسی لمحے ایک بائیک اس کے پیچھے رکی۔ فوجی کٹ بالوں والا ایک لمبا تڑنگا صحت مند لڑکا نیچے اترا۔ وہ وردی میں ملبوس تھا اور کندھوں پر سجے بیج بتاتے تھے کہ وہ لیفٹیننٹ تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا قیصر کے قریب آیا' سو دوسرے لمحے اس کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ خالص فوجی ہاتھوں نے اس نام نہاد عاشق کی وہ درگت بنائی کہ وہ معافیاں مانگتا لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ شاہین اس عرصے میں تھر تھر کانپتی کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔

"ڈونٹ وری شاہین! اب یہ دوبارہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔" اس نوجوان کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی۔ غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ نوجوان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"نہیں پہچانیں۔ میں اظہر ہوں۔ فاریہ کا بھائی۔"

"فاریہ آپی کا بھائی۔" شاہین نے از سر نو اس نوجوان کا جائزہ لیا۔

سنجیدہ صورت پر سجی فطری شوخی سے منور بھرپور آنکھیں' کشادہ پیشانی سے جھلکتی بلند اقبالی اور چہرے کے تاثرات سے نمایاں ہوتی نیک دلی و اخلاص۔ یہ سب عکس اس کے جانے پہچانے تھے۔ ماضی میں بہ مختصر سی مگر گہرا تاثر چھوڑ جانے والی ایک ملاقات گھر کے دروازے پر ہوئی تھی۔

اظہر دلچسپی سے اس کے چہرے پر بکھرتی رنگا رنگ کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"حافظے پر اچھی طرح زور دیں۔ شاباش اور کوشش کیجئے۔ شاید کہیں سے یادداشت کی ردی والی ٹوکری میں سے میرا نام نکل آئے۔"

"شرمندہ نہ کیجئے اظہر بھائی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو چکا ہے کہ آپ فاریہ آپی کے چھوٹے بھائی ہیں۔" شاہین بڑی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس لیے سنبھل کر خوش اخلاقی سے مسکرائی تھی۔

"چلئے اچھی بات ہے۔ آیئے میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔"

وہ ہاتھ سے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

"نہیں۔ نہیں میں چلی جاؤں گی۔" شاہین گھبرا گئی۔

اظہر متعجبانہ۔ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں گو کہ اب ایسا امکان نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے "موصوف" کو پہلا "سبق" اچھی طرح یاد نہ ہوا ہو اور وہ دوبارہ "قسمت آزمائی" کے لئے اگلے موڑ پر آپ کے منتظر ہو گا۔"

اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میں نے کہا ناں میں چلی جاؤں گی اظہر بھائی۔ شاہین اپنی بات پر اڑی رہی۔

"بس اگلی گلی میں تو گھر ہے۔"

"آپ میرے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتیں؟" وہ بغور اس کا چہرہ جانچنے لگا۔ "اسی بہانے میں ارشین آپا سے بھی مل لوں گا۔"

"ارشین آپی!" شاہین نے چونک کر اس کی صورت دیکھی پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔

"آپی اب یہاں نہیں ہوتیں۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"وہ کہاں ہوتی ہیں آج کل۔ کیا شادی وادی ہو گی، ان کی؟"

وہ فطری سادگی سے پوچھ رہا تھا۔ آرمی ٹریننگ اور پھر شہر سے دور پوسٹنگ کی وجہ سے اسے یہاں کے معاملات کی خبر نہیں تھی۔ یوں بھی ارشین کی مہران کے ساتھ شادی سے سوائے فاریہ کے ان کے گھر کا کوئی فرد آگاہ نہیں تھا۔

"ہاں.....!" شاہین نے گہری سانس کھینچی۔ پھر اس نے گھڑی کی دوڑتی بھاگتی ہوئی سوئیوں پر نگاہ ڈالی۔

"مجھے اجازت دیجئے اظہر بھائی۔" وہ عجلت کے عالم میں گویا تھی۔

"مجھے گھر سے دیر ہو رہی ہے۔ آپ کی مدد کا بے حد شکریہ۔"

"آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے جو موڑ تک آپ کے ساتھ آیا کرے۔ یا آپ کی امی یہاں تک چھوڑنے اور لینے آ جایا کریں۔"

"جی ایسا کوئی انتظام ممکن نہیں ہے۔"

شاہین نے خدا حافظ کہہ کر قدم بڑھا دیئے۔

بھائی یا ماں سے کہتی تو صاف جواب ملتا۔

"ہم سے نہیں ہوتی یہ مزدوری۔ کیا ضرورت ہے پڑھنے کی۔ گھر بیٹھو آرام سے۔"

وہ اس ڈر سے کہ کہیں کالج جانے سے نہ منع کر دیں۔ اپنی پرابلم گھر والوں کو نہیں بتا سکتی تھی۔ چند گز دور جا کر اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا۔

اظہر ابھی تک وہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

شاہین کا دل جذبہ تشکر سے بھر گیا۔

ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں کیا! بلا امتیاز خلوص لٹانے والے۔ خیال رکھنے والے۔

وہ بہت اچھے احساسات کے ساتھ گردن واپس موڑ کر سیدھی ہوئی۔ اسی لمحے اس کی نظر سامنے اپنے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر گلی کے کونے میں اپنے دوست سے محو گفتگو بخاری صاحب پر پڑی۔ وہ بہت چبھتی ہوئی گہری نظروں سے بیٹی اور بیٹی کے پیچھے کھڑے نگرانی کرنے والے فوجی جوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شاہین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا۔

اسی دوران موٹر سائیکل سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

اظہر مطمئن ہو کر واپس ہو رہا تھا۔

بخاری صاحب دوبارہ اپنے دوست سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

شاہین کانپتے قدموں سے سر جھکائے دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے ان کے قریب سے گزرتی ہوئی گھر کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بخاری صاحب بھی گھر لوٹ آئے۔

دل و دماغ میں محشر برپا تھا۔

بار بار بابا جان کی گہری اور توکیلی نظر تصور کے پردے پر لہرا رہی تھی۔ وہ کمرے میں آ کر بیگ ایک طرف رکھ کر وہ بیڈ پر گر پڑی۔

"کیا بابا جان نے مجھے اظہر بھائی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔؟"

مگر نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک قیامت آ چکی ہوتی۔

وہ تقریباً پون گھنٹے تک ایک ہی پوز میں بیڈ پر لیٹی سوچوں کے سمندر میں ڈوبی رہی تاوقتیکہ امبرین باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نہ آ گئی۔

"آپ اندر تھیں امبر باجی۔ اتنی دیر سے۔" شاہین مارے تحیر کے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

ٹوٹے پھوٹے سے بے ربط انداز میں جواب دیتی ہوئی وہ بیڈ کے کونے پر یوں ٹکی جیسے میلوں کی مسافت کے بعد پڑاؤ ڈالنے کو ٹھکانا ملا ہو۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں لرزش طاری تھی۔ ایک ایسی کپکپی جو اس کے سیلف کنٹرول سے باہر تھی۔ شاہین نے غور سے اس کا سراپا جانچا۔

نہایت مدقوق جسم زردی کھنڈی صورت۔

آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور بے خوابی و بے رونقی غماز تھکی ہوئی آنکھیں۔

اس کی حالت بزبان خود اپنی داستان سنا رہی تھی۔

شاہین کو بہن پر بیک وقت غصہ اور ترس آیا۔

حالات و واقعات یا افراد سے تنگ آ کر انتقام لینے کے لئے اپنی ہی ذات کو مشق ستم بنا لینا دانش مندی کے زمرے میں بہر حال نہیں آتا۔

امبرین کو الکوحل اور منشیات استعمال کرتے ہوئے کافی عرصہ ہو چلا تھا۔ اور تعجب خیز بات تھی کہ ابھی تک گھر والے اس کی اس زہریلی روش سے بے خبر تھے۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔

ایک مدت سے گھر کے افراد کی روٹین عجیب سی بن کے رہ گئی تھی۔

ارشین کے ہاتھوں غیرت کا خون ہونے اور امبرین کے سسرال کی طرف سے عین شادی کے موقع پر انکار سے جنم لینے والی تذلیل و رسوائی کے بعد بابا جان گوشہ نشیں ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر وقت اپنی بنائی ہوئی تجربہ گاہ میں بند جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ کھانا پینا سونا رہنا بھی اسی تجربہ گاہ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ باہر صرف اس صورت میں آتے تھے جب کوئی بہت ہی قریبی دوست گھر کے دروازے پر آ جائے۔ یا پھر کسی کیمیاوی و حیاتیاتی مرکب خریدنے

کے لئے بازار تک جانا ناگزیر ہو جائے۔ تیسری کوئی صورت نہیں تھی۔

انہوں نے خود کو گھر کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ کر لیا تھا۔ بلکہ گھر کے کسی فرد سے بھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ بی بی جان سے فقط اتنا ربط تھا کہ وہ تین ٹائم کھانا اور چائے وغیرہ دے جاتی تھیں وگرنہ بابا جان ان سے بھی بات چیت کے روادار نہیں رہے تھے۔

رہا بی بی جان کا معاملہ تو وہ سارا دن گھر گرہستی کے دھندوں میں لگی رہتی تھیں۔ ارشین کی عدم موجودگی اتنے بہت سے مسائل کا باعث بنے گی انہیں اس بات کا اندازہ اب ہوا تھا۔ گھر کا سودا سلف لانا' بچوں کی ضرورت کی چیزیں خریدنا' بجلی' پانی اور گیس فون وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی دیگر امور خانہ کے معاملات سنبھالنا یہ سب ذمے داریاں آن کی آن میں ان پر آ پڑی تھیں۔ اس سے پہلے انہیں ان کاموں کے لئے نہیں کہنا پڑتا تھا۔ ارشین خود ہی سنبھال لیتی تھی۔ بجٹ کا کافی سے زیادہ بوجھ وہ بنا جتائے فراخدلی سے بانٹ لیتی تھی۔

اب ہر طرف سے مسئلے بارش کی طرح موسلا دھار برس رہے تھے۔ سو وہ ان ہی میں گم تھیں' اس لئے امبرین کی سرگرمیوں پر دھیان دینے کی فرصت میسر نہیں تھی۔ رہا عدنان تو وہ عجیب و غریب روش پر چل نکلا تھا۔ سارا سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے گھر میں انٹرنیٹ پر جڑا رہتا یا پھر کیبل کے ذریعے مختلف چینلز دیکھتا رہتا۔ اپنے گھر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ صاف کہتا تھا۔ "میں اس بھوت بنگلے میں بیٹھ کر اپنا دماغ خراب نہیں کر سکتا۔"

اور دادا دادی کا یہ تھا کہ وہ چار دن ٹھہرنے کے بعد وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر گوٹھ چلے جاتے تھے۔ قیام کے مختصر عرصے میں وہ امبرین کی روش' صحت یا کیفیت سے متعلق معاملات کو گہرائی سے ناپنے جانچنے سے قاصر تھے۔ اس لئے وہ ابھی تک براہ راست شک و شبہات کی زد میں نہیں آئی تھی۔ یوں تو نشہ کرنے والا فرد اپنا تعارف آپ ہوتا ہے۔

لیکن شروعات کے زمانے میں جب تک اسے باقاعدگی سے نشہ ملتا رہتا ہے' عام طور پر اس کی بیماری کی علامات آس پاس کے افراد پر واضح نہیں ہوتیں کیونکہ جیسے ہی اس کی ہڈیوں اور خون میں منشیات کی طلب جاگتی ہے اسے فوری طور پر اپنی "دوا" ہاتھوں ہاتھ مل جاتی ہے اور طلب پوری کرنے کے بعد جسم و جان میں وہ جو مصنوعی قسم کی تازگی و شگفتگی اور سکون پیدا ہوتا ہے اس کیفیت میں وقتی طور پر مریض اپنے آپ کو بہت چاق و چوبند اور فٹ محسوس کرتا ہے۔

امبرین کو اب تک طلب اور رسائی کے بیچ کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ لیلیٰ منزل میں ہمہ وقت اس کی تسکین کا سامان موجود رہتا تھا۔ گھر آتے ہوئے وہ وافر مقدار ساتھ لے کر آتی تھی۔ اس لئے اب تک بظاہر وہ نارمل ہی دکھائی دیتی رہی تھی۔ البتہ اب منشیات کے مسلسل استعمال نے اس کے جسم کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ادراکی اور جسمانی قوتیں متاثر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ علاوہ ازیں جسمانی حرکات و سکنات کی چستی و ہم آہنگی بھی غیر مربوط ہو گئی تھی۔ منشیات کے باقاعدہ استعمال کے بعد جو ذہنی اور جسمانی توڑ پھوڑ مریض کے اندر واقع ہوتی ہے اسکی علامات جھلکنے لگی تھیں اور کچھ دن جاتے تھے کہ یہ چھپائے نہ چھپنے والی بیماری بن جاتی۔

"شاہین!" بڑی دیر بعد امبرین کی مضمحل آواز کان میں پڑی۔

شاہین نے پلٹ کر دیکھا۔

امبرین سیدھی لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ اسکی آنکھیں ایک نقطے پر ارتکاز کرنے کی کوشش میں بے قراری سے دائیں بائیں گردش کر رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔" امبرین نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ شاہین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں مر جائیں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"بس۔ آخر مرتے بھی تو انسان ہی ہیں۔" وہ چڑی۔

"وہ لیلیٰ آنٹی ہیں نا....." امبرین کھوئی کھوئی بے ساختہ بول رہی تھی۔ "وہ کہتی ہیں خراب کام کرو..... ورنہ "دوا" نہیں ملے گی۔"

"خراب کام.....؟" شاہین کھٹک گئی۔

"کس قسم کے خراب کام۔"

"کہتی ہیں پروفیسر صاحب کے پاس بیٹھو ان کی بات مانو ان کا دل بہلاؤ خدمت خاطر کرو۔" امبرین بچوں کی طرح بسوری۔

"کون سے پروفیسر صاحب؟" شاہین کے اندر بھونچال آ گیا۔

"وہ ہیں نا لیلیٰ آنٹی کے جاننے والے۔" امبرین بچوں کی طرح جھلائی۔

"یہ کہاں پھنس گئی ہیں امبر باجی آپ؟"

شاہین سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

امبرین دوبارہ غنودگی میں چلی گئی تھی۔

وہ فکر مندی و بے چینی کے عالم میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

اتنا سیریس مسئلہ ہو گیا ہے۔ خدانخواستہ امبرین باجی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کا علم بابا جان اور بی بی جان کو ہونا بہت ضروری ہے۔

مگر وہ جو کچھ کریں گے اس سے امبرین باجی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے غصے میں آ کر انہیں مار پیٹ کے گھر بٹھا دیں گے اور یہ ہیروئن کی طلب میں ایڑیاں رگڑتی جان سے گزر جائیں گی۔

ذہنی طور پر ان کی جو حالت ہو چکی ہے ایسے میں یہ کسی پابندی کو قبول کریں گی بھی یا نہیں۔ الٹا اپنی ذات کو نقصان پہنچائیں گی۔

اف یہ کن عذابوں میں گھر گیا ہے سارا گھر۔

کاش ارشین آپی یہاں ہوتیں۔

وہ کبھی بھی امبرین باجی کو یوں بھٹکنے اور بگڑنے نہ دیتیں۔

غلطی بابا جان اور بی بی جان کی بھی ہے۔

جب امبر باجی نے کورس سیکھنے کیلئے لیلیٰ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کی اجازت مانگی تھی تو کم از کم بابا جان خود جا کر پہلے لیلیٰ منزل اور اس میں ہونے والے کورسز کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے۔ ارشین آپی ہوتیں تو یہی کرتیں پھر اپنی نگرانی میں اس کا ایڈمیشن کراتیں۔ امبر باجی کے معمولات پر نظر رکھتیں۔

بی بی جان نے ارشین آپی کی شادی کے بعد کچھ عرصے تک سب کو کڑے پہرے میں رکھا تھا مگر اب وہ بھی اپنے کام دھندوں میں مصروف ہو گئی ہیں۔ ورنہ وہی امبر باجی کی ذہنی و جسمانی صحت کا دھیان کر لیتیں۔

عدنان کہتا تو سچ ہی ہے۔

یہ گھر سے زیادہ بھوت بنگلہ ہے۔

شاہین نے سرد آہ کھینچی تھی۔

☆☆☆☆☆

"سر۔" انسپکٹر زوردار سیلوٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

مہران نے قلم ہولڈر میں ڈالتے ہوئے فائل بند کر دی اور انسپکٹر کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"ہاں بھئی نواز حسین۔ چھاپہ مار ٹیم تیار ہے۔"

"یس سر۔" انسپکٹر نواز حسین نے مستعدی سے سر ہلایا۔

"تمام انتظامات مکمل ہیں۔ ہمارے کچھ جوانوں نے سادہ لباس میں لیلیٰ منزل کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ نہایت محتاط طریقے سے تین دن سے خفیہ نگرانی ہو رہی ہے۔ لیلیٰ منزل میں داخل ہونے والے ہر شخص پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔ پولیس چھاپہ مارنے کے لئے ریڈی ہے۔ سر! نگرانی کے دوران عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں۔ یہ لیلیٰ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اصل میں اپنے مذموم عزائم کو چھپانے کے لئے آڑ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اندرون خانہ کہانی اور ہے۔ یہیں سے مختلف کالجوں اور اداروں کی سٹوڈنٹس کو ہیروئن اور الکوحل سپلائی کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں لیلیٰ شاہ نے مختلف لڑکیوں کو اپنی ایجنٹ بنا رکھا ہے جو سٹوڈنٹس کے روپ میں کالجوں میں پڑھتی ہیں اور دوسری لڑکیوں کو منشیات کے استعمال کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس طرح باقاعدہ ایک گینگ کام کر رہا ہے اور لیلیٰ شاہ کو اس سلسلے میں بیرون ملک سے بھی سپورٹ حاصل ہے۔"

درنایاب چھٹی پر جا چکی تھی لہٰذا اس کی جگہ مہران نے یہ کیس انسپکٹر نواز حسین کے سپرد کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آج کسی وقت ریڈ کرنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کل تک ساری کارروائی مکمل ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے میں نہیں رہوں گا۔"

"سر۔ وہ.....!" انسپکٹر نواز جھجک کر کچھ کہتے کہتے ہونٹ بھینچ گیا اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی افسر اعلیٰ سے اس کی ذاتیات کے متعلق سوال پوچھنے کی۔

"کہو۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

مہران اپنے مخصوص سپاٹ و بے تاثر انداز میں گویا تھا۔

"سر! میں نے سنا ہے آپ شادی کر رہے ہیں؟"

بڑی مشکلوں سے نواز سوال زبان پر لایا تھا۔

"ہاں۔" مہران نے فائل کھولتے ہوئے خشک انداز میں جواب دیا۔

"او کے سر۔" نواز افسر کی تیوریاں پہچان گیا تھا۔ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج کسی ٹائم دعوتی کارڈ تمہاری ٹیبل پر پہنچ جائے گا۔"

جب وہ نکل رہا تھا تو اس نے اپنی پشت پر مہران کی آواز سنی تھی۔

"جی۔ جی سر۔ تھینک یو سر۔" وہ خوامخواہ بوکھلا گیا۔

☆☆☆☆☆

"لیلیٰ آنٹی اور تارا نظر نہیں آ رہی ہیں؟"

امبرین اتوار کی چھٹی کے بعد لیلیٰ منزل آئی تھی۔ دروازہ تارہ کے بجائے ایک خادمہ نے کھولا تھا۔

"وہ جی ایک ہفتے کے لئے نیویارک گئی ہیں۔"

امبرین اندر آ گئی۔ یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ لیلیٰ "ڈوز" کہاں رکھتی تھی۔

"اوپر کی منزل میں کون ہے؟"

اس نے شور کی آواز سن کر خادمہ سے پوچھا۔

"کچھ لڑکیاں ہیں۔ شغل کر رہی ہیں۔"

خادمہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

امبرین اپنے "کام" میں مگن ہو گئی۔

ڈوز لینے کے بعد وہ یونہی دل بہلانے کو وہسکی پی رہی تھی جب اچانک پولیس پارٹی عمارت میں داخل ہوئی۔

تھوڑی سی دیر میں عمارت میں موجود تمام افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان میں سے کچھ امیر و کبیر گھرانوں کی صاحبزادیاں تھیں اور کچھ بدنام زمانہ کال گرلز تھیں۔ اس کے علاوہ متوسط طبقے کی وہ لڑکیاں بھی شامل تھیں جو ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینے کا بہانہ کر کے یہاں اپنی طلب

منانے آتی تھیں۔

امبرین نشے میں بے سدھ تھی۔ اسے زیادہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے۔

پولیس نے ان سب کو وین میں ڈالا اور تھانے لے گئی۔

☆☆☆☆☆

رات تک امیر و کبیر گھرانوں کے نمائندگان اپنی لڑکیوں کی ضمانت کرا کے لے جا چکے تھے اور اب پیچھے عمارت کا منتظم و ملازم طبقہ اور امبرین سمیت چند ایسی لڑکیاں رہ گئی تھیں جن کو عرف عام میں آوارہ لاوارث کہا جاتا ہے۔ ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔

"افسوس کہ اصل شکار ہاتھ سے نکل گیا۔"

مہران رات کو بذات خود تھانہ کوہسار آیا تھا آتے ہی اس نے انسپکٹر نواز سے ساری رپورٹ طلب کی۔ اسے لیلیٰ شاہ کے رنگے ہاتھوں نہ پکڑے جانے کا بہت افسوس تھا۔

"جی سر۔ مجھے بھی بہت رنج ہوا۔ اب تو ثبوت بھی مل گئے تھے۔"

"ڈرائنگ روم کے خفیہ خانے سے تقریباً پندرہ کلوگرام ہیروئن اعلیٰ درجے کی ولایتی شراب کے دس کارٹن اور ایل ایس ڈی ٹائپ کے انجکشن وغیرہ برآمد ہوئے ہیں۔" انسپکٹر نواز نے رپورٹ دی۔

"خیر بچ کر کہاں جائے گی۔ میں نے ایئرپورٹ پولیس کو انفارم کر دیا ہے۔ ایک ہفتے بعد نیویارک سے آنے والی فلائٹ کے تمام مسافروں کو چیک کیا جائے گا۔ ملزمہ کی تصویر بھی دے دی گئی ہے۔ انشاءاللہ اسے ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"مشکل ہے۔" مہران کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کے کسی خفیہ ایجنٹ نے اب تک اس چھاپے کے متعلق اسے رپورٹ کر دی ہو گی اور گمان ہے کہ وہ نامعلوم مدت کے لئے وطن واپسی کا پروگرام ملتوی کر دے۔ میں اس عورت کے شیطانی دماغ کی کارکردگی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نیویارک سے کسی دوسرے ملک روانہ ہو جائے۔ اس کے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ ہے۔ وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔ یوں بھی ہیروئن مافیا کے ہر ملک، ہر شہر میں بہت سے اڈے ہیں۔ وہ کہیں بھی پناہ لے سکتی ہے۔"

"جی سر یہ تو ہے۔"

"جو خواتین لیلیٰ منزل سے گرفتار کی گئی تھیں ان میں سے کتنی ابھی تک لاک اپ میں ہیں۔" انسپکٹر نواز نے جواب میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

"سر ایک مشکوک لڑکی کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہو رہا۔ نہ وہ کچھ بتاتی ہے نہ اپنے والی وارثوں کا ایڈریس بتانے پر آمادہ ہے۔"

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔" مہران اٹھ کھڑا ہوا۔ انسپکٹر نواز اس کے پیچھے تھا۔ سلاخوں کے پیچھے سات آٹھ خواتین موجود تھیں۔ باقی تو آپس میں بول چال رہی تھیں ایک بیس بائیس سالہ لڑکی فرش پر گم صم بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"سر یہ ہے وہ لڑکی۔" مہران نے بغور اس کی صورت دیکھی۔ دل میں ایک نامعلوم سا احساس شناسائی جاگا۔ یوں جیسے انسان کسی مانوس منظر کی جھلک دیکھے۔

"اسے کمرے میں لے آؤ۔" وہ کہہ کر پلٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سر جھکائے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"بی بی! تم کون ہو کہاں رہتی ہو اپنا ایڈریس اور فون نمبر بتاؤ تاکہ تمہارے ورثاء کو طلب کیا جا سکے۔" وہ خشک لب و لہجے میں مخاطب ہوا۔

امبرین نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ شناسائی کا احساس اس کے دل میں بھی جاگا تھا۔ مگر اس کی ذہنی حالت اتنی ردی ہو چکی تھی کہ یادداشت کے خانے میں ایس پی مہران آفریدی کو بہن کے خاوند کے طور پر پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ تو ان دنوں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

"سر! کیا پوچھ رہے ہیں تم سے۔" انسپکٹر نواز نے سختی سے ڈپٹا۔

"دیکھو بی بی! رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔" مہران نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

"تم جتنی دیر کرو گی گھر اور معاشرے کی نظروں میں اسی قدر معتوب بنتی جاؤ گی۔ ابھی بہر حال کچھ نہیں بگڑا۔ اگر تم نہیں بتاؤ گی تو ہم تمہیں آزاد نہیں کریں گے۔ رات تھانے میں گزارنا ہو گی اور اس رات کی صبح کے بعد تمہارے لئے تمہارے والدین کے گھر میں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ اپنا نہیں تو ان کی عزت کا خیال ہی کر لو۔ اپنے آپ کو تو برباد کر ہی چکی ہو ان کی پگڑی کیوں اچھالنا چاہتی ہو۔"

اس نے تحقیر و تنفر سے لبریز ایک نگاہ اس کے چہرے پر پھینکی امبرین کے سوکھے لبوں پر لرزش طاری ہوگئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز اس کے حلق سے برآمد نہیں ہو پا رہی تھی۔

"اگر میرے گھر والوں کو پتا چل گیا تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایسی لڑکیوں کے ساتھ اصولاً تو یہی سلوک کرنا چاہئے۔" مہران تلخی سے بولا۔

"بہر حال۔ اپنا ایڈریس بتاؤ اور جلدی کرو ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اس سے زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتے تمہارے پاس آخری چانس ہے اس کے بعد تمہیں لاک اپ میں بند کر کے صبح عدالت میں چالان پیش کر دیا جائے گا۔ ایک بار چالان پیش ہو گیا تو پولیس جسمانی ریمانڈ لے کر تم سے اصلیت اگلوانے کے لئے وہی ہتھکنڈے استعمال کرے گی جو ملزموں کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں' تم پر مقدمہ چلے گا اور ہیروئن مافیا کی آلہ کار بننے کے جرم میں عدالت تمہیں کئی سالوں کے لئے جیل بھجوا سکتی ہے۔ سوچ لو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتی ہو۔"

امبرین کے دل میں سزا کی اتنی دہشت طاری ہوگئی کہ بابا جان کا ہوا اس کے مقابلے میں کم محسوس ہوا۔ بالآخر اس نے نام و پتہ بتا دیا۔

"بخاری لاج!"

مہران اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور غور سے اس کا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ جانچنے لگا۔

"تم ارشین بخاری کی بہن ہو۔"

"جی۔" وہ بمشکل بولی۔ سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔ مہران نے ایک گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔

او ہو تو یہ تھا احساس شناسائی بیدار ہونے کا سبب اس کے دل میں امبرین کے لئے رہی سہی ہمدردی بھی ختم ہوگئی۔

"بہت خوب گویا دونوں بہنیں لیلیٰ شاہ کی دست راست بنی ہوئی ہیں۔ تف ہے ایسی اولاد پر۔ میری بہن یا بیٹی ایسی ہوتی تو اپنے ہاتھ سے گولی مار دیتا۔ لو اپنا نمبر ملاؤ اور اس کے باپ کو بیٹی کے کرتوت بتا کر تھانے طلب کرو۔ ان سے ڈیل تم خود کرو گے میں ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ اور ہاں اس کیس کے باقی معاملات اب تمہارے سپرد ہیں۔ میں کل سے ایک ہفتے کی لیو پر ہوں۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

امبرین چار بجے تک گھر پہنچ جاتی تھی مگر آج مزید چار گھنٹے اوپر ہو گئے تھے اور ابھی تک اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ صباحت بیگم کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔

"یا اللہ دوسری بار دوسری بیٹی کے لئے اس کڑے امتحان سے نہ گزارنا۔ میری ہڈیاں اب گھس گئی ہیں' مجھ میں مزید ذلیل ہونے کا دم خم نہیں رہا۔"

وہ بے قراری سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔

شاہین نے ان کے کہنے پر لیلیٰ انسٹی ٹیوٹ فون کیا تھا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

"حوصلہ رکھیں بی بی جان۔ ایسے ہلکان ہونے سے فائدہ۔" شاہین لاؤنج میں تخت پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تشویش سے انہیں ٹہلتے دیکھ رہی تھی۔

"میرے دل میں ہول اٹھ رہے ہیں۔ تمہارے بابا جان اپنے دوست کے بیٹے کی شادی میں گئے ہیں۔ کوئی پل گزرتا ہے کہ وہ واپس آتے ہوں گے۔ میں اس کی ساری سہیلیوں کے گھر بہانے بہانے سے فون کر کے پوچھ لیا ہے۔ خدا جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اے نمرہ ایک گلاس پانی پلانا۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔"

وہ نڈھال ہو کر تخت پر بیٹھ گئیں۔

پریشان تو شاہین بھی کم نہیں تھی مگر اس کی پریشانی کی وجہ دوسری تھی۔ وہ جانتی تھی امبرین کن لوگوں کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ اسے رہ رہ کر اس کی گفتگو یاد آ رہی تھی۔

"لیلیٰ آنٹی کہتی ہیں خراب کام کرو۔" اور ان خراب کاموں کی تفصیل سن کر شاہین کلیجہ تھام کر رہ گئی تھی۔

کیا لیلیٰ نے اسے چارے کے طور پر کسی شخص کے حوالے کر دیا ہے؟ ہو سکتا ہے اسے ہیروئن دے کر بے سدھ کرنے کے بعد کسی کو پیش کر دیا ہو یہ سوچتے ہی اس کی روح کانپ اٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بابا جان گھر آ گئے۔

"کیا امبرین گھر نہیں آئی۔" بخاری صاحب کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

"کیا نمبر ہے اس انسٹی ٹیوٹ کا۔ ادھر پتا کرو.....؟ عزت وحمیت کے اونچے میناروں سے ایک اور کنگرا گرتا دکھائی دے رہا تھا۔

"پتا کیا ہے وہاں سے کوئی اٹھا نہیں رہا۔" صباحت نے کانپتی آواز میں بتایا۔

"یہ سب تمہاری نحوست اور کم عقلی کا نتیجہ ہے صباحت بیگم۔" ان کی آنکھیں غیض و غضب سے دہک اٹھیں۔

"میں ان کورسوں کے حق میں نہیں تھا۔ تم ہی نے سفارش کی تھی کہ بچی کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ کچھ ہنر سیکھ لے گی تو دل بھی بہل جائے گا اور کام کا سلیقہ بھی آ جائے گا۔ بولو بتاؤ اب کہاں اور کن سے پوچھ گچھ کروں اپنی غیرت کا جنازہ اٹھانے کے لئے۔" وہ دانت پیس کر بولے۔

اسی لمحے فون کی بیل بجی۔

بخاری صاحب نے جھپٹ کر اٹھایا۔

"جی۔ جی ہاں یہی نمبر ہے۔" وہ جلدی سے بولے۔

"میں تھانے سے انسپکٹر نواز حسین بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس آپ کی بیٹی امبرین کے متعلق ایک اہم اطلاع ہے۔"

"تھانے سے میری بیٹی کے متعلق؟" الفاظ ان کے حلق میں اٹکنے لگے۔

"تھانہ۔" پاس کھڑی صباحت بیگم نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"الٰہی خیر۔"

"آپ کی بیٹی مشہور ہیروئن اسمگلر لیلیٰ شاہ کے اڈے سے ہیروئن پیتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔ اس وقت وہ دیگر ملزمان سمیت تھانہ کوہسار میں بند ہے۔ پتا چلا ہے کہ وہ کچھ ماہ سے لیلیٰ شاہ کی اسسٹنٹ کے طور پر بھی اس کے ساتھ کام کرتی رہی ہے۔ آپ بہر حال تھانے آ جائیں۔ باقی تفصیلات ملاقات پر گوش گزار کی جائیں گی۔ خدا حافظ۔" فون رکھ دیا گیا۔

بخاری صاحب سناٹ و صامت ریسیور پکڑے کھڑے رہ گئے۔

"کیا ہوا؟ کون تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔؟" جب انہوں نے بہت دیر تک اپنی پوزیشن نہیں بدلی تو صباحت بیگم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ جواب میں گہری خاموشی طاری رہی۔

"ثمرین کے بابا۔" صباحت بیگم نے گھبرا کر ان کا کندھا ہلایا اور دوسرے لمحے وہ بے جان بت کی طرح فرش پر آ رہے۔

"ارے پکڑنا۔ سنبھالنا اپنے باپ کو شاہین! عدنان یا میرے اللہ ارے کیا ہو گیا ثمرین کے

بابا۔" صباحت بیگم کے اوسان خطا ہو گئے۔ سب نے مل کر انہیں لاؤنج کے تخت پر ڈالا پانی کے چھینٹے مارے ہاتھ پاؤں مسلے۔ مگر نتیجہ ندارد۔

"انہیں ہسپتال لے چلیں بی بی جان۔" شاہین نے ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے راہ سجھائی۔

عدنان نے ارشین کی ریڈ سوزوکی نکالی۔ جیسے تیسے بابا جان کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور الشفاء انٹرنیشنل ہسپتال لے گیا۔ ساتھ میں بی بی جان بھی تھیں۔

شاہین جلے پیر کی بلی کی طرح لاؤنج میں چکرا رہی تھی۔ ثمرین سہمی سہمی نظروں سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔

"بابا جان ہسپتال میں ہیں تھانے کون جائے گا اور امبرین کو کون لائے گا۔"

وہ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنساتے ہوئے بے قراری سے سوچ رہی تھی گو کہ بابا جان کے منہ سے دو لفظ ہی پھسلے تھے۔

"تھانہ بیٹی؟"

لیکن معانی کے لحاظ سے اتنی مکمل تھے کہ سیاق و سباق سے بے خبر بی بی جان اور عدنان بھی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ امبرین کسی غلط کام کے سلسلے میں پکڑی گئی ہے اور اب تھانے میں بند ہے۔ یہ فقط شاہین کو علم تھا کہ وہ "غلط کام" کیا ہو سکتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں رینگتی ہوئی سوا دس بجانے لگیں۔

"ثمرین چندا تم کچھ کھا لو اور آرام کرو۔ کب تک بیٹھی رہو گی۔" اس نے بہتیرا کہا مگر ثمرین نہیں مانی۔

"مجھے آرام نہیں کرنا بابا جان اور امبر باجی گھر کب آئیں گے۔" بچی کو بھی حالات کی سنگینی نے سراسیمہ کر دیا تھا۔

"آ جائیں گے۔ تم دعا کرو۔" شاہین کھوئے کھوئے انداز میں اس کا سر سہلانے لگی۔ تقریباً ساڑھے دس کے قریب وہ لوگ واپس آئے۔ بابا جان کو اپنے قدموں پر چل کر آتے دیکھ کر شاہین کے سینے سے سکون کی سانس خارج ہوئی۔ وہ بہت نڈھال سے تھے۔ چہرہ سرسوں کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

"گھر میں جو پیسہ زیور اس وقت موجود ہے دے دو۔ خدا جانے چھڑوانے میں کتنے اٹھ جائیں۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں بی بی جان سے مخاطب تھے۔

"زیور تو ہے مگر پیسے۔" بی بی جان سوچ میں ڈوب گئیں۔ ان کا دل خون ہو رہا تھا۔ ایسی نوبت بھی آنی تھی۔

"چالیس ہزار ارشین کی تنخواہ کا بچا کے الگ رکھا ہوا ہے میں نے اس لئے آج تک نہیں برتا تھا کہ بیٹی کی کمائی ہے کسی بھلے وقت پر اس کے ہاتھ میں تھما دوں گی۔ یہ وہ پیسے ہیں جو وہ خرچ کے علاوہ ہر ماہ مجھے میری ذاتی ضرورتوں کے لئے زبردستی پکڑا دیا کرتی تھی میری ذات کی کیا ضرورتیں۔ سو جتنے دیتی تھی رکھ چھوڑتی تھی۔" بابا جان خاموش رہے۔ بی بی جان ایک لفافے میں پیسے اور سرخ پوٹلی میں بند زیورات لے آئیں۔

بابا جان دونوں چیزیں لے کر اٹھے۔

"عدنان گاڑی نکالو۔" عدنان نے ارشین کی گاڑی سٹارٹ کی اور باپ بیٹا تھانے روانہ ہوئے۔ بی بی جان کی جان سولی پر لٹک گئی۔

ثمرین تھک کر سو گئی تھی مگر شاہین کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ وہ بھی بی بی جان کے پاس لاؤنج میں تخت پر بیٹھی محو انتظار تھی۔

بی بی جان بیٹیوں کی پیدائش ان کی تعلیم اور ملازمت کے نقصانات پر ایک طویل لیکچر دے رہی تھیں جس کا لب لباب یہ تھا کہ خدا بیٹی دے تو نیک اور آبرومند دے وگرنہ صرف بیٹے ہی آسمان سے نازل کرے۔ کیا ضرورت ہے بیٹیاں پیدا کر کے زمین کے مسائل بڑھانے کی۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے ان لوگوں کی واپسی ہوئی۔

بابا جان اور عدنان کے پیچھے سر جھکائے مجرمانہ قدموں سے داخل ہوتی امبرین کو دیکھ کر شاہین کی سانسیں بحال ہو گئیں مگر پھر یہ سوچ کر رکنے لگیں کہ اب بابا جان اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

"ذلیل عورت! بیٹی تیری ناک کے نیچے شراب نوشی اور نشہ بازی کے لئے اتنے مہینوں سے اس بدنام زمانہ لیڈی سمگلر کے اڈے پر جاتی رہی اور تو بے خبر رہی جی تو چاہتا ہے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ فساد کی جڑ تو تو خود ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے صباحت بیگم کی طرف بڑھے۔

"تو نے یہ کہہ کر مجھ سے اجازت دلوائی تھی کہ وہ لڑکیوں کو امور خانہ سکھانے کا ادارہ ہے۔ ایک نیک اور شریف عورت اسے چلا رہی ہے۔" ان کی آنکھوں سے خون چھلک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صباحت بیگم پر جھپٹتے عدنان آگے آ گیا۔

"کیا کرتے ہیں بابا جان۔ بی بی جان کا اس میں کیا قصور۔ جو معلومات آپ کی بیٹی نے فراہم کیں انہوں نے آپ تک پہنچا دیں۔ آپ قصوروار سے حساب لیجئے ہماری عزت کی نیلامی کا۔"

عدنان نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کی توپوں کا رخ ماں سے ہٹا کر بہن کی طرف موڑ دیا۔ اس کا اپنا بس نہیں چل رہا تھا امبرین کی دھنائی کر دیتا۔ غیرت و حمیت کے مظاہرے میں باپ سے کیا کم تھا وہ۔

"میں جانتا تھا تمہیں بڑی کی پشت پناہی حاصل رہی ہے اس لئے ضرور گل کھلا کر ہی رہو گی۔ مگر اس کمال کو چھو لو گی۔ اس کا اندازہ بہر حال نہیں تھا۔"

وہ سرتاپا آگ بنے ہوئے تھے۔ شریف اور عزت دار شخص کا تھانے کا بلایا جانا ہی ایک سانحے سے کم نہیں تھا۔ کجا بیٹی کے معاملے میں اسے چھڑانے کے لئے جانا۔ احساس ذلت انہیں مارے ڈال رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کو ہی امبرین پر اتنا طیش آ رہا تھا کہ جب بابا جان نے ہاتھ اٹھایا تو کوئی رسما بھی بچانے کو آگے نہ بڑھا۔

یوں بھی کس کی ہمت تھی ان کے جلال کو آواز دینے کی۔ شاہین ایک کونے میں کھڑی کانپتی لرزتی یہ ہنگامہ دیکھتی رہی۔ امبرین خاموشی سے پٹ رہی تھی۔ بالآخر بابا جان کا بازو تھک گیا۔ (ایک ہی تو بازو تھا دوسرا تو حادثے کے نتیجے میں برسوں پہلے کٹ چکا تھا)۔

"اسے کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دو۔ اور شاہین کو نیچے اپنے ساتھ سلاؤ۔ کوئی اس کے کمرے میں نہیں جائے گا۔" وہ ہانپتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔

یہی انتظام اور آرڈر ایک دفعہ ارشین کے لئے نازل ہوا تھا۔ شاہین کے دل میں ایک تکلیف دہ احساس کانٹا بن کر چبھ گیا۔ باپ کے اوپر جاتے ہی وہ نیم جاں فرش پر پڑی امبرین کے پاس آ گئی اس کو بلا بلا کر اٹھایا اور گھسیٹ کر تخت پر ڈالا۔

"پانی لا اس کے لئے۔" آنسو بہاتی بی بی جان اپنی ماں حرماں نصیبی سمیت بیٹی کے سرہانے

آ کر بیٹھ گئیں۔ ارشین کی نسبت امبرین کے لئے بہر حال شروع سے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد شاہین نے اسے کھانے کو پوچھا۔

"نہیں میرے بیگ میں جو پڑیا ہے وہ لا دو۔ وہی چاہئے مجھے۔" امبرین بچوں کی سی بھیگی بھیگی سادگی لئے بسوری۔

"نہیں پیئے گی اب تو یہ زہر۔ حالت دیکھی ہے اپنی۔" بی بی جان نے غصے سے ایک دھموکا جڑا۔

"قصور تو میرا ہے۔ میں نے کیوں نہ دھیان دیا تیری گری گری حال سے بے حال حالت پر۔ ذہن میں تو آتا تھا کہ تجھے دن بدن گھن کیوں لگتا جا رہا ہے۔ مگر یہ علم نہیں تھا کہ سبب اتنا زہریلا ہوگا۔"

شاہین بی بی جان کے کہنے پر اسے سہارا دے کر اوپر کمرے میں لے گئی۔ اپنے کپڑے نکالے اور کتابیں وغیرہ لے کر بابا جان کے حکم کے بموجب بی بی جان کے پاس آ گئی۔

امبرین کے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ وہ اندر سے پکار رہی تھی۔

"شاہین! پلیز میرا بیگ دے دو۔ اس کی دوسری جیب میں پڑیا ہے وہ لا کر مجھے دے دو۔ دیکھو میرے جسم میں اینٹھن ہونا شروع ہو گئی ہے۔ میرے ہاتھوں پیروں پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی دیکھو شاہین بی بی جان پلیز میری بات مان لیں۔"

جوں جوں رات گزرتی گئی اس کی پکار کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بی بی جان دل پہ جبر کئے اس کا چیخنا چلانا اور رونا دھونا سنتی رہیں۔ ساری رات انہوں نے آنکھوں میں کاٹی۔

صبح وہ اس کے لئے ناشتہ لے کر گئیں تو وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بستر پر نڈھال پڑی اپنے ہی جسم کی بوٹیاں نوچ رہی تھی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ اٹھ کے بیٹھ سکتی۔

کھانا رکھنے کے بعد وہ دوبارہ کمرہ لاک کر کے باہر آئیں اور ہمت کر کے بخاری صاحب کی تجربہ گاہ میں قدم رکھا۔

"اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے ثمرین کے بابا۔" انہوں نے دھیمے سے اس کی کیفیت گوش گزار کی۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ بمشکل اپنا غیض کنٹرول کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کتاب

تھی۔ پھر وہ کتاب سمیت کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"ایسے کیسز میں یہی طریقہ علاج ہوتا ہے۔ نشہ چھڑانے کے لئے یہ تو کرنا ہوگا۔ کچھ دن تک روئے دھوئے گی پھر جب نہیں ملے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ اگر اس کی بہتری چاہتی ہو تو کان لپیٹ کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" اب وہ قدرے نرم انداز میں مخاطب تھے۔

"مگر اس طرح تو وہ مر جائے گی۔"

انہیں بیٹی کے لئے فکر کرتے دیکھ کر بی بی جان کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"نہیں مرے گی۔ چند دن تکلیف برداشت کرنا ہوگی پھر ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جاؤ یہاں سے میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔" بی بی جان باہر آ گئیں۔

شاہین کو ان کے خیالات کا پتا چلا تو وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"نشہ چھڑانے کے لئے ایک دم مریض کو اسکی فراہمی بند نہیں کی جاتی بی بی جان۔ اس طرح سچ مچ مریض کے جان سے گزرنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اسے آہستہ آہستہ مرحلہ وار اس لعنت سے چھٹکارا دلایا جاتا ہے۔ بہتر ہوگا ہم اسے کسی کلینک یا سنٹر میں ایڈمٹ کرا دیں۔ وہاں ڈاکٹرز ایسے انجکشن دیتے ہیں جو مریض کے اعصاب کو سکون بخشیں اور ساتھ ساتھ نشے کی طلب کو بھی کسی حد تک پورا کر دیں۔ ان انجکشنز کا پورا کورس ہوتا ہے جس کے بعد آہستہ آہستہ مریض کے مرض کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایک دم سپلائی روک دینے والا بے رحمانہ طریقہ اپنایا جائے تو مرض کے بجائے مریض کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو جائے گی دو چار دن میں ٹھیک۔ کلینک وغیرہ کے لئے تیرا باپ نہیں مانے گا۔ یہ شکر نہیں کرتیں وہ اسے تھانے سے اتنی رسوائی ہونے کے باوجود گھر لے آیا اور اس کا خیال کر رہا ہے۔ وہیں کہیں مار کے زمین میں گاڑ آتا تو پھر؟" بی بی جان نے جھڑکا۔

☆☆☆☆☆

نازش، مہران اور سفیان کی شادی کے انتظامات کے سلسلے میں نجمی کے اصرار پر باقاعدہ آفریدی ہاؤس شفٹ ہو گئی تھی۔ دانیال یوں بھی ان دنوں بیرون ملک ٹورز پر نکلے ہوئے تھے۔

"ایک ہفتے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور کام اتنے سارے باقی ہیں۔ نجمی کل سے ڈھولک رکھوا لیتے ہیں۔"

وہ ڈوپٹے کو کرن لگاتے ہوئے مصروف انداز میں نجی سے مخاطب ہوئی۔ نجی شادی اور ولیمے کے ڈریسز کے ڈبے کھولے بیٹھی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اور نازش پنڈی سے خرید کر لائی تھیں۔

"نہیں۔" نازش ہنسی۔

"وہ ڈبہ موصوف سفیان صاحب اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔ دیکھنے کے لئے۔"

"اچھا۔" نجی کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"کہہ رہا تھا میں دھیان سے چیک کر لوں یہ مسز سفیان کے شایان شان بھی ہے یا نہیں بڑی فکر ہو رہی ہے مجھے۔ آخر میری بھی چار بندوں میں کوئی عزت ہے۔ ناظر بھی ساتھ ہی جڑا اوپر گیا ہے۔ دونوں "تجزیہ فرما رہے ہیں۔ یہ مہران کہاں رہ گیا۔ کب سے پیچھے پڑی ہوں کہ بھیا چھٹی لے لو۔ کیا بارات والے دن درخواست دو گے۔" نازش نے آخری ٹانکا لگا کر دھاگا توڑا اور ڈوپٹہ تہہ کرنے لگی۔

"پتا نہیں دلہن کو پسند بھی آئیں گے یہ جوڑے یا نہیں۔" نجی درنایاب کا شادی کا میرون اور فان کلر کے کمبی نیشن والا دبکے اور کورے کے کام سے بوجھل لہنگا دوبارہ ڈبے میں سیٹ کر رہی تھیں۔

"میں نے تو بہت کہا تھا ساتھ چل کر اپنی پسند سے لے لیں مگر وہ مانی نہیں۔ بڑی شرمیلی اور سادہ طبیعت کی ہے۔"

نجی اپنی نیک فطرت کے ہاتھوں مجبور تھیں اس لیے وہ مرضی کے خلاف رشتہ ہونے کے باوجود مہران کے حوالے سے درنایاب کے لیے دل میں امڈتے پیار اور شفقت کو روک نہ پائی تھیں۔

"پسند کیوں نہیں آئیں گے۔ اے ون چوائس ہے آپ کی۔ یوں بھی وہ بہت سرخ و سفید ہے۔ میرون رنگ میں ایک دم دمک اٹھے گی۔" اسی لمحے مہران اندر داخل ہوا۔

"بیٹے! آپ چھٹی کب لے رہے ہو۔" نجی نے آتے ہی استفسار کیا۔

کل سے چھٹی پر ہی سمجھیں نجی۔"

اس نے اچٹتی نگاہ میرون و فان کلر کے لہنگے پر ڈالی۔ وہ سمجھ گیا تھا یہ اہتمام کس کے لیے

ہے۔

"فی الحال تو ایک گرما گرم خبر سنیے۔ آپ مجھ پر یقین نہیں کرتی تھیں نا۔ بہت تعریف کرتی تھیں ان موصوفہ کی خاندانی شرافت و نجابت اور نیک دلی کی۔ ان کی بہن کا کارنامہ سنیے۔" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے طنزیہ گویا ہوا۔

"ان کی چھوٹی بہن امبرین صاحبہ کل ہیروئن فروشی کے ایک اڈے سے گرفتار کی گئیں آدھی رات کو اس کے والد صاحب بیٹی کو چھڑا کر ساتھ لے کر گئے ہیں۔"

"ارے نہیں۔" بے اختیار نجی اور نازش کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"جی ہاں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکر کیجیے جو میں ایسے خاندان کی بہو کو گھر نہیں لایا۔ ورنہ مفت میں بدنامی گلے پڑتی۔ ابھی تو آپ کو موصوفہ کے وہ اوصاف نہیں پتا جن کو زبان پر لاتے ہوئے میری غیرت پہ ضرب پڑتی ہے۔"

وہ سرخ چہرے سمیت اوپر چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

ارے بیٹی ڈاکیا آیا تھا نال والے پنڈ کا یہ خط دے گیا ہے تمہارے نام۔"

لال دین چوکیدار گاؤں میں ڈاک کی ترسیل کا کام بھی کرتا تھا۔ جوں ہی ارشین نے سوشل ڈائجسٹ کے آفس سے چھٹی کے بعد گھر میں قدم رکھا وہ مستعدی سے دروازے پر آ گیا۔

"شکریہ چاچا....."

وہ ایک کارڈ تھا۔ مس ارشین بخاری کے نام "یہ ہمیں کس نے یاد کر لیا۔ اس ویرانے میں۔" اس کا پہلا دھیان سعد کی طرف ہی گیا تھا کیونکہ وہی اس ٹھکانے سے واقف تھا۔

اس نے لفافہ چاک کرنے سے پہلے پشت پر نگاہ ڈالی۔ فرام مہران آفریدی۔

وہ بری طرح چونک اٹھی۔

کیا بھیجا ہے جناب عالی نے اس نے الجھن و تجسس کے عالم میں کھولا اندر سے ایک خوب صورت سا شادی کا کارڈ برآمد ہوا۔

"ایس پی مہران آفریدی ہمراہ سب انسپکٹر درنایاب شادی خانہ آبادی۔" بروز جمعہ بتاریخ

10 مئی ہونا قرار پائی ہے۔ آگے مزید تفصیلات بھی تھیں رسم حنا بارات کی روانگی ڈنر دعوت ولیمہ وغیرہ وغیرہ مگر وارشین کی آنکھیں وہاں کے پہنچتے پہنچتے دھندلا گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

امبرین کو کمرے میں بند کیے دوسرا دن گزر چکا تھا۔ شاہین دوپہر کا کھانا لے کر بی بی جان سے چابی مانگ کر اوپر پہنچی۔

لاک کھول کر اندر داخل ہوئی تو ڈبل بیڈ خالی تھا۔

یقیناً باتھ روم میں ہوں گی" اس نے کھانا بیڈ کی سائیڈ پر رکھا۔ پانچ دس منٹ انتظار کے بعد اس نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

جواب نہ ملنے پر دھکیلا دروازہ کھل گیا۔ دوسرے لمحے اس کا جی دھک سے رہ گیا۔

باتھ روم خالی تھا اس کی نظر روشندان پر پڑی روشندان کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

امبرین کسی طرح فرار ہو گئی تھی۔ خدا جانے اتنی طاقت کس طرح اس میں آ گئی تھی یا شاید طلب نے حد درجہ مجبور کر دیا تھا۔

روشندان کے پاس ایک اسٹول موجود تھا۔ شاہین ہراساں ہو کر روشندان کے پاس آئی۔

اسٹول وہاں تک کیسے پہنچا امبر باجی کے نیم مردہ وجود میں اتنی طاقت کس شے نے بھر دی۔

شاہین۔ کہاں رہ گئی ہو۔ کھانا دینے گئی تھیں یا بنانے۔" صباحت کی آواز میں جھنجلاہٹ اور بے چینی کے تاثرات شامل تھے۔ وہ بوکھلا کر واپس پلٹی۔

اتنے میں بی بی جان کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

امبر کہاں ہے؟" خالی بستر اور شاہین کا ہوائیاں اڑتا چہرہ جو داستان سنا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر صباحت کے قدموں سے زمین نکل گئی۔

جھپٹ کر اندر آئیں' بے کلی کے عالم میں باتھ روم میں جھانکا۔

سٹول کی موجودگی اور کھلا روشندان واضح اشارے دے رہا تھا۔ انہوں نے دل تھام لیا۔

"سٹول پر چڑھ کر دیکھو باہر۔" ان کی کانپتی ہوئی سرگوشی شاہین کی سماعتوں کو چونکا گئی۔

یہ ان کا مطلب سمجھ کر آہستہ آہستہ اسٹول بھلواں سطح پر قدم جما کر کھڑی ہو گئی اور روشندان سے جھانک کر ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی۔ روشندان کا سایہ دیوار میں کافی نیچے بنایا گیا تھا۔ ایک

طرح سے کھڑکی کا ہی گمان ہوتا تھا۔ اس لیے یہاں سے باہر نکلنا خاصا آسان تھا۔

"بی بی جان۔" اچانک شاہین کے منہ سے دہشت زدہ چیخ نکلی۔

"کیا ہو گیا؟" آہستہ خدا کے واسطے' آہستہ اپنی آواز۔ کیوں قیامت کو آواز دے رہی ہو۔" وہ ہانپتی کانپتی باتھ روم میں داخل ہوئیں۔

شاہین روشندان سے گردن باہر نکالے نیچے دیکھ رہی تھی۔

روشندان کے عین نیچے کچھ فاصلے پر شیڈ بنا ہوا تھا اور امبرین اس شیڈ پر مڑی تڑی اپنے ہی خون میں ڈوبی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

"امبر باجی۔ بی بی جان امبر باجی۔" اس نے سٹول سے اتر کر بے تابی سے انہیں آگے آ کر دیکھنے کا اشارا کیا۔

نشے کی طلب سے بے حال ہو کر امبرین دماغ کی کسی انتہائی رو میں۔ بہہ کر روشندان کے راستے کو راہ نجات سمجھتے ہوئے بے سوچے سمجھے کود گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اتنی اونچائی سے براہ راست کودنے کا مطلب موت ہے۔

وہ تو خوش قسمتی سے گرتے ہوئے کسی شیڈ پر اٹک گئی تھی ورنہ فرش پر محض ہڈیوں اور گوشت کا ایک ڈھیر بکھرا ہوتا۔

"عدنان کو بلاؤ۔ عدنان کو بلاؤ شاہین۔ جلدی کرو۔" صباحت لہولہان اور جامد و ساکت بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر حواس کھو بیٹھیں۔ وہ بے ساختہ چلا رہی تھیں۔

اکیلا عدنان کس طرح شیڈ تک پہنچ کر اس کے وجود کو گھسیٹ کر بحفاظت نیچے اتارتا۔

بابا جان کی معذوری کوئی مدد کرنے میں حائل تھی۔

ایسے میں ان کے ہمسائے سعد کے والد صاحب نے حق ہمسائیگی اور حق دوستی نبھایا۔

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ سعد کی رقیہ بیگم اپنے گھر کی دوسری منزل کے پچھلے ٹیرس پر لٹکے دھلے ہوئے کپڑے اتارنے باہر آئی تھیں۔ صحن میں سیڑھی لگانے کی کوشش کرتے عدنان' شیڈ پہ پڑی امبرین اور سیڑھی کو تھامے کھڑی صباحت کو دیکھ کر صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ انہوں نے فوراً اپنے خاوند کے ساتھ لیا اور ادھر آ گئیں۔

"تم نیچے آ جاؤ بیٹے۔ میں امبرین کو اٹھاتا ہوں۔" راشد صاحب نے آتے ہی عدنان

کو سیڑھی کے پائیدان سے ہٹا دیا۔ خود اوپر چڑھے اور بڑی احتیاط سے اسے اٹھا کر نیچے لے آئے۔ نبض چیک کی۔

"اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا ہوگا۔ میں اپنی گاڑی لاتا ہوں۔ ویسے تو ایمبولینس کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس میں دیر لگے گی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے" رقیہ بیگم روتی ہوئی نڈھال و بے حال صباحت کو سنبھال رہی تھیں۔

"حوصلہ کریں صباحت بہن انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" راشد صاحب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر امبرین کو النقا انٹرنیشنل لے آئے۔ ان کے ہمراہ عدنان اور بابا جان بھی تھے۔

تین چار گھنٹے بعد امبرین میں زندگی کے کچھ آثار پیدا ہوئے اور وہ اپنے حواس میں واپس آ گئی۔

راشد صاحب نے فوراً گھر فون کر کے صباحت کو صورت حال بتا دی۔

"بھابھی امبر بیٹی اب ٹھیک ہے۔ غم نہ کریں۔ وہ ہوش میں آ گئی ہے۔"

☆☆☆☆☆

زندگی کا انوکھا دستور ہے۔

یعنی کہیں نغمہ غم ہے تو کہیں شادی ہے۔

جن دنوں بخاری لاج کے مکین امبرین والے مسئلے میں الجھے ہوئے تھے ان ہی دنوں آفریدی ہاؤس میں خوشیوں کی بارات اتری ہوئی تھی۔

مہران کی شادی تھی اور سفیان کا نکاح۔

نکاح مہران کے ولیمے والے دن رکھا گیا۔

مہران کی مہندی کا فنکشن دھوم دھام سے ہوا۔ سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ گھر کا وسیع و عریض لان جگمگاتے ہوئے انسانی چہروں سے سج گیا تھا۔

پروفیسر دانیال مہدی اپنے ٹور کے سلسلے میں امریکہ گئے ہوئے تھے۔ سو نازش مہوش کو لے کر مستقل آفریدی ہاؤس میں ڈیرے جمائے ہوئے تھیں۔

ایک صدمہ اور تکلیف دہ احساس جرم تو بہر حال تھا مگر پھر یہ کہ جب کسی واقعے کا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے تو سمجھوتا کر لینا مجبوری بن جاتا ہے۔ اور اگر ایک دفعہ سمجھوتا ہو جائے تو پھر دھیان بٹانے

کے لیے پیدا شدہ صورت حال میں دلچسپی لیے بنا چارہ نہیں رہتا۔

یہی دلچسپی زندگی کی روٹین اور پھر رفتہ رفتہ زندگی کا لازمی جزو بن جاتی ہے۔ ایسی ہی جذباتی کیفیت کچھ ان کی بھی تھی۔

ارشین کے حوالے سے اس کو حالات کے فریم میں رکھ کر مہران کے ورنا یاب سے شادی کے فیصلے کو قبول کرنا اور اس میں شریک ہونا نینی، سفیان اور نازش تینوں کے لیے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔

مگر پھر جب یہ سب کچھ ہونا ناگزیر ہو گیا اور حالات نے کچھ اس طرح رخ بدلا کہ قبول کیے بنا چارہ نہ رہا تو پھر لامحالہ سوئے ہوئے سارے مان ارمان بھی کروٹ لے کر جاگ اٹھے۔ نینی نے گویا خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ایک چھوڑ دو دو بیٹوں کی خوشیاں دیکھنے کی گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ ایک خلش کے باوجود وہ پوری طرح ان گھڑیوں کے لیے دیکھے ہوئے خوابوں کو تعبیر کا روپ دے رہی تھیں۔ ہفتہ بھر سے گھر میں ہر رات ڈھولک بجتی تھی۔ لائٹنگ بھی مکمل ہو چکی تھی۔

مہران کو خوشی دینے کے خیال کو فت و بیزاری کے احساس کے باوجود خاموش تھا۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا۔ گھر آتا تو خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیتا۔ مہندی کے فنکشن کے بعد کمرے کا ساتھ بھی چھوڑنا پڑا۔

"اب آپ بھابی کے ساتھ ہی یہاں قدم رکھ سکیں گے بھائی جان۔" ناظر پورے جوش و خروش کے ساتھ آرائشی سامان کے بنڈل اٹھا کر لایا تھا۔ اس کے ہمراہ نینی، سفیان اور اس کے کچھ دوست بھی تھے۔

"مسئلہ کیا ہے بھئی۔" وہ اپنی فطرت کے مطابق جز بز ہوا۔

"مسئلہ کیا ہونا ہے بیٹے۔ آپ کل تک کے لیے دوسرے کمرے میں شفٹ ہو جاؤ۔ اس کو دلہن کے لیے تیار کرنا ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے نینی۔" وہ الجھ گیا۔ جواب میں سفیان کے دوستوں کی بھرپور ہنسی کمرے میں گونجنے لگی۔

"اس کی ضرورت و اہمیت۔ کے بارے میں تو آپ سفیان کے دل سے پوچھیے۔ شام سے رولا ڈالا ہوا ہے کہ ہوگا تو میرے ساتھ بھی وہی جو مولوی صاحب اور افراد خانہ بھائی جان کے

ساتھ کریں گے پھر میں اور میرا کمرہ اکیلے کیوں۔"

"بکواس نہ کرو۔" بڑے بھائی کے سامنے اپنے بے تکلف دوست کا چلبلا وار اسے بے ساختہ جھینپنے پر مجبور کر گیا تھا۔

"بیڈ شیٹ اور پردے تو میں نے صبح بدلوا دیے تھے۔ کارپٹ ابھی پچھلے ماہ نیا ڈلوایا ہے۔ فرنیچر بھی سیٹ ہے۔ میرا خیال ہے چھت اور دیواروں پر آرائشی چیزیں لگانے کے بعد سجاوٹ مکمل ہو جائے گی۔" نجی اطراف کا ائرانہ جائزہ لینے کے بعد سفیان اور اس کے دوستوں کو ہدایات دینے لگیں۔

"نجی آپ نے فلاور شاپ پر پھولوں کا آرڈر دیا تھا۔"

"ہاں بھئی صبح کا پیغام نوٹ کروا رکھا ہے۔ ابھی تک جواب موصول نہیں ہوا۔ حد ہو گئی۔" وہ جھلائی۔

"یہی تو بتانے آئی ہوں۔ انہوں نے تو پھولوں کا ٹرک بھر کر بھیج دیا ہے میرا مطلب ہے پورا سوزوکی کیری ڈبا اوپر تک گلاب اور موتیے کے پھولوں سے ٹھنسا ٹھنس بھرا ہوا ہے۔ اتنے منوں ٹنوں پھول کہاں پہ لگائیں گے۔"

"کمرے میں لڑیوں میں پرو کر لٹکانے کے بعد جو بچیں گے وہ کمرے کے قالین کارڈیور اور سیڑھیوں پر ڈالنے ہیں۔" نجی نے پروگرام بتایا۔

"واؤ۔ زبردست آئیڈیا ہے۔ مووی بہت اچھی آئے گی۔ رنگ بھری۔" سفیان چہکا۔

"گیٹ کو بھی پھولوں سے ڈھانپنا ہے۔ سفیان یار تم اپنے دوستوں کے ساتھ کمرہ ڈیکوریٹ کرو اور ناظر آپ میرے ساتھ آؤ۔ آپ کو دوسرا کام سونپتی ہوں۔" رات کے دو بج رہے تھے مگر آفریدی ہاؤس میں جیسے دن کا سماں تھا۔ ہر شخص کام میں مصروف تھا۔ دور دراز سے آنے والے مہمان تو کل شادی میں پہننے کے لیے اپنے کپڑے پریس کرنے میں مگن تھے اور گھر کے مکین تازہ تازہ منگوائے ہوئے پھولوں کو ٹھکانے لگانے کی تگ و دو میں تھے۔

"کیا بیکار کی مشقت پال رہے ہیں۔ پھولوں کے بغیر بھی تو گزارا ہو سکتا ہے۔" مہران جھنجھلاہٹ کا شکار تھا تاہم وہ ان کے کام میں رکاوٹ نہیں بنا تھا۔

"اے میاں تمہارے لیے ہو گی مشقت۔ ماؤں کے تو یہی ارمان شگون ہوا کرتے ہیں۔

پہلا پہلا بیٹا۔ پہلی پہلی شادی جب اللہ نے دے رکھا ہو۔ ہر طرح کا کرم ہو خوشی سنبھالنے کے گن ہوں تو کیوں نہ چاؤ پورے کریں۔"

ایک بڑی بی کا ٹکڑا توڑ جواب اسے چپ کروا گیا تھا۔

رات دیر سے سوئے تو صبح بھی ساڑھے دس سے پہلے کسی میں بستر چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یوں بھی ایک ہی شہر کی بات تھی۔ بارات سہ پہر تین بجے روانہ ہونا تھی اس لیے کسی کو خاص جلدی نہیں تھی۔

"تمہارا دوست داور ابھی تک نہیں آیا۔ مہندی میں بھی شریک نہیں تھا۔"

نازش دولہا کی سیدھی سی کلاہ اور گلاب و موتیے کے تازہ ہار لے کر مہران کے کمرے میں آئی تھیں۔

"کل فون آیا تھا اس کا۔ کسی ایمرجنسی معاملے کی فوری رپورٹنگ کے لیے اس کل صبح گجرانوالہ بھیجا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا ایک دن کام ہے۔ بارات کے روانہ ہونے تک لازمی آ جائے گا۔ اگر تھوڑی دیر ہو گئی تو براہ راست ہوٹل پہنچ جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" نجانے کیا سوچتے ہوئے نازش کی نگاہ یونہی ایک لمحے کو اس پر ٹک گئی۔ دولہا وہ ایک بار پہلے بھی بنا تھا مگر زبردستی اور جبر کی بندھن نے ان گھڑیوں کو ناقابل برداشت عذاب کا روپ دے دیا تھا۔

اور اب۔

مہران کا چہرہ آنکھیں انداز لب و لہجہ ہر چیز پر سکون اور مطمئن تھی۔

اس نے کچھ پوچھنا کچھ یاد دلانا چاہا مگر پھر ہونٹ بھینچ لیے۔

ایک بیوی وہ ہے جو آسائش و ضروریات سے عاری ایک پسماندہ و تاریک گمنام جگہ پہ غربت و فلاس کے ویران کھنڈر میں دن پورے کر رہی ہے۔

مطعون ملعون ان چاہی اور قابل نفرت کہ جس کے ساتھ بندھا رشتہ معاشرے کا معتبر سرٹیفکیٹ حاصل نہ کر سکنے کے باعث اپنی جگہ مشکوک اور تذلیل آمیز ٹھہرا ہے۔

اور ایک بیوی وہ تھی ہے جو سینکڑوں گواہوں کے سامنے عزت و وقار اور معتبری کا سنہری لبادہ اوڑھے اس جگمگاتے ہوئے پر آسائش محل میں اترے گی۔ جسکے لیے اس گھر کا ایک ایک کونہ رنگوں

خوشبوؤں اور روشنیوں سے مزین کر دیا گیا ہے۔

کتنا فرق ہے۔

رشتہ ایک ہے' حوالہ ایک ہے۔ مگر قسمتیں تضاد کا شکار ہیں۔

ایک کی مسرتوں کا سورج کبھی طلوع ہی نہیں ہوا۔

اور دوسری خوشیوں کے لاتعداد سورج ہمراہ لیے آ رہی ہے۔ اک لامحدود یقین اور قوی تر احساس ملکیت کے ہمراہ۔

"اوہو۔ حسین و جمیل ایس پی صاحب یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ غلطی ہو گئی' سنا ہے اب تو لوگ ایس ایس پی بننے والے ہیں۔" داور کی سدا بہار ہشاش بشاش آواز نازش کو سوچ کی گہرائیوں سے نکال لائی تھی۔

"مبارک ہو۔ شادی ایک بار پھر۔" نازش کو سلام کرنے کے بعد اس نے مہران کو گلے لگایا۔ شرارتی لہجہ آخر میں لاشعوری طور پر کٹیلا ہو گیا تھا۔

مہران نے ناگواری سے اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

"بھائی جان تیار ہو گئے یا نہیں۔ نینی پوچھ رہی ہیں۔" نیچے سے ناظر آوازیں لگا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ہیرا لکھ سوا لکھ دا اے

دھیاں والیاں دیاں رب عزتاں رکھدا ہے

لاڈو کا گھر بچھوا ڑے ہی تو تھا۔ اوپر سے کنواری بالیوں کا ارمان بھرا جوش۔

سر شام ہی گھر کے کام کاج سے نپٹ کر آنگن میں جھکھا لگا دیا تھا اور اب پوری شدت و جذب کے ساتھ لہک لہک کر گانوں میں اپنے خوابوں کے رنگ و آہنگ سمو کر گن و سر شار بیٹھی گا رہی تھیں۔

"آپ بھی گاؤ نا باجی۔" لاڈو کی لاڈلی بھابھی رانو بار بار اس سے فرمائش کر رہی تھی۔ لاڈو گوٹا لگے پیلے دوپٹے میں اپنی سکھیوں کے دائرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اور عورتیں گھر کے مردوں اور بچوں کو روٹی پانی سے فارغ کر کے ایک کے بعد ایک آتی جا رہی تھیں۔

ایک گہما گہمی تھی۔ برکتے کے چہرے پر چھلکتے سچے خوش کن جذبوں کا عکس ارشین کے دل

میں اک ہوک سی بیدار کر رہا تھا۔

جب میری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت کیا سماں تھا۔

اسے باپ کا غیض و غضب سے دہکتا چہرہ یاد آیا۔

ماں کا تھکا ٹوٹا' نڈھال' صدمے سے چور چور سراپا۔

بھائی کی غیرت سے لال آنکھیں۔

بہنوں کی بے چارگی۔

دادی کی شکایت سے پر آنکھیں۔

اور اور۔

شریک حیات کا نفرت و حقارت سے لبریز سلوک۔

شادی کی وہ رات اسے بھلائے نہیں بھول سکتی تھی۔

"سہاگ رات۔" بے ساختہ پرانے زخم ادھڑنے لگے۔

اتنی عجیب سہاگ رات روئے زمین پر شاید کسی نے بھی گزاری ہو۔

ابتدا۔ شعلے برساتا بھسم کرتا الزامیہ لہجہ۔

انتہا۔ اپنے ہی خون میں ڈوبا بے یار و مددگار وجود۔

ماحول۔ انتہائی ڈراؤنا' تاریک اور خوفناک۔

استقبال۔ ویرانی' تنہائی اور سناٹے نے کیا۔

شرارتی لڑکیوں کا ٹولہ کیا تانیں اڑا رہا تھا۔

"باجی گاؤ ناں۔" رانو کی دیکھا دیکھی چند دوسری لڑکیاں بھی اصرار کرنے لگیں۔

"مجھے گانا نہیں آتا۔ تم گاؤ میں سن رہی ہوں۔"

وہ بمشکل لبوں پر مسکراہٹ لا سکی تھی۔

آج دس مئی ہے۔

بارات دلہن کو لانے جا چکی ہو گی۔

اس دلہن کو جسے وہ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اپنا نام دے گا' مقام بخشے گا۔ پہچان عطا کرے گا۔ آج کی رات اس کے نام کرے گا' اپنی وفا اور تحفظ دان کرے گا۔

کیا مجھے افسردہ ہونا چاہئے؟

کیا مجھے رونا چاہئے؟

اس نے خود کو ٹٹولا۔

مگر کس بات پر روؤں؟ کس چیز کے چھن جانے کا ماتم کرو؟ اس نے خود سے سوال کیا جو چیز کبھی اپنی رہی ہی نہ ہو نہ اپنائیت کا مان دیا ہو اس کے لئے کیا رونا۔ وہ کب میرا تھا۔ اول روز سے میرے وجود کا انکاری رہا ہے۔ صاف بتا دیا تھا کہ وہ دوسری لائے گا جو حقیقت میں پہلی ہوگی۔

اس نے میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔

پھر کیا اس کو الزام دوں اور کیوں دوں! کیوں کہوں' کیوں چلاؤں کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ظلم کمایا ہے اس نے۔

کیوں واویلا کروں عام عورتوں کی طرح۔

کیا فائدہ۔

خود فراموشی کی جانے وہ کون سی سٹیج ہوتی ہے جب انسان اپنے سود و زیاں اور اچھے برے کی فکر سے غافل ہو جاتا ہے۔

وہ کوشش کر کے اپنا ذہن برکتے کے آنگن میں نئی نویلی پر بہار مسرتوں کی طرف مبذول کرنے لگی۔

میرے پاس جینے کا سامان ابھی ختم نہیں ہوا۔

سوشل ڈائجسٹ کی نوکری ہے۔

پھر یاسین سنٹر کو تصویریں بنا کر فروخت کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہاں بھی دل لگ ہی گیا ہے۔

گزارا ہو رہا ہے۔ زندگی اپنے بہاؤ میں رواں دواں ہے۔

کیوں ناشکری کروں خوامخواہ۔

ہزاروں سے اچھی حالت میں ہوں۔ وہ بھی تو ہیں جو بدترین حالات میں بھی امید و آس کا دیا روشن رکھتے ہیں پھر میں کیوں اندھیروں سے دوستی کروں۔

برکتے کے آنگن میں آدھی رات سے ہنگامہ جوان رہا' پھر آہستہ آہستہ روانگی کا سلسلہ شروع ہوتا گیا۔

"اچھا خالہ میں بھی چلوں۔ اب کل شام کو چکر لگاؤں گی۔"

"بہت مہربانی بیٹی تم نے آ کر ہمارا مان بڑھایا۔ ٹھہرو ذرا' میں چھوٹے کو تمہارے ساتھ کر دیتی ہوں۔ گھر تک چھوڑ آئیگا۔"

"میں چلی جاؤں گی خالہ' یہ ساتھ ہی تو گھر ہے۔"

"رات کو جن بھوت آزاد ہو جاتے ہیں' بدروحیں ڈیرا جما لیتی ہیں' احتیاط کرنی چاہئے' پیر سائیں کہتے ہیں عشاء کے بعد گلیوں میں نکلنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔"

خالہ کی فکرمندی نے ارشین کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"آپ تو خالہ بس۔ اچھا پھر خدا حافظ۔"

گھر تو وہ آ گئی۔

بستر پر بھی لیٹ گئی۔

مگر لیٹ جانا سونا تو نہیں کہلاتا۔

سوتا تو بندہ تب ہی ہے جب نیند آ جائے آنکھ لگ جائے۔

وہ پوری رات پلک نہ جھپک سکی۔ سخت کوشش کے باوجود بغیر کسی وجہ کے کوئی احساس اپنی چبھن دے کر جگاتا رہا۔

☆☆☆☆☆

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

ایک ہی زاویے میں بیٹھے بیٹھے درنایاب کی ٹانگیں اکڑ گئیں۔ کمر الگ درد کر رہی تھی۔

بالآخر اس نے تکلف چھوڑ کر بیڈ کی مرصع پشت سے ٹیک لگا لی۔

کمرے کی آرائش کا از سر نو جائزہ لیا۔

لائٹ گرین بیڈ کور اور پردے گرین کارپٹ' اور لائٹ گرین ٹو تھریز صوفہ سیٹ' چھت' دیواریں' سائیڈ ٹیبل اور کارپٹ پر گلاب و موتیے کے پھولوں کی جھیں بچھی ہوئی تھیں خود بیڈ پر پھولوں کی پتیوں کی دبیز و ملائم تہہ نے بیڈ کور کا جیسے نام و نشان ہی مٹا دیا تھا۔

چھت سے لٹکتی خوبصورتی سے سجی پھولوں اور چمکتی پتیوں کی لڑیاں اور ایئر فریشنر کی بھینی بھینی خوشبو کے ہمراہ ملی جلی پھولوں اور عطر کی مہک اور ان سب خوبصورتیوں میں گھری ایک انتہائی حسین وجمیل سجی نویلی دلہن۔ کیا رومان پرور اور قلب و جان میں نشہ دوڑا دینے والا دل پسند ماحول تھا اتنا سحر کار کہ زاہد کامل بہک جائے۔

اتنا جاذب نظر کہ ایمان قابو میں نہ رہے۔

اتنا پر جوش کہ جذبات خود بخود ہوش کی لگامیں تڑا کر آندھی کی طرح فضا میں مچل جائیں۔ چھا جائیں اور کہیں رہائی نہ ملے۔

"کیسا ہوگا..... کیا ہوگا؟"

بھیگتی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بار بار خود سے سوال کر رہی تھی۔

دوسرے لمحے مہران کا سامنا کرنے پر طاری ہو جانے والی ہمیشہ کی گھبراہٹ و بوکھلاہٹ اس کی ہمتیں پست کر دیتی۔

وہ اس سے بہت ڈرتی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ زیادہ دیر تک اس کے سامنے کھڑی رہے گی تو اس کی ہیبت کی تپش سے پگھل کر پانی ہو جائے گی۔

لفظ ہونٹ پر لانا اور ان کی زبان سے ادائیگی کرنا دشوار ترین مرحلہ بن جاتا' اس کی طرف دیکھنا گویا سورج سے نظر ملانے جتنا کٹھن عمل بن جاتا۔

اتنا رعب' اتنا دبدبہ' اتنا خوف اس نے اس سے پہلے نہ کبھی کسی کا سہا تھا اور نہ کسی کا محسوس کیا تھا۔

غالباً تین بجے ہوں گے جب دروازہ کھلا۔

درنایاب کا پورا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔

جیسی تھی جہاں تھی وہیں برف کی سل کی طرح ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی۔ نہ سر جھکا سکی اور نہ انداز نشست تبدیل کر سکی۔

"السلام علیکم مجھے کچھ تاخیر ہو گئی۔" وہ سیدھا وارڈ روب کی طرف بڑھا تھا۔ چہرہ آواز دونوں معمول کے سے انداز میں سنجیدہ تھے۔

"مجھے شیروانی وغیرہ کی عادت نہیں ہے اس لئے سخت ان ایزی فیل کر رہا ہوں چینج کر کے

آتا ہوں پھر بات کریں گے۔" وہ سلیقے سے اخلاقیات جتا کر واش روم چلا گیا۔

"ابتدا تو اچھی ہے۔ خدا کرے۔ اخیر بھی ٹھیک رہے۔"

درنایاب کے واہموں میں جکڑے بے قرار دل کو قرار ٹھہراؤ نصیب ہوا تھا۔ کپڑے بدلنے میں اسے دس منٹ لگے۔

بال بنا کر وہ فرصت میں اس کے پاس پھولوں سے سجی مسہری پر آ بیٹھا۔ "خوبصورت تو آپ قدرتی طور پر ہیں ہی مگر اس ڈریس میں میک اپ اور جیولری کے ساتھ معمول سے زیادہ حسین لگ رہی ہیں۔"

اس نے اطمینان سے بیٹھنے کے بعد بلا تکلف اس کا چوڑیوں بھرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے دھیرے دبا کر سنگ مرمر جیسے سفید اس گداز و ملائم ہاتھ کی نزاکت محسوس کرنے لگا۔

درنایاب کی شریانوں میں دوڑتے خون میں اک لذت آمیز حدت شامل ہو گئی۔

"آپ گھبرا تو نہیں رہیں؟" مہران نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

نایاب کا سر جھک گیا اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے موتی بن کر جھلملانے لگے۔

"کیا بات ہے' کیا گرمی لگ رہی ہے۔" لہجہ نرم اور مہذبانہ تھا۔

"اے سی تو آن ہے' پنکھا بھی چل رہا ہے لگتا ہے یہ گھبراہٹ کا پسینہ ہے۔" اس نے ملائمت سے اس کا گلاب سا نرم و ریشمی لمس دیتا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے آہستگی سے اس کی پیشانی صاف کی۔

ہمیشہ کے کرخت تیور' سخت لہجہ اور تحکمانہ انداز رکھنے والا آفیسر معمول کے نرم اور گھریلو انداز میں کیا لگ رہا تھا۔ کیسا لگ رہا تھا یہ کوئی نایاب کے دل سے پوچھتا جو کسی بھی لمحے سینے کی حدود توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔

اتنی توجہ' یہ نظر کرم' یہ عنایت' یہ اپنائیت کی گرمی وہ تو خواب میں بھی نہ سوچ سکتی تھی کہ وہ اتنی خوش نصیب بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی لانبی پلکیں اضطراری انداز میں گلابی عارضوں پر تھرکنے لگیں۔

مہران کے ہاتھ دھیرے دھیرے اس کے چہرے کے مختلف نقوش چھو رہے تھے۔

"آپ کا انتخاب میں نے اس لئے کیا کہ آپ مجھے خالص لگیں ایک دم مصفا اور شفاف'

جس کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کا نام کی بازگشت نہیں ہے' کوئی دوسرا حوالہ منسلک نہیں ہے۔ جس کا حوالہ صرف میں ہوں' جس کی زندگی میں آنے والا میں پہلا اور آخری مرد ہوں۔" مہران نشست بدل کر سیدھا ہو کر بیٹھا اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگانے کے بعد سہولت سے اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر اپنے قریب کر لیا۔ درنایاب پوری جان سے کانپ گئی۔

من چاہے مرد کا لمس کتنا دلآویز اور ہوشربا ہوتا ہے' اس کا تجربہ اسے آج ہوا' اس سے پہلے کتنی بار اس کے رشتہ دار آفاق نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا' کبھی کوئی ضد منوانے کے لئے' کبھی کہیں لے جانے کے لئے اور کبھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مگر اسے کبھی یہ دل برباد دینے والی تباہ کن سنسنی خیز لہر بدن میں اٹھتی محسوس نہ ہوئی تھی۔ آفاق اور اس میں بہت بے تکلفی تھی ہزار بار اس نے اظہار محبت کیا تھا اس کی تعریف کی تھی اس کو سراہا تھا مگر وہ سرور جو مہران کے چند ستائشی کلموں نے اس کے ریشے ریشے میں بھرا تھا۔ اتنی سرشاری آفاق کی وارفتگیوں کی انتہا میں بھی نہیں ملی تھی۔

"میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ چیز باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی خالص ہو' انسان کی سوچ بھی اتنی ہی شفاف ہونی چاہئے جتنا کہ اس کا وجود۔ ملمع کاری سے کیا حاصل۔" مہران نے اس کے گرد حلقہ تنگ کر لیا۔

درنایاب کو سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

"مجھ سے یہ چیز برداشت نہیں ہوتی کہ جو میرا انتخاب ہے اس کو مجھ سے پہلے کوئی اتنے ہی انہماک اور دلچسپی کے ساتھ اپنا محسوس کرتا ہو۔ یہ احساس میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

اس کی نظروں کی حدت سے وہ کسمسائی اور بے اختیار مہندی بھرے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

"اونہیں....." مہران نے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا لئے۔ پھر بغور اور بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی' شرم' حجاب اور گھبراہٹ کے رنگ' اس چہرے کے پیچھے شاید کوئی اور چہرہ بھی جھانک رہا تھا۔ اچانک اس نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اسے ایک طرف ہٹا کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے اچانک کیا ہو گیا۔ درنایاب دلہناپے کا حصار توڑ کر گردن اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایکسکیوزمی....." وہ اچانک باہر نکل گیا۔ اس کا رخ ٹیرس کی طرف تھا۔

ٹیرس پر آ کر وہ فضا کے ملگجے اندھیرے میں اپنے اندر ابھرتے اس طوفان کی نوعیت جاننے

کی کوشش کرنے لگا جو اچانک قلب پر وارد ہوا تھا۔

کیا تھا یہ احساس جرم یا بے سود جنوں کا پچھتاوا۔

بعض اوقات مرضی کا فیصلہ بھی جان کا پھندا بن جایا کرتا ہے۔ جب وہ کچھ ہو جاتا ہے جو ہم چاہتے ہیں تو اس موقع پر خود بخود دل سوال کرنے لگتا ہے۔ بس یہی چاہتے تھے تم؟ کیا مل گیا وہ کچھ پا کر جس کے لئے تم نے زمین آسمان ایک کر چھوڑے تھے۔ کیا یہی تھی تمہاری منزل؟ تو مل گئی منزل۔

اب۔

اب کیا کروں گے۔ تمغہ تو جیت گیا حصول مقصد کا۔ اب آنے والے شب و روز کو کس بہلاوے کے تحت گزارو گے۔ ایسے میں اب تک کی گئی ساری جدوجہد اچانک بے معنی لگنے لگتی ہے۔ نیچے لان میں فقط آرائشی روشنیاں جاگ رہی تھیں۔ ہر ذی نفس نیند کی گرفت میں تھا۔

رات کا تیسرا پہر تھا' آسمان کے ستارے بھی غنودگی اوڑھنے لگے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا ہر شے رات کی ساحرہ کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے نیچے خوابیدہ و خاموش ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کون سا احساس اسے اتنے سحر انگیز ماحول سے کھینچ کر باہر لایا تھا۔

کافی دیر تک وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہلتا رہا۔ پھر اندر آ گیا۔

دروازہ دوبارہ لاک کرنے کے بعد وہ مڑا تو چونک گیا۔ کمرے کی تیز لائٹس آف تھیں۔ درنایاب ڈریس' میک اپ' جیولری اور انداز نشست سب کچھ بدل چکی تھی۔

ہلکے آسمانی سادہ کاٹن کے سوٹ میں تکیے سے ٹیک لگائے وہ نیم خوابیدہ تھی۔ لاک کا کھٹکا ہوا تو بمشکل دکھتے سر اور نیند بھری آنکھوں سمیت دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ سائیڈ لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا الجھا ہوا پریشان اور تھکا تھکا چہرہ پڑھنا ایسا دشوار فعل بھی نہیں تھا۔ مہران اس کے ناآسودہ سراپے پر لکھی تحریر کا حرف حرف پڑھ سکتا تھا۔

وہ بیڈ کی دوسری سائیڈ پر دراز ہو گیا' چند لمحے ماحول میں سناٹا اور سانسوں کا ارتعاش بولتا رہا۔ درنایاب اپنی جگہ ساکت لیٹی تھی۔

"آپ ابھی تک نہیں سوئیں؟"

معاً وہ اس کی طرف پلٹا اور ہاتھ بڑھا کر اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا ورنایاب پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔

"میرا انتظار کر رہی تھیں؟" وہ آن کی آن میں اجنبیت کے سارے فاصلے مٹا گیا۔

"کیا نہیں کرنا چاہئے تھا؟" ورنایاب کے دل نے سوال داغا تھا' تاہم لب ساکت رہے اس کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے محسوس کر رہا تھا۔ اس کی اہمیت وقدر افزائی کا عملی ثبوت دے کر معتبر کر رہا تھا۔ چند ساعت بعد ٹیبل لیمپ آف کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

حالت سنبھلتے ہی اسے گھر واپس لایا جا چکا تھا۔ فی الحال تو وہ سکون آور گولیوں کے زیر اثر سو رہی تھی۔ گھر میں ایک وحشت ناک سکوت طاری تھا۔ ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی پیش آنے والی اس غیر متوقع صورت حال پر ہل کر رہ گیا تھا۔ زخموں کا منہ سلتے ہی طلب انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔

"میں مر جاؤں گی بی بی جان! آپ کو خدا کا واسطہ' رسول کا واسطہ' مجھے تھوڑی سی لا دیں۔" وہ سر تھام کر رہ گئیں۔

"مجھے بھی اسی خدا کا واسطہ ہے۔ کچھ ہوش کر۔ شرم کر۔ کچھ سوچ۔ کیا مانگ رہی ہے تو۔ کیوں حیا نہیں آتی تجھے۔"

"بس ایک بار بی بی جان! صرف ایک بار۔" وہ ملتجی ہوئی۔

"زہر ایک بار پیا جائے یا دس بار زہر ہی رہتا ہے۔ امرت نہیں بن جاتا۔ نہ میرا کلیجہ جلا۔ خود کو سنبھال۔ کیوں میرے عذابوں کے دن لمبے کرتی جا رہی ہے۔ اب تو خدا سے ایک ہی دعا ہے اے اللہ پردہ کرا دے اس دنیا سے۔ بہت دن جی لیا۔ بڑے کشٹ اٹھا لئے اب معاف کر دے۔"

وہ اسکے سرہانے بیٹھ گئیں ہاتھ میں سیب اور کیلوں کی ٹرے تھی۔

"لے یہ کھا اپنی جان بنا۔ طاقت پکڑ۔ بھول جا اس زہر کو۔" انہوں نے سیب کاٹ کر ایک قاش اس کی طرف بڑھائی۔

"مجھے نہیں کھانا۔ بی بی جان! آپ کو اس جان کا واسطہ جو آپ کو سب سے زیادہ پیاری ہے۔ بی بی جان پلیز۔" وہ کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یا اللہ میں کیا کروں۔" بی بی جان نے آسمان کی طرف دیکھ کر آہ بھری۔

"دیکھ امبر! بس کر دے اب۔ نہ لے ہمارے صبر کا امتحان۔ ہماری بے خبری میں تو تو نے جیسے خود کو برباد کیا سو کیا مگر اب اپنی آنکھوں کے سامنے تجھے موت کے منہ میں جاتا دیکھ کر ہم خاموش تماشائی نہیں بنے رہیں گے۔ تیرے بابا جان نے کہا ہے پاؤں سے زنجیر باندھ کر تجھے کمرے میں بند کیا جائے۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر پھر بھی تو نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی تو ہاتھ پاؤں توڑ کر ڈال دیں گے۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ جانے کس طرح اپنے اندر کی آگ دبائے خاموش بیٹھے ہیں۔ ان کی برداشت مت آزما۔" وہ تلخی سے گویا تھیں۔

"آپ جائیں بی بی جان! میں انہیں کھلاتی ہوں۔"

شاہین الماری میں دھلے ہوئے کپڑے سیٹ کرنے کے بعد خاموشی سے بیڈ کے پاس آ گئی۔ بی بی جان کا ضبط جواب دے گیا تھا' وہ ٹرے پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور ہاں تم چوبیس گھنٹے اسکے ساتھ رہو گی اس کمرے میں۔ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا' اس کی دیکھ بھال اب تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"ٹھیک ہے بی بی جان! یوں بھی مجھے کالج کے بعد اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔" وہ امبرین کے سرہانے بیٹھ گئی۔ بی بی جان باہر نکل گئیں۔ "یہ لو شاہین۔"

امبرین نے ماں کے منظر سے ہٹتے ہی ہزار کا تڑمڑا نوٹ اپنے گریبان سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"یہ یہ کہاں سے آیا تمہارے پاس۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"جو ڈاکٹر مجھے چیک کرنے آیا تھا' اس کی سائیڈ پاکٹ سے نکالا تھا۔ وہ میری طرف سے سائیڈ کے سرنج بھر رہا تھا جب میں نے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"آپ نے چوری کی؟" شاہین آنکھیں پھاڑے صدمے کے عالم میں اس کی صورت دیکھنے لگی۔ ادھر کوئی احساس شرمندگی رقم نہیں تھا۔

"ایک بار لیلیٰ منزل میں ہی کسی نے بتایا تھا کہ اگر یہاں سے خوراک نہ ملے تو اور کس جگہ سے مل سکتی ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ کل تم کالج جاؤ گی ناں۔" جوش کے مارے وہ اچانک اٹھ بیٹھی اور شاہین کا کندھا تھام لیا۔

"واپسی پر اس جگہ اتر جانا۔ وہاں....."

"آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے امبر باجی۔" شاہین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی اور بے ساختہ جھرجھری لی۔ "میری بہن نہیں ہو!" امبرین اور آوہ وزاری پر اتر آئی مگر شاہین اپنے ارادے پر قائم رہی۔

"بہن ہوں اسی لئے تو آپ کو صحت مند باہوش اور خوش وخرم دیکھنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆☆☆

دیر سے سونے کے باوجود صبح اس کی معمول سے پہلے آنکھ کھل گئی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ نیند لے ہی نہ سکا تھا۔ منتشر سوچوں نے کچھ اس طرح اس کے دل ودماغ پر حملہ کیا تھا کہ ذہنی دباؤ سے بے چین ہو کر بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی۔ بالآخر تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔

نائٹ بلب کے ہلکے نیلے غبار میں اس نے گردن موڑ کر اپنے بائیں جانب محوخواب اس گلابی گلابی ریشمی وملائم جیتی جاگتی قیامت کو ایک نظر دیکھا اس کے اندر استراحت اور ملبوس کی بے ترتیبی نے کوئی تیز احساس مہران کے خوابیدہ اعصاب کو چھویا تو بے ساختہ اس نے نظریں چرالیں۔ وہ احساس عجیب سا تھا حالانکہ مرد ذات اس قسم کے احساس سے دوچار نہیں ہوا کرتی۔ کم از کم اس صورت میں تو کبھی نہیں جب استحقاق بھی ہو لیکن پھر بھی وہ اس احساس سے نجات نہ پا سکا۔ اسے لگا جیسے اس کی ذات کی کوئی خاص چیز کھو گئی ہے۔

عجیب سے مضمحل خیالوں میں الجھتے ہوئے اس نے شاور لیا اور پھر نماز ادا کرنے کے لئے فیصل مسجد چلا گیا۔ گاڑی نکالنے کے لئے اس نے گیٹ بھی خود کھولا تھا کیونکہ رات کا تھکا ہوا ناظر اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ نماز اور تسبیح کے بعد وہ کچھ دیر تک مسجد کے احاطے میں پھرتا رہا پھر باہر آ گیا اور آس پاس کی خاموش وسرسبز سڑکوں پر جوگنگ کے سے انداز میں چلنے لگا۔

شام کو ولیمہ تھا۔ تقریب کے انتظامات میریٹ ہوٹل میں کئے گئے تھے۔ اس نے شادی کے لئے تحفی کے اصرار پر ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی مگر اب سوچ رہا تھا مزید چار پانچ دن گھر بیٹھ کیا کرے گا۔

وہ گھر واپس آیا تو اس کا استقبال زور وشور سے بجتے ڈیک نے کیا' سفیان اور ناظر موقع محل کا فائدہ اٹھا کر جی بھر کر اپنی حسرتیں پوری کر رہے تھے۔

ایک دن آپ یوں ہم کو مل جائیں گے
پھول ہی پھول راہوں میں کھل جائیں گے
میں نے سوچا نہ تھا میں نے سوچا نہ تھا
ایک دن زندگی ہو گی اتنی حسین
جھومے گا آسمان گائے گی یہ زمین
میں نے سوچا نہ تھا

سب لوگ ناشتے پر جمع تھے۔

میرون اور سبز کمبی نیشن کے ہلکے کام والے چوڑی دار پاجامہ فراک میں ملبوس میک اپ سے مبرا تر وتازہ چہرہ لئے دریاب تحفی کے حصار میں شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔

نازش' سفیان' ناظر اور تحفی کے علاوہ دریاب کی عزیز دوست عروسہ بھی اپنے شوہر کے ہمراہ موجود تھی وہ لوگ میکے کی طرف سے ناشتہ لے کر آئے تھے۔

"کیا حسب حال گانا لگایا ہے۔ مگر مسز دیوراتم کس حساب میں انہیں سنا رہے ہو۔ کہاں ہیں ان جذبات کے حقیقی عکاس محترم جناب ایس پی بلکہ ایس ایس پی مہران آفریدی صاحب۔" عروسہ اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں گویا تھی۔

"سمجھ لیجئے پس پردہ ہی اظہار حال کر رہے ہیں۔" سفیان کون سا کسی سے کم تھا۔

"ارے واہ۔ خوامخواہ سمجھ لیں۔"

دل کی ڈالی پہ کلیاں سی کھلنے لگیں
جب نگاہیں نگاہوں سے ملنے لگیں
ایک دن اس طرح ہوش کھو جائیں گے
پاس آئے تو مدہوش ہو جائیں گے
میں نے سوچا نہ تھا

ڈیک مسلسل چل رہا تھا۔

جگمگاتی ہوئی جاگتی رات ہے
رات ہے یا ستاروں کی بارات ہے

ایک دن دل کی راہوں پہ اپنے لئے
جل اٹھیں گے محبت کے اتنے دیے
میں نے سوچا نہ تھا

"مہران بھائی! آ جائیں تو ہمیں اجازت دیجئے گا آنٹی۔ ہم نایاب کو لینے آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔ ہم لوگ شام کو آئیں گے بہو کے لئے پارلر میں ٹائم لے رکھا ہے۔"

"لوگوں کی کل شادی ہوئی آج ولیمہ ہے اور ایک ہم ہیں۔"

سفیان نے سرد آہ بھری اور پھر جو اس کے جواب میں قہقہے اور چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی تو اسے بات سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

مہران خاموشی سے سیڑھیوں کے راستے اوپر کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر پڑا ریشمی دوپٹہ واش روم سے اٹھی زنانہ وجود کی مہک اور ڈریسنگ ٹیبل پر بکھری میک اپ کی اشیاء مان سے اعلان کر رہی تھیں کہ اب اس کے وجود کمرے اور پرائیویسی کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔

وہ عجیب ہارے ہوئے انداز میں بستر پر بیٹھ گیا اور سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

☆☆☆☆☆

وہ بہت تھکے تھکے قدموں سے کالج بس سے اتر کر گھر کی طرف جا رہی تھی جب پشت سے آواز آئی۔

"السلام علیکم۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ نیلی جینز اور ریڈ شرٹ میں سیاہ گاگلز ہاتھ میں پکڑے وہ اپنے ہائیک سے ٹیک لگائے گویا منتظر کھڑا تھا۔

شاہین کے ہونٹوں پر مشکوری سی مسکراہٹ جھلکی مگر چہرے کے تاثرات میں ایک مستفسرانہ سی الجھن بھی نمایاں ہوئی تھی۔

"وعلیکم اسلام۔" جواب کا انداز ایسا تھا گویا وہ یہاں آمد اور انتظار کا مقصد معلوم کرنا چاہ رہی ہو۔

"میں اپنا اطمینان کرنا چاہ رہا تھا کہ دوبار ہا تو وہ بدتمیز لڑکا آپ کے راستے میں نہیں آیا؟"

"جی چھ دن سے نظر تو نہیں آ رہا۔" واقعی ایک ہفتہ ہو چلا تھا ابھی تک اس سے ٹاکرا نہیں ہوا

تھا۔

"میں شاید پہلے چکر لگاتا مگر فاریہ کے نکاح کی تقریب تھی اس کے انتظامات میں مصروف تھا اس لیے۔"

"فاریہ آپا کا نکاح ہو گیا!" اس نے حیرت سے کہا۔ "مبارک ہو آپ کو۔"

"میرا خیال تھا قریبی دوست ہونے کے ناتے فاریہ امبرین اور ان کی فیملی کو ضرور انوائٹ کریں گی۔" وہ کچھ شرمسار دکھائی دیا۔

"مگر معلوم نہیں کیا وجہ بن گئی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے امبرین یا اس کے گھر والوں سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ کیا دونوں کی آپس میں کوئی ناراضگی ہو گئی ہے؟" وہ حقیقتاً پریشان تھا۔

"ایسی بات نہیں بے بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ کنارہ کشی موزوں حل دکھائی دینے لگا۔" وہ گہری سانس لے کر گویا ہوئی۔ اتنا تو اسے بہت پہلے امبرین بتا چکی تھی کہ فاریہ مہران کے بھائی سفیان سے بیاہی جا رہی ہے۔

رشتوں کے جال بسا اوقات کس قدر گنجلک اور گھمبیر ہو جاتے ہیں۔

"کنارہ کشی؟" اظہر اس کے صبیح تر و تازہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

بہت عرصہ پہلے جب وہ خود بھی نوجوانی کی ابتدائی بہاروں سے متعارف ہو رہا تھا دل کے پردے پر ایک معصوم اور متوالی شبیہہ بڑی بے ساختگی کے عالم میں جلوہ افروز ہوئی تھی۔

وقت گزرتا گیا مگر وہ شبیہہ دھندلی ہونے کے بجائے مزید واضح اور شفاف ہوتی چلی گئی۔

تب وہ جونیئر کیڈٹ ہوا ہوا کرتا تھا پھر لیفٹیننٹ اور اب عنقریب کیپٹن کا عہدہ نام کے آغاز میں درج ہونے والا تھا مگر دل کی اسکرین پہ بھی صورت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس کے برعکس اس شبیہہ کے رنگ اور گہرے اور نمایاں ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ ایک دن وہ مجسم اس کی نظروں کے سامنے آ گئی۔

اب جب وہ مل ہی گئی تھی تو "کنارہ کشی" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ارشین اور امبرین کے حوالے سے فاریہ کی یکلخت خاموشی پر متفکر تو تھا مگر معاملے کے اس درجہ سیریس ہونے کا اندازہ نہیں تھا۔

"مجھے اجازت دیجیے گا۔ یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں لگتا۔"

شاہین اس کی سوچوں سے بے نیاز اپنی دھن میں گویا تھی۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ کہیں بابا جان کی نظر پڑ گئی تو بے قصور معتوب ٹھہرائی جاؤں گی۔ آج کل تو یوں بھی مبرین کی وجہ سے پورے گھر پہ ہیبت طاری ہے۔ اس نے جھرجھری سی لی۔

"اوہ آئی ایم ساری۔ آپ پلیز جائیے۔" اظہر نے فوراً بائیک اسٹارٹ کی اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

"کیا حال ہیں کافر حسینہ۔" وہ چند قدم چلی ہوگی جب چلبلاتی ہوئی شوخ آواز کان پڑی۔

"بڑی ملاقاتیں ہو رہی ہیں بھئی۔ ہم سے تو وہی خوش نصیب نکلا..... آہا۔" کھلنڈرے لہجے میں ہلکی سی کاٹ تھی۔ شاہین کے قدموں میں جیسے چکی کے پاٹ بندھ گئے۔ وہ ہراساں ہو کر مڑی۔ شاید اظہر وہاں کھڑا ہو۔

"وہ جا چکا ہے میری ننھی چڑیا۔" ناصر ہنسا۔

کبھی ہمیں بھی تو خدمت کا موقع دو۔ ہم تو تمہارے زیادہ اپنے ہیں۔ یہیں کے رہنے والے ہیں۔"

"کیا بجلیاں بھر دی ہیں اس فوجی جوان نے۔ لہجہ ہے کہ تلوار ہے بھئی۔" وہ صاف مذاق اڑا رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ دانت پیس کر دھیمے لہجے میں غرائی۔

"آئے ہائے۔ اسی ادا پر تو مرتے ہیں میری جان۔"

احساس ذلت سے مر جانے کو جی چاہا۔ لامحالہ وہ کنی کترا کر آگے بڑھنے لگی۔

ہو سکے تو میرا ایک کام کرو
شام کا اک پہر میرے نام کرو

شوخ و شنگ گنگناہٹ اس بات کی شاہد تھی کہ وہ مستقل اس کے ساتھ ہم قدم تھا۔

یا خدا کیا کروں۔ کسی کی نظر پڑ گئی تو افسانہ بن جائے گا۔

"کیا چاہتے ہو تم۔" وہ زچ ہو کر گردن موڑ کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔ جواب میں وہ لاابالی انداز میں ہنسا۔

"بہت کچھ مثلاً تمہارا یہ حسن، یہ جوانی، یہ ادا و ناز یہ....."

"اوہ۔ بند کرو اپنی بکواس۔" ناچار اس نے دوبارہ قدم آگے بڑھا دیے۔ گھر قریب آتا جا رہا تھا اور فکر سے وہ ادھ موئی ہوتی جا رہی تھی۔

"جاؤ۔ اب تو جان چھوڑ دو۔" وہ آواز دبا کر سرگوشیانہ منت گزار ہوئی۔ وہ اسے کسی بھی طرح رام کر کے پلٹ جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہائے میرے اللہ۔ ایک بار پھر کہو۔ ایسی ہی رس بھری پیار ٹپکاتی آواز ہیں۔"

ہونی ہو کر رہی۔ موڑ مڑتے ہی بابا جان گھر کے گیٹ کے آگے کھڑے دکھائی دے گئے۔ ایک قدم پیچھے چلتے نوجوان کے ہلتے ہوئے ہونٹ اور بیٹی کی جوابی گفتگو کو وہ سن نہیں رہے تھے مگر دیکھ تو ضرور سکتے تھے۔

"اوہ مائی گڈنیس۔ وہ وہ میرے بابا جان کھڑے ہیں۔" دور سے دیکھتے ہی شاہین پر ہیجان طاری ہو گیا۔

"باپ رے۔" تھا تو لونڈا ہی لڑکی کے باپ کو سامنے پا کر ساری بدمعاشی ہوا ہو گئی۔

"چلتا ہوں بھئی۔ چلو آج کی مہم کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ آپ کی محل سرا کے بارے میں پتا چل گیا۔ ایک تجسس سا تھا کہ کہاں رہائش پذیر ہیں شہزادی صاحبہ۔"

وہ اپنے مخصوص لاپروا انداز میں فقرے اچھالتا خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ شاہین کا جی چاہا جہاں کھڑی ہے وہیں غرق ہو جائے۔ بابا جان کا سامنا۔

وہ من من بھر کے قدم اٹھاتی گیٹ تک پہنچی تو حیرت انگیز طور پر بابا جان خاموش رہے۔ شاہین نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے چور نظروں سے ان کا چہرہ ملاحظہ کیا۔ وہ سڑک کے پار لگے درخت کے پتوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ وہ اندر آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو ایک جھٹکا سا لگا۔

"بی بی جان۔" صدمے اور وحشت سے وہ ساکت رہ گئی۔

"یہ کیا کیا ہے آپ نے۔ امبر باجی کو رسیوں سے کیوں باندھا ہے؟" وہ تیر کی طرح بیڈ کی سمت لپکی۔ کلیجے میں جیسے کسی نے سینکڑوں بھالے اتار دیے تھے۔

امبرین ترے مڑے انداز میں پراوندھی کراہ رہی تھی۔ شاہین نے اسے سیدھا کرنے کا

کوشش کی تو وہ بری طرح چیخنے لگی۔

"کیا کرتی میں پھر بتاؤ۔" بی بی جان بے بسی سے بولیں۔

"چھوڑ دو اسے اس کے حال پر۔"

"امبر باجی۔ ہوش کریں۔ آنکھیں کھولیں۔" وہ اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔

"مجھے لا دو، مجھے لا دو۔" امبرین ہانپ رہی تھی۔

"کیا لا دیں۔ کیا چاہیے امبرین باجی۔" وہ بے قراری سے اس پر جھکی۔ دونوں ہاتھ اور پاؤں رسی سے بندھے تھے۔ مزاحمت کرنے سے رسیاں کلائیوں اور ٹخنوں پر زخم بنا رہی تھیں۔ بہن کی یہ حالت دیکھ کر شاہین کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"کیا تجھے نہیں پتا کیا چاہتی ہے یہ۔" بی بی جان شاہین پر بگڑنے لگیں۔

"چل چھوڑ اسے اور باہر آ۔" انہیں ڈر تھا ہمدردی میں آ کر وہ رسیاں کھول دے گی۔

"بی بی جان! اس کی حالت دیکھیں۔ آپ کو ترس نہیں آتا اس پر۔" شاہین پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یہ مر جائے گی اس طرح۔"

"نہیں مرے گی۔ اسی طرح تو ٹھیک ہو گی۔ دل پر بھاری پتھر رکھ لے۔ مجھے دیکھ میں تو ماں ہوں۔ نہ زخموں کے منہ کھول۔ آ جا باہر۔"

"کھانا کھلایا ہے اسے۔" شاہین بے چینی سے امبرین کے بال سہلانے لگی۔

"کچھ نہیں کھا رہی۔" بی بی جان پریشانی سے بولیں۔ اب کے لہجہ دھیما تھا۔

وہ مارے باندھے اس کے پاس سے ہٹ گئی مگر رات کو جب سونے کے لیے اس کے پاس کمرے میں آئی تو اس کی آہ و زاری اور بین سن کر دل پگھل کر پانی ہوتا چلا گیا۔

"میں تیری منت کرتی ہوں، تیرے پاؤں پڑتی ہوں شاہین۔ میری بہن! مجھے بچا لے۔" باتھ روم لے جانے کے لیے شاہین نے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے تو امبرین اس کے قدموں میں گر گئی۔

"امبرین باجی۔ خدا کے لیے۔" شاہین تڑپ کر جھکی اور اسے اٹھا کر بازوؤں میں لے لیا۔

"میری زندگی بچا لے شاہین! نہیں تو مجھے چھری لا دے کہ میں اپنا نرخرہ کاٹ ڈالوں۔ میں

لمحہ لمحہ مر رہی ہوں شاہین! میں مر رہی ہوں۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے سسکنے لگی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں امبر باجی۔ کچھ بھی تو میرے بس میں نہیں ہے۔" وہ امبرین کے آنسوؤں سے چپکے بالوں کو ہٹا رہی تھی۔

"ہے۔ تمہارے بس میں ہے شاہین۔" امبرین نے بلکتے ہوئے اس کا شانہ دبوچنے کی کوشش کی۔

"اچھا بتائیں کیا کروں میں۔" شاہین سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی بالآخر ہار کر گویا ہوئی۔

"وہ ادھر پیر ودھائی کے پاس ایک جگہ ہے اس پلازے کے نچلے فلور پر۔ اچھا ٹھہرو، قلم دو۔ میں تمہیں لکھ دیتی ہوں۔ وہاں سے مل جائے گی۔"

"میں اس طرف کبھی نہیں گئی امبر باجی! میں راستہ بھول جاؤں گی۔" اس نے منت کی وہ خوفزدہ بھی تھی اور بہن کی محبت سے مجبور بھی۔

"نہیں بھولے گی۔ میری پیاری بہن۔" وہ جھپٹ کر کاغذ الماری سے نکالنے لگی۔

"مگر میں جاؤں گی کیسے؟" وہ بے بسی سے امبرین کی شکل دیکھنے لگی۔

"کل کالج کے بعد واپسی پر لے آنا۔"

"لیکن میرا کالج کا روٹ دوسرا ہے اور پھر میں کالج بس سے آتی ہوں۔"

"کل بس سے نہ آنا۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو میں گلے گلے پھنس جاؤں گی۔"

"کون دیکھے گا۔" امبرین نے کاغذ پر ایڈریس لکھا۔

"فرض کریں بابا جان مل گئے انہیں کیا جواز پیش کروں گی۔ کیا کہوں گی کہ یہاں کیا لینے آئی ہوں۔ ظاہر ہے وہ جگہ میرے راستے میں نہیں پڑتی۔ اور کبھی اکیلی گھر سے بازار یا مارکیٹ کے لیے بھی نہیں نکلی کبھی کالج پرائیویٹ ٹرانسپورٹ پر نہیں گئی۔ کیا بہانہ کروں گی۔ کیا کہوں گی۔ نہیں امبر باجی!۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔" کوئی ان دیکھی طاقت اسے احساس دلا رہی تھی کہ وہ پھنس جائے گی۔

"میری زندگی کے لیے بھی نہیں شاہین۔"

جانے کیا تھا اس ایک جملے میں کہ شاہین کا دل پھر ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اس پر مستزاد صبح

جب وہ کالج کے لیے اٹھی تو امبرین کی ہوش سے بیگانہ کیفیت دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننے پر تیار ہو گئی۔

کچھ بھی تھا تھی تو وہ سترہ برس کی ایک کم سن اور ناسمجھ لڑکی۔ بہن کی آہ وزاری دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ حالانکہ وہ جو مانگ رہی تھی وہ اسے زندگی سے مزید دور لے جاتا۔ یہ امبرین کی مدد نہیں تھی کہ اسے وقتی تسکین کے لیے زہریلا نشہ فراہم کیا جائے۔

سارا دن کالج میں وہ ذہنی طور پر غیر حاضر رہی۔ بار بار خیال آتا نہ جائے۔ جانے کیوں اس کی نظروں میں طرح طرح کے بھیانک خاکے کھینچ رہے تھے۔

"شاہین۔ کالج بس نکلنے والی ہے۔ ادھر گیٹ پر کھڑی کیا سوچ رہی ہو۔" چھٹی کے وقت اس کی کلاس فیلو نے ٹہوکا دے کر اسے بیدار کیا۔

"آج میں کالج بس پر نہیں جاؤں گی۔" وہ بتا کر ڈرتے ڈرتے گیٹ سے باہر نکلی پہلی مرتبہ وہ خود سفر کرنے جا رہی تھی۔ ہر ہر قدم پہ خوف و ہراس پنجے نکال کے رفتار سست کر دیتا۔

"ایسا کرتی ہوں، ٹیکسی کر لیتی ہوں۔" بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا۔ امبرین کا دیا ہوا ہزار روپے کا نوٹ اس کے بیگ کی جیب میں تھا۔ اسی میں سے کرایہ دیا جا سکتا تھا۔

مطلوبہ مقام پر پہنچتے ہی اسے پھر سے ڈر لگنے لگا۔ سامنے بسوں ویگنوں کا اڈہ تھا۔ بے تحاشا ٹریفک، بے شمار لوگ اور پلازے کے اطراف بنی رنگ برنگی چیزوں کی دکانیں۔ نیلی وردی میں پولیس کے سپاہی بھی کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

"اگر کسی نے مجھے ہیروئن لاتے ہوئے دیکھ لیا؟ یا پولیس نے پکڑ لیا تو؟" اس کے دل میں آیا واپس ہو لے۔ بار بار کوئی خیال ذہن میں دستک دے کر خبردار کر رہا تھا۔

"اب یہاں تک آ ہی گئی ہو تو مزید ہمت کر لو۔" امبرین کا بلکتا سسکتا سراپا تصور میں آ کر درخواست گزار ہوا تو وہ ہمت کر کے ٹیکسی سے اتر آئی۔

کالج کے یونیفارم میں پھرنا اسے بہت آکورڈ لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ پلازے میں داخل ہونے تک اسے ہر ہر قدم پر لوگوں کی نظریں جسم میں سوراخ کرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مطلوبہ فلور پر پہنچ کر اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور امبرین کی ہدایت کے مطابق "راسطے کے کوڈ ورڈز" کاؤنٹر پر بیٹھے مونچھوں والے پٹھان کے آگے دہرائے۔ یہ کوڈ لیلیٰ شاہ کے بندوں کے حلقے میں

استعمال ہوتا تھا۔

آدمی ٹھٹھکا پھر غور سے اس کی صورت دیکھنے کے بعد پھنکارا۔

"کتنے کا مال چاہیے۔" لہجے میں عجیب سی غراہٹ تھی۔

شاہین نے نو سو روپے نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ دکان دار نے نیچے جھک کر سفید پاؤڈر کی دو تین تھیلیاں اٹھائیں اور اس کے آگے پھینک دیں۔

"جلدی سے شکل گم کرو۔ آج کل بڑا گشتی ہے پی بی۔" وہ دوبارہ لاتعلق بن گیا۔

شاہین نے مال بیگ میں رکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔ وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھی جب بدقسمتی سے قیصر سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ ابھی ابھی ایک ویگن سے اترا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی تیر کی طرح لپکا۔

"آہا میں صدقے میں واری۔ میری جان ادھر کھڑی ہے میرے انتظار میں۔" شاہین کا خون خشک ہو گیا۔ یا اللہ ایک نیا امتحان۔

"یہاں کیا کر رہی ہو میری سرکار۔" وہ لپک کر بولا۔ نظریں بھرپور انداز میں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کوئی جواب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ دفعتاً نگاہ بائیں طرف ویگن اسٹینڈ کے پاس رکتی ریڈ سوزوکی پر پڑی۔

گاڑی عدنان چلا رہا تھا اور بابا جان ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے ان کی نظریں براہ راست شاہین اور اس کے ساتھ کھڑے لڑکے پر جمی ہوئی تھیں۔ زمین و آسمان اس کی نظروں میں گھوم کر رہ گئے۔

شاہین کے اندر خوف و دہشت کی پھریری کچھ اس طرح سرتاپا سرایت کر گئی کہ وہ سوچے سمجھے بغیر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

"ارے حضور کیا ہو گیا۔ کیا دیکھ لیا جو ہرنی کی طرح قلانچیں بھر رہی ہیں۔" پیچھے سے قیصر کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر اس وقت اسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔

بس یہی دھن تھی کہ کسی نہ کسی طرح بابا جان کی نظروں سے چھپ جائے۔ وہ ناصر کے ساتھ دیکھ لی گئی ہے۔

اس سے پہلے بھی یہ لڑکا ان کی نظروں میں آ چکا ہے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ وہ کالج کے بہانے اس کے ساتھ پھرتی ہے اور اس یقین کے بعد اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس کا کیا حشر کیا جائے گا یہ سوچ کر ہی اس کی روح لرز اٹھی۔ وہ ان کی رسائی سے دور ہونے کے لیے بھاگتی چلی گئی۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھ کر پاگل کی بچی کہہ کر نظر انداز کیا ہوگیا۔ جانے کس کس سے ٹکرائی' کن کن رستوں سے گزری اور کہاں کہاں سے موڑ مڑی اسے ان باتوں کا ہوش نہیں تھا۔ ناصر کی آواز کہیں دور رہ گئی تھی۔

"سالی کا دماغ خراب ہوگیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر اپنی راہ ہولیا تھا۔ بھاگتے تھاگتے مڑی اور اسی' مستزی سے آتی ہوئی کرولا سے ٹکرا کر گر پڑی ڈرائیور کرنے والے نے بڑی مشکل سے بریک لگا کر اسے بچایا تھا ورنہ ٹاپ گیئر پہ موٹیل کی رفتار دوڑتی بھاگتی گاڑی اس کے نازک وجود کو ریزہ ریزہ کرتی گزر جاتی۔"

"کیا آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے سن۔"

شاہین چکراتے ہوئے سر کو تھامے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی جب ایک پختہ عمر کا بارعب اور پروقار نظر آنے والا گرے سوٹ میں ملبوس سوبر مرد اس کے قریب آ کر جھکا۔ اس کے جھکنے سے ایک سحر انگیز خوش بو نے اس کا احاطہ کر لیا۔

"شکر ہے خیریت گزری۔ اٹھیے اب۔" مرد کے جھلائے ہوئے انداز میں بھرپور نفاست اور متانت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے سہارے کے لیے دایاں ہاتھ بڑھایا تو شاہین بلا سوچے سمجھے اسے تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی تھیں آپ اور کہاں رہتی ہیں۔"

وہ غالباً اس کی مدد کرنے میں سنجیدہ تھا۔ یا اپنے فطری مہذب پن سے مجبور تھا کہ چوٹ کھائی ہوئی لڑکی کو ٹھکانے تک پہنچانا فرض خیال کیا تھا۔

شاہین نے غور سے اس کا شاندار اور بھرپور سراپا دیکھا۔ مرد کے ایک ایک انداز میں بردباری' وقار اور مردانگی کی پختگی نمایاں تھی کسی حد تک نقوش مانوس سے لگے۔ یوں جیسے کسی شناسائی کی ہلکی سی رمق محسوس ہو۔ ان صاحب پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ شاہین کے کم سن و نامراد ذہن نے اسے نجات دہندہ ہی تصور کیا تھا۔

"مجھے یہاں سے لے چلیں۔ میں کچھ آگے جا کر اتر دوں گی۔" وہ عجلت سے بولی۔

"آیئے۔" اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ شاہین کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں کیا کر رہی ہوں۔ کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے؟ کیا کروں' کہاں جاؤں۔ بہت سے خیالات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ یوں الگ رہا تھا ذہن کہیں اڑا اڑا پھر رہا ہے۔ کوئی خیال صحیح سے جم نہیں پا رہا تھا۔

یہ تو اس نے پلٹتے ہوئے دیکھ ہی لیا تھا کہ عدنان بابا جان کے اشارے پر گاڑی روکنے کے بعد نیچے اترا تھا یقیناً اسی کی طرف بڑھا تھا کہ وہ بھاگ پڑی۔

گویا اس کا بھاگنا بابا جان اور عدنان دونوں کی نظر میں تھا۔ وہ کس طرح اپنی صفائی دے سکے گی۔ حالات ہر لحاظ سے اسے مجرم بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ بابا جان نے دو تین بار ناصر کو اس کے آس پاس دیکھا تھا وہ جانے کس طرح اب تک ضبط کیے ہوئے تھے اور کیا سوچ کر کل روک کر پوچھ گچھ نہ کی تھی مگر آج تو حد ہوگئی تھی۔ اسے اس وقت کالج بس میں ہونا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس وہ ایک بالکل انجان اور روٹ سے الگ جگہ پر لڑکے کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ چونکہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اسی لیے باپ اور بھائی کو دیکھ کر مجرموں کی طرح بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

شاہین نے گہری سانس لی۔

وہ گھر میں جا کر کس منہ سے اپنی بات کا یقین دلائے گی!

کیا ثبوت پیش کرے گی کہ وہ کیا لینے گئی تھی اس جگہ پر غیر ارادی طور پر اس نے گھٹنوں پہ رکھے بیگ کو ٹٹولا۔

ثبوت تو اندر پڑا تھا۔

"کہاں جانا ہے آپ کو۔" بالآخر وہ صاحب تنگ آ کر پوچھنے لگے۔ شاہین نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ تو ایف سیون کی طرف آ گئے تھے۔

"م' میرا گھر پیچھے رہ گیا ہے۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں چونک کر بتانے لگی۔

"ادھر انڈسٹریل ایریا کی طرف موڑ لیجیے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ وہاں سے تو بہت نزدیک تھا۔" وہ جھلاہٹ کی آخری حدوں پر تھے۔ پیشانی پر لاتعداد شکنیں نمودار ہوگئی تھیں۔ بڑبڑاتے ہوئے لامحالہ گاڑی واپس موڑی۔

"آپ پر افتاد کیا پڑی ہے محترمہ! عجیب پاگلوں کا سا بی ہیو کر رہی ہیں۔" وہ چبھے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

"جج جی جی کچھ نہیں۔" وہ سر جھکا کر بیگ کی زپ کھولتے ہوئے کسی سوچ کے عفریت سے الجھ رہی تھی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کب بیگ کی زپ کھلنے سے ہیروئن کے دونوں پیکٹ گاڑی کے فرش پر گر پڑے۔ خبر تو تب ہوئی جب ان صاحب نے اچانک گردن موڑ کر دیکھنے کے بعد جھک کر انہیں اٹھایا۔

"یہ یہ کیا ہے۔" وہ بے یقینی سے کبھی پیکٹ اور کبھی اس معصوم کمسن نظر آنے والی بے وقوف سی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔

"یا خدا۔" شاہین کا چہرہ سفید ہوگیا۔

"یہ تو ہیروئن ہے۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ شاہین کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

"بتاؤ۔ یہ کہاں سے لیے ہیں تم نے؟" ان کا لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ "تو تم اس کیریکٹر کی لڑکی ہو۔" وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ انہوں نے ایک نسبتاً سنسان جگہ پہ گاڑی روک لی۔

"سچ سچ بتاؤ لڑکی! کون ہو تم اور کیا دھندا کرتی ہو۔ بتاؤ ورنہ میں اگلی پولیس چوکی پر گاڑی روک کر تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" لہجہ اتنا تند اور سرد و بے رحم تھا کہ اس کا ننھا سا دل تاب نہ لا سکا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر اسی طرح روتے ہوئے بچوں کے سے انداز میں مختصراً سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"میری بہن ایک بری عورت کے چنگل میں پھنس کر ہیروئن کی عادی ہوگئی تھی جب گھر والوں کو پتا چلا تو اسے باندھ کر گھر میں قید کر لیا۔ اس کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی ہر وقت اپنا جسم نوچتی رہتی تھی اور نشے کے لیے گڑگڑاتی تھی مجھ سے رہا نہیں گیا اس کے کہنے پر اس کی بتائی ہوئی

جگہ پر پڑیاں لینے چلی گئی۔"

"کہاں رہتی ہو تم۔" وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ "اپنا اپنے والد کا نام اور پورا ایڈریس بتاؤ۔ تمہاری بہن کا کیا نام ہے۔" وہ پوری طرح تفتیش کر رہے تھے جیسے اس کے بیان کی سچائی کا اندازہ لگانا چاہتے ہوں۔ شاہین نے نجات پانے کے لیے بتا دیا۔ ایڈریس سنتے ہی وہ بری طرح چونک گئے اور اسے یوں گھورنے لگے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں۔

"کیا تمہاری کسی بہن کا نام ارشین بھی ہے وہی جو کسی زمانے میں ایک مشہور مصورہ رہی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ہوں۔" انہوں نے سر تا پا اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نظروں میں شیطان ناچنے لگا۔

ارشین بخاری سے انتقام لینے کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہوگا کہ اس کی بہن کو برباد کر دیا جائے۔ ایک کو تو لیلیٰ شاہ ہیروئن کی لت ڈال کر نشان عبرت بنا ہی چکی ہے۔

"دیکھو مائی سویٹ بے بی۔" دفعتاً ان کا لہجہ بدل گیا۔ گھاگ شکاری مصلحتاً مشفق و خلیق مربی کے لبادے میں چھپ گیا۔

"تم جانتی ہو آج کل ویسے بھی اس ایریا میں پولیس ناکہ بندی کر کے پرائیویٹ گاڑیوں کی چیک کر رہی ہے۔ ایسے میں اگر چیکنگ ہوئی تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی پھنسوں گا کہ بہرحال ہیروئن میری گاڑی سے برآمد ہوگی۔"

"تو پھر۔" شاہین نے خوفزدہ ہو کر ان کی صورت دیکھی۔

"تو پھر یہ کہ فی الحال آپ میرے ساتھ چلیے میں آپ کو کسی محفوظ جگہ پہ پہنچا دیتا ہوں۔" انہوں نے گاڑی دوبارہ موڑ لی۔

"مگر مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ بے چینی سے گھڑی کی سوئیاں دیکھنے لگی۔ وہ پہلے ہی تقریباً پون گھنٹے لیٹ ہو چکی تھی۔

"میرا مشورہ مانیں تو ایسی صورت حال میں گھر نہ جائیں۔ بقول آپ کے آپ کے والد اور بھائی آپ کو اس بدنام زمانہ جگہ پر گھومتے پھرتے دیکھ چکے ہیں۔ دوسرے آپ کو ایک غنڈے

سے الجھتے دیکھ کر غلط فہمی کا شکار بھی ہیں۔ ایسے میں عین ممکن ہے کہ آپ گھر پہنچیں تو ان کے شدید غیض وغضب اور تشدد کا نشانہ بنیں آپ کچھ دیر ٹھہر کر گھر جائیں تو بہتر ہوگا۔"

ان کی شکل پہ تحریر سنجیدگی کی لکیر کو پڑھتے ہوئے شاہین نے یونہی سر ہلا دیا مگر درون دل وہ سخت مضطرب تھی۔ جتنی دیر ہوگی وہ اتنا ہی آگ بگولہ ہوں گے۔

یا خدا میں کیا کروں۔

اسے اپنا آپ کسی اندھے کنوئیں میں گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

پروفیسر مہدی بہت دیر تک گاڑی ادھر سے ادھر دوڑاتے رہے۔ پھر وہ پنڈی کی طرف ہو لیے اور لاہور جانے والی شاہراہ پر گاڑی ڈال دی۔ وہ سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بے آواز روتی رہی۔

وہ ڈھائی پونے تین بجے گھر آ جاتی تھی۔ پہلے چار بجے اور پھر پانچ پھر اس نے جیسے کسی بھیانک خواب سے جاگ کر سر اٹھایا۔ اردگرد شام کے گہرے سائے تھے اور سڑک کے دونوں اطراف پھیلی اونچی نیچی جھاڑیوں سے لدی پہاڑیوں اور ٹیلے۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ میرے خدایا شام ہو گئی ہے اور اور اب تک میں گھر سے باہر ہوں۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

"ریلیکس، ریلیکس بھئی۔ ابھی واپس چلتے ہیں۔" ابھی تک ان کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہ رہے تھے۔

"واپس۔" شاہین کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے جھرجھری سی لے کر ان کی آستین پکڑ لی۔

"نہیں بھائی صاحب۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔"

"کیا مطلب۔"

"واپس جا ہی نہیں سکتی۔" احساس بیچارگی اسے رلائے دے رہی تھی۔

"جاؤں گی تو بابا جان مجھے مار ڈالیں گے۔ میرے اتنے سارے گناہ ہیں۔ آخر۔ اگر مجرم نہ ہوتی تو کیوں بھاگتی وہاں سے وہ کہیں گے تین گھنٹوں سے کہاں تھی میں کیا کر رہی تھی۔ کس کے ساتھ تھی۔ اف اللہ مجھے سے کتنی بڑی حماقت ہو گئی۔ کیسا پردہ پڑ گیا تھا میری آنکھوں کے آگے۔

کیوں میں نے امبر باجی کی بات مانی۔"

وہ اس قدر شدتوں سے روئی کہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ پروفیسر دانیال کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ اس وقت جہلم کے آس پاس تھے۔ قریبی ہسپتال لے جانے اور شاہین کے ہوش میں آنے تک رات کے آٹھ بج گئے۔

وہ ہوش میں تو آ گئی مگر صدمے کی شدید کیفیت نے عارضی طور پر اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مخدوش کر دیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس دوران پروفیسر صاحب بھی لائحہ عمل ترتیب دے چکے تھے۔

"آؤ چلیں۔" حیرت انگیز طور پر شاہین نے ان سے گھر جانے کے لیے نہیں کہا چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

جیسے اب اسے اپنے انجام کی کوئی فکر نہ رہ گئی ہو۔

پروفیسر صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ واپس چھوڑنے کا کام تو انہوں نے یوں بھی نہیں کرنا تھا' بھلے سے اس کے لیے انہیں اس سے زبردستی ہی کرنی پڑتی۔ یہ تو قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ شدید خوف وہراس اور دہشت سے مغلوب ہو کر شاہین کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ وقتی طور پر اس کا خود پر سے اختیار ختم ہو گیا تھا۔

وہ اسے لاہور لے آئے اور پی سی میں کمرہ بک کرانے کے بعد اسے باہر ہمراہ لیے نشے سے سرشار قدم بڑھاتے لفٹ میں داخل ہو گئے۔ احساس فتح مندی سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ارشین بخاری کی کم سن بہن کو راستے سے بھٹکا کر بربادی کے اندھیروں میں گھسیٹ لانے کا تصور انتقام کے بہت سے شعلوں پر چھینٹے ڈالنے لگا تھا۔

"بھگتو ارشین بخاری۔ بھگتو یہ عذاب۔ اٹھاؤ ذلت ورسوائی کے انبار۔ تمہیں بھی تو پتا چلے کہ پروفیسر دانیال مہدی جیسے شخص کو ٹھکرانے اور دھوکا دینے کی کیا سزا ہوتی ہے۔"

☆☆☆☆☆

ولیمہ بخیر وخوبی نپٹ گیا تو نجمی نے کسی نہ کسی طرح مہران کو ہنی مون ٹرپ کے لیے شمالی علاقہ جات روانہ ہونے پر آمادہ کر ہی لیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر پھر زندگی معمول پہ آ گئی۔ سفیان کو ایک بہت اچھی جگہ جاب ملی تو نجمی کے کہنے پر مٹھائی لے کر ناریہ کی طرف آیا۔

بیل کی آواز پر فاریہ نے دروازہ کھولا۔ گرے شلوار قمیض میں ملبوس سفیان کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ الٹے پاؤں دوڑتی ہوئی اندر آ گئی اور کچھ سوجھا ہی نہیں تھا۔

"ہماری صورت اب اتنی بری بھی نہیں ہے کہ برداشت نہ کی جا سکے۔" وہ کھلے دروازے سے اندر آ گیا اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس کا سراپا جانچنے لگا۔

"اسی دن کے لیے ہم نے اول روز پوچھ لیا تھا کہ "پیس" اوکے ہے یا۔ بائی رادے۔ یہ آپ کے ہاتھ پاؤں کیوں کانپ رہے ہیں؟"

وہ راہداری میں رکھے صوفہ سیٹ پر نشست سنبھالنے کے بعد فراغت و استحقاق سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔

سادہ طبع فاریہ کی جان پر بنے لگی۔

"وہ مما پاپا گھر نہیں ہیں۔" وہ بمشکل بولی۔

"لیکن میں تو ان سے ملنے نہیں آیا۔" وہ اس کی بوکھلاہٹ کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ انداز نشست ایسا تھا جیسے طویل مدت تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ لیکن اس کی سمت دیکھ نہ سکی۔

"گھر پر اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔" کہو گر ما دینے والی ان نظروں میں جانے کیا تھا کہ اس کا چہرہ یکلخت دہک اٹھا۔ وہ ہنس پڑا۔

"ترغیب دینا تو اچھی بات نہیں ہے جانم۔ کیوں پٹڑی سے اتارتی ہو۔ مبادا دل آج ہی رخصتی کے لیے مچل جائے۔" اس کی آواز میں شرارت کا خمار تھا۔

"سفیان۔" وہ رونے والی ہو گئی۔ وہ اسے کس قدر ستا رہا تھا۔ وہ پھر آہستگی سے ہنس دیا۔

ارشین کی وجہ سے احساس جرم اس درجہ اعصاب پر حاوی تھا کہ وہ اپنی چھوڑ بھائی کی خوشی کو بھی خوشی کی طرح محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا۔ صحیح معنوں میں وہ آج پہلی بار اس سے منکوحہ کی حیثیت سے متعارف ہو رہا تھا۔

سرخ ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں چنری کا ڈوپٹہ غیر ارادی طور پر شانوں پہ درست کرتی حیا و بے بسی کا انداز لیے اس پیاری سی لڑکی کو وہ بے اختیار بار بار دیکھ رہا تھا۔

نئی کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا انتخاب سفیان نے کلی طور پر عقلی بنیادوں پر کیا تھا

لیکن اب محسوس ہو رہا تھا' دماغ کے فیصلے نے دل تک بھی سرنگ کھود ڈالی تھی۔ یا شاید نکاح کے بولوں سے منسلک قدرتی اپنائیت و قربت کا احساس خود بخود دل میں لطیف جذبات جگا دیتا ہے۔

"کب تک "اٹین شن" حالت میں کھڑی رہو گی۔ بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر پھینکی۔ فاریہ کافی فاصلے پر رکھی کرسی پر بحالت مجبوری ٹک گئی۔ سفیان نچلا ہونٹ دبا کر بے ساختہ مسکرا دیا۔

"دروازے کے قریب رکھی یہ کرسی غالباً "حفاظتی زون" میں شمار ہوتی ہے جو آپ نے اس کا انتخاب کیا ہے۔" وہ شرارت بھرے انداز میں مخاطب ہوا۔ "حالانکہ سوچنے کی بات ہے جو یہاں تک آ سکتا ہے وہ ان فاصلوں کو بھی پاٹ سکتا ہے۔" وہ اس کی سٹپٹائی ہوئی کیفیت سے جی بھر کر حظ اٹھا رہا تھا۔

فاریہ کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔ اس کی تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی پزل اور کنفیوژ کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے بے چارگی سے سفیان کی طرف دیکھا۔

"حد کرتی ہو تم بھی یار۔" سفیان کو اپنا قہقہہ روکنا دشوار ہو گیا۔

"ہم کوئی اجنبی تو نہیں ہیں۔ اتنا کیوں گھبراتی ہو۔ عمر بھر کا ساتھ ہے۔ آخری سانس تک مشترکہ رفاقت رہے گی انشاء اللہ بہت سی رازداریاں ہوں گی ہمارے بیچ۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ کچھ بتانا پوچھنا ہے۔" اس کی سنجیدگی فاریہ کو حواسوں میں لانے کا سبب بن گئی۔ وہ قدرے اعتماد سے اس کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"تم ارشین آپا کو جانتی ہو۔ ان کی بہن امبرین تمہاری کلاس فیلو رہی ہے؟"

فاریہ ٹھٹھک کر سفیان کی صورت دیکھنے لگی۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ امبرین مزاج اور کردار کے اعتبار سے کس قسم کی لڑکی تھی؟"

"وہ ارشین آپی کی بہن تھی اور انہیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

فاریہ اچنبھے سے بولی۔

"کسی کے تعارف کے لیے محض رشتے کا حوالہ کافی نہیں ہوتا۔ ہر شخص فطرتاً اور مزاجاً دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ میری اور مہران بھائی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ بہرحال میں تم سے کچھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا آئینہ ہونا چاہیے۔ چھپی ہوئی باتیں

بدگمانی کو جنم دیتی ہیں۔ پوشیدگی بعض معاملات میں بہت بڑا جرم بن جاتی ہے اور ناقابل تلافی پہنچاتی ہے۔ گو کہ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے مگر پھر بھی میں تمہیں بتانا چاہوں گا۔"

فاریہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ارشین آپا کا میری زندگی میں ایک خاص مقام رہا ہے۔ جب ان کے حوالے سے ان کی بہن سے اتفاقاً سامنا ہوا تو وہ مجھے اچھی لگنے لگی۔ میں نے نجی کے پوچھنے پر اپنی پسند بتائی مگر انہوں نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ اس کی خبر امبرین کو ہوئی تو اس نے بڑے سلجھے اور گرے ہوئے انداز میں سماج سے بغاوت کر کے شہر سے بھاگ جانے کی تجویز پیش کی۔ اس لمحے مجھے ادراک ہو گیا کہ میں جسے ہیرا سمجھتا تھا وہ عام سا بے قیمت پتھر ہے۔ میں نے اسے دھتکار دیا اور نجی کی پسند پر سر جھکا دیا۔ کچھ عرصے پہلے مہران بھائی نے ایک آپریشن کے بعد انکشاف کیا کہ امبرین کو ایک ہیروئن اسمگلر کے لھکانے پر نشے میں دھت گرفتار کر کے تھانے لایا گیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو وہ شروع سے ایسی تھی یا پھر کسی کے جال میں پھنس کر منشیات کے دھندوں میں پڑی؟"

فاریہ کے چہرے کا رنگ لمحہ بہ لمحہ متغیر ہو رہا تھا۔ امبرین سے اظہار پسندیدگی کی ایک انوکھا انکشاف تھا' تاہم وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی اور اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ پارٹنرشپ میں ماضی کے واقعات کے حوالوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل اہمیت آج اور اس سے منسلک سچ کی ہے۔ حالیہ رشتوں اور ان کے خلوص کی ہے۔ ماضی تو بس ماضی ہے۔

"میں اس کی فیملی کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی' تاہم اتنا ضرور علم ہے کہ اس کے والدین روایتی اور دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں۔ وہ خواتین کی آزادی کے قائل نہیں ہیں۔ کسی حد تک تنگ نظر اور انتہا پسند بھی کہا جا سکتا ہے البتہ امبرین کو ارشین آپا کی سپورٹ حاصل تھی۔ وہ اپنی فیملی سے بہت مختلف تھیں پھر اچانک ان کی شادی کی خبر سنی گئی۔ امبرین گھر کی سخت اور گھٹن زدہ فضا سے تنگ آ کر مناسب رہنمائی و شفقت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے غلط راستوں پر چل نکلی۔ میرا اس سے رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو چکا ہے۔ کچھ وجوہات کی بناء پر امبرین نے مجھ سے دوستی ختم کر لی تھی۔"

سفیان خاموش ہو کر سوچنے لگا۔

"ایک بات پوچھوں؟" فاریہ کی آواز نے سناٹا توڑا۔

"ہوں۔" سفیان چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا مہران بھائی کا دوسری شادی کا اقدام محض انتقامی کارروائی نہیں لگتا؟"

"وہ کس طرح؟"

"اگر وہ نایاب بھابھی کو اتنا ہی پسند کرتے تھے تو وہ ایک عرصے سے ان کے آفس میں کام کر رہی تھیں۔ یہ شادی بہت پہلے ہو جاتی۔ کہاں یہ کہ آناً فاناً فیصلہ ہوا اور پھر اس عمل پر درآمد بھی ہو گیا۔ اس سے یہ احساس ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے ارشین آپا کو ذہنی اذیت سے دوچار کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ قدم اٹھایا۔ آپ نے دیکھا ہے' وہ اس شادی سے خوش نظر نہیں آتے۔ اگر یہ محبت کی شادی تھی تو ان کے رویے اور انداز و حرکات میں تبدیلی آنا لازمی امر تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ پرسوں اوہ اور نایاب بھابھی بھی ہمارے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ میں نے غور سے ان کی ایک ایک حرکت اور انداز کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے ان کا بھابھی کے ساتھ رویہ مشینی اور رسمی سا لگا۔ وہ بے ساختگی اور بشاشت و بے تکلفی نظر نہیں آئی جو من پسند رشتے کا خاصا ہوا کرتی ہے۔"

یہ بات خود سفیان نے بارہا محسوس کی تھی تاہم فاریہ کی زبانی سن کر دلی مسرت ہوئی۔ یہ ذہنی ہم آہنگی ایک خوش آئند مستقبل کی علامت تھی۔

"بے تکلفی و بے ساختگی کا یہ مظاہرہ ہمارے درمیان بھی ہونا چاہئے کہ رشتہ تو وہی ہے۔"

سفیان نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اس کے قریب آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی یا کہتی' اس نے تیزی سے اس کا دایاں ہاتھ تھاما اور ہونٹوں سے لگا کر اسی نوعیت سے چھوڑتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر واپس پلٹ گیا۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ کس بری طرح حجاب کے دائرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

سوشل ڈائجسٹ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر گزشتہ ماہ سے اس کے تقریباً نصف سے زائد صفحات رنگین کر دیئے گئے تھے۔ اسی حساب سے ارشین کا کام بڑھ گیا تھا۔ اب اسے ایکچز' پینٹنگ اور کیلی گرافی کے ساتھ ساتھ ان میں کلرنگ کمپی نیشن بھی تیار کرنا ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ عرب بدوؤں اور صحارا کے صحرا میں سفر کرنے والے صحرا نوردوں کی ایک دلچسپ داستان سے متعلقہ تصویر بنا رہی تھی۔ پوسٹر کلرز کی بہت سے شیشیاں اور برش ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

اونٹوں کا ایک قافلہ صحرا سے گزرتا دکھانا تھا۔ وہ پورے انہماک سے اپنے کام ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کام کے بعد اسے بچوں کے لئے مخصوص صفحات میں اس ماہ شامل کی جانے والی کہانی کی ایک دو تصویریں بنانا تھیں۔ طنز و مزاح کے صفحے میں کچھ مزاحیہ کارٹون ترتیب دینے تھے۔ یہ کام وہ گھر لے جا کر کرنے کا سوچ رہی تھی۔

"جمیل صاحب! کچھ صفحات "داستان" کے لئے بھی رکھیئے گا۔" داور جمیل کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ "آپ کی کون سی داستان ہے صاحب!" جمیل صاحب ہنسے۔

"ارے جناب بڑی ایکس کلوسیو سٹوری بنانے آیا ہوں اسلام آباد سے۔ باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ یہاں آس پاس منشیات کا ایک بہت بڑا مرکز ہے جہاں سے سرحد پار سمگلنگ کا کام دن رات جاری ہے۔ میں اخبار سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ خاص الخاص اس مقصد کے لئے۔" آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ "بہت گرمی ہے بھئی یہاں۔" وہ آتے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پنکھا تیز کرنے کا اشارہ کیا۔

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی پلاؤ برخوردار۔" ملازم لڑکا ظہیر لپک کر پانی کا جگ لے آیا۔

"مئی کا آخری ہفتہ جا رہا ہے جناب۔ گرمی تو لازم ہوگی۔ بڑے شہروں میں سہولیات کی وجہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوتا مگر چھوٹے موٹے قصبوں اور خاص کر پنجاب کے دیہاتوں میں دوزخ کی آگ کا تجربہ خوب کیا جا سکتا ہے۔" جمیل صاحب پان منہ میں رکھتے ہوئے ہنسے۔

"یہ کون ہیں؟" تب ہی داور کی نظر کونے میں کرسی اور ڈیسک پر مصروف عمل خاتون پر پڑی۔ ارشین کی اس کی طرف پشت تھی۔

"پچھلی مرتبہ تعارف تو کروایا تھا عالی جاہ۔ یہ آرٹسٹ ہیں ہمارے رسالے کی۔" ارشین اپنا تذکرہ سن کر قدرے مڑی تو داور کو یاد آ گیا۔

"اوہ۔ یاد آیا۔ کیا حال ہیں مس آپ کے۔" نام اس کے ذہن سے نکل گیا تھا اس لئے یونہی کام چلایا۔

ارشین نے خاموشی سے سر ہلایا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔

پانی کے دو ٹھنڈے گلاس چڑھانے کے بعد داور جمیل صاحب زور و شور سے میگزین سے متعلق مالی و انتظامی امور اور مواد کے انتخاب کے بارے میں بحث میں مشغول ہو گئے۔ وہ رنگوں

کی شیشیاں کھنگالتے ہوئے اونٹوں کے اندر بھرنے کے لئے ملتا جلتا رنگ ڈھونڈ رہی تھی۔

"اگر پیور رنگ نہیں ملتا تو کوئی سے دو رنگوں کو ملا لیں شاید بات بن جائے۔" اچانک پشت سے آواز آئی۔

وہ ہڑبڑا کر پلٹی۔ اسی اثناء میں وہ ڈیسک کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھی کہ بحث ختم ہونے اور جمیل صاحب کے کسی کام سے ہال کمرے سے باہر جانے کا پتا نہیں چلا تھا۔

"کبھی دو رنگ یا دو چیزیں مل کر ایک نئے اور خوبصورت روپ کو جنم دیتی ہیں اور کبھی مل کر اپنی افادیت و انفرادیت بھی کھو بیٹھتی ہیں۔"

وہ برش صاحب کرتے ہوئے کسی سوچ میں گم ہو کر بولی۔ اس کے لب و لہجے میں عجیب سی بے دھیانی تھی تاہم انداز میں سکون اور ٹھہراؤ واضح محسوس کیا جا سکتا تھا۔ داور چونک کر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

"آپ کوشش کریں تو لکھ بھی سکتی ہیں۔ ادارے کے لئے دہرا فائدہ ہو جائے گا۔ کیا آپ کو لکھنے لکھانے میں دلچسپی ہے؟"

"نہیں۔ اور اگر ہوتی بھی تو میں اپنے پیشے سے غداری نہ کرتی۔" وہ احتیاط سے رنگ جما رہی تھی۔ "ایک وقت میں ایک ہی تخلیقی کام سے انصاف کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں جیسے ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھی جا سکتی ہے۔" داور کرسی گھسیٹ کر ڈیسک کے پاس آیا اور جم کر بیٹھ گیا "ایک نیام میں دو تلواریں رہ بھی سکتی ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

ایک لمحے کو ارشین کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں جت گئی۔

زخم کریدنے سے کیا حاصل ہے۔

داور اسے اور اس کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کب سے کر رہی ہیں آپ یہ کام۔" اس کی سنجیدگی اسکی خاموشی اس کی سادگی اور اس سادگی و سنجیدگی میں جھلکتی پختگی و بے ساختگی نے اس کے عام سے سراپے کو عجیب سا انوکھا وقار اور متانت عطا کر دی تھی۔ داور بے ساختہ اس کی ذات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس میں کچھ تھا جو دوسروں سے مختلف تھا۔ کوئی غیر معمولی چیز۔ کوئی الگ سا انداز۔ شاید اس کی آنکھوں کی سرخیوں

میں رچے دکھ کی کیفیت۔ یا پھر بظاہر خاموش چہرے پر لکھی چیختی ہوئی محرومیاں۔ کچھ تو تھا جو اسے اپنی طرف متوجہ کر گیا تھا۔

داور کو وہ ایک ایسے ٹھہرے ہوئے سمندر کی مانند لگی جس کی آغوش میں لاتعداد بپھری ہوئی موجیں چنگھاڑ رہی ہوں۔ وہ ایک ایسا گھنا جنگل تھی جس کے سناٹے میں تند و تیز ہواؤں کا آسیبی شور ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

"ایک مدت گزر گئی....." وہ جواب دینے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی مکمل کر رہی تھی۔ "اب تو یوں محسوس ہوتا ہے پالنے سے کاغذ اور برش کا کھیل کھیل رہی ہوں۔"

اس کے لب و لہجے میں جو نفاست اور سلجھاؤ تھا' وہ مقامی افراد سے میل نہیں کھاتا تھا۔ داور نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی۔

"کیا آپ شروع سے یہاں اس علاقے میں رہتی ہیں؟"

"نہیں جی! کچھ عرصہ ہوا ہے اندازاً ایک ڈیڑھ سال۔" وہ ایک تصویر کا کام مکمل کر چکی تھی اور دوسری پشت پر آؤٹ لائن بنا رہی تھی۔

"گاؤں میں کس کے پاس رہتی ہیں؟" داور کے لئے یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ گویا وہ کسی عزیز رشتے دار کے ہاں قیام پذیر تھی۔

"اپنے گھر میں۔" اپنا جواب اسے خود ہی اجنبی لگا۔

"مگر آپ تو کہہ رہی ہیں' یہاں آئے ایک ڈیڑھ برس گزرا ہے۔" داور کھوجنے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ آخر کرائم رپورٹر تھا۔ سٹوری کا "اصل مسالہ" جانے بغیر خبر کی بنیاد کیسے کھڑی کر سکتا تھا۔

"اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے شائستگی سے معذرت کر لی۔ داور دیکھ کر رہ گیا۔

"پیچھے سے کس علاقے سے تعلق ہے آپ کا؟" وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے کترا رہی ہے۔

"اسلام آباد سے۔" اس سے مختصر جواب اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

"اسلام آباد؟" وہ پہلے متحیر اور پھر پرجوش ہو گیا۔ "واؤ۔ کیا سرپرائز ہے۔ بھئی میں بھی

وہیں رہتا ہوں۔"

"جی۔ جمیل صاحب نے غائبانہ تعارف کروایا تھا۔" اسے مروتاً کہنا پڑا۔ "غالباً کسی اخبار میں کرائم رپورٹنگ کرتے ہیں۔"

"درست۔" پھر وہ دوبارہ اس کی کھوج میں لگ گیا۔ "میں نے آپ کو ڈاکومنٹس نہیں دیکھے۔ وہ جمیل صاحب کے پاس محفوظ ہوں گے اس لئے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ آپ کی تعلیم کتنی ہے اور کس ادارے سے حاصل کی ہے۔"

ارشین نے آؤٹ لائن بنا کو مطلوبہ اسکیچ ترتیب دیا اور پھر قلم رکھ کر اس کی سمت مڑی۔

"آپ کی مجھ سے دوسری ملاقات ہے اور اب گزشتہ بیس منٹ سے ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ نے اب تک میری ذات اور کارکردگی کے متعلق کوئی نہ کوئی اندازہ ضرور لگایا ہوگا' کیا تعلیمی نوعیت جاننے کے بعد اس قائم شدہ اندازے میں کسی تبدیلی کا امکان ہے؟"

"نہیں۔ لیکن تعلیمی خانہ بہرحال انسانی شخصیت کے تعارف کا اہم جزو تصور کیا جاتا ہے۔" داور کے لہجے میں اصرار تھا۔

"سر! آپ کا فون ہے اسلام آباد سے۔" ظہیر نے عجلت میں اطلاع دی۔

وہ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے کام سمیٹا اور تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

"کیا ہوا تمہارے بابا جان کو؟" عدنان نے سہارا دے کر بخاری صاحب کو گاڑی سے نکال کر لاؤنج کے تخت پر بٹھا دیا۔ صباحت سامنے والے سوڑھے پر چاول چن رہی تھیں۔ یہ افتاد دیکھ کر گھبرا کر تھال سمیت کھڑی ہو گئیں۔

"وہ گھر آئی ہے کیا؟" عدنان کی سرخ آنکھیں' تیوریوں کے خطرناک بل اور بھینچا ہوا دھیما لہجہ کسی ناگہانی آفت کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"خیر تو ہے ناں۔" صباحت نے کلیجہ تھام لیا۔ ان کا تیز تیز دھڑکتا دل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

"کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

"شاہین کدھر ہے؟"

"شاہین! وہ تو ابھی کالج نہیں لوٹی۔" کسی بری اور تکلیف دہ خبر کے پیش نظر قبل از وقت ان کا دل ڈوبنے لگا۔

"اور لوٹے گی بھی نہیں۔" بابا جان کا سانس پھول رہا تھا۔ "اس گھر کی بیٹیوں کو گھر لوٹنے کی عادت نہیں ہے۔ انہیں گھر سے باہر کے رستے اچھے لگتے ہیں۔"

"اب کیا ہو گیا؟" بی بی جان موڑھے پر ڈھے گئیں۔

"عزت کے چوبارے کا آخری کنگرا بھی گر گیا ہے۔ یہ ہے آج کی خوشخبری۔" وہ سینہ مسلتے ہوئے نڈھال ہو رہے تھے۔

"بی بی جان! میں سائرہ کے ساتھ گلی میں کھیل لوں؟" دس گیارہ سالہ ثمرین اپنی دھن میں بھاگتی ہوئی آئی تھی پھر بابا جان اور بھائی کو بیٹھے دیکھ کر ایک دم سہم کر رک گئی۔

"ہاں ہاں جاؤ تم بھی۔" بابا جان نے اس کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا۔

"جاؤ شاباش! تم کیوں پیچھے رہو۔ تو بھی ان کی پیروی کرو۔ جاؤ سب کی سب جاؤ۔" انہوں نے ہار کر اپنا سر تھام لیا۔

ثمرین ہراساں ہو کر اندر بھاگ گئی تھی۔

"میں تم سے کہتا تھا ناں بیٹیاں منحوس ہوتی ہیں۔ عزت و آبرو کی دشمن ہوتی ہیں۔ لاکھ کے آدمی کو راکھ بنا دیتی ہیں۔ نہیں مانتی تھیں تم۔" ان کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

"شاہین کہاں گئی ہے۔؟" صباحت کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

"میں نے دو تین دفعہ اس لڑکے کو اس کے آگے پیچھے دیکھا تھا مگر شک کے یقین میں بدلنے سے پہلے حالات کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ وہ بڑی دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ چھوٹی موٹی اور گھریلو سی۔ سوچا کہیں اندازے کی غلطی معاملہ نہ بگاڑ دے۔ اس لئے چپ سادھ لی۔ مگر نہیں عورت وہ بلا ہے جس کو جتنی آزادی دو گے اتنا ہی زیادہ شب خون مارے گی۔ وہ آج اسکے ساتھ اڈے پر پہنچی ہوئی تھی۔ خدا جانے شہر چھوڑ کر جا رہے تھے یا گھوم پھر رہے تھے۔ عدنان تم اس بدبخت چھوکرے کا پتا چلاؤ اسی سے کچھ سراغ مل سکے گا۔ میں ان دونوں کا خون کرنے کے بعد ہی خود کو گولی ماروں گا۔"

عدنان کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

بابا جان تخت پر گر گئے تھے۔ بی بی جان نے ثمرین کو بلا کر تکیہ منگوایا اور ان کے سر کے نیچے رکھ دیا۔

"میری گولیاں لا دو۔" وہ میڈیسن لے کر آہستہ آہستہ ہوش و حواس سے غافل ہو گئے۔

ثمرین اندر کسی کونے میں دبک گئی تھی۔ امبرین اپنے کمرے میں نشے کے لئے تڑپتی ہوئی رسیوں میں بندھی اپنا آپ نوچ رہی تھی۔ عدنان کی برادرانہ غیرت اسے کشاں کشاں شہر کی گلیاں چھاننے کے لئے باہر لے گئی تھی۔ گھر میں سناٹے کا بھوت ناچ رہا تھا۔ ایک ایسا سناٹا جو کسی قیامت خیز خبر کا پیش خیمہ بننے والا تھا۔

شام گہری ہوتی گئی اور بخاری لاج کے در و دیوار بدنصیبی کے سیاہ رنگوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ رات دس بجے عدنان بکھری ہوئی ناکام کیفیات چہرے پر ثبت کئے بالآخر گھر واپس آ گیا۔

بی بی جان اس کا چہرہ پڑھ کر بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

ذلت، بدنامی، رسوائی۔

ان مرحلوں سے وہ بار بار گزرے تھے۔

پہلی مرتبہ اس وقت جب پروفیسر دانیال نے ارشین کے ہاتھ کا لکھا اقرار نامہ منہ پر مارا تھا۔

دوسری مرتبہ جب امبرین کی بارات شادی سے دو دن پہلے کینسل ہو گئی تھی۔

تیسری مرتبہ اس وقت جب تھانے سے نشے کی لت میں گرفتار جوان بیٹی کو وصول کیا تھا۔

اور چوتھی مرتبہ آج جب شاہین کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔

"میں اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹوں گا۔ خدا کی قسم میں خود کا نوں گا اس کے سانس کی ڈوری۔ اب تو اس کے بعد ہی چین پڑے گا۔" بابا جان ہانپ رہے تھے۔

"دھیان سے، کہیں سیڑھیوں سے پھسل نہ جائیں۔" ان کا رخ اوپر کی طرف اوپر کی طرف دیکھ کر بی بی جان نے گھبرا کر انہیں تھامنا چاہا۔

"ہاتھ پرے کرو۔" انہوں نے غرا کر ان کا ہاتھ جھٹکا۔ "میں آگ بنا ہوا ہوں۔ پورا وجود لگ رہا ہے۔ بھانبھڑ جل رہا ہے میرے اندر۔ کوئی میرے قرب نہ آئے، خون سوار ہے میرے اعصاب پر۔ ایسا نہ ہو وہی انتقام کا پہلا شکار بن جائے۔" وہ کف اڑا رہے تھے۔

اسی دیوانگی کے عالم میں وہ اوپر چلے گئے۔

بی بی جان دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔

جانے اگلے دن کا سورج کیا رنگ دکھائے گا؟!

☆☆☆☆☆

"ارے پروفیسر دانیال مہدی۔ واؤ کیا سرپرائز ہے۔ تم کہاں ہو بھئی آج کل۔ میں امریکہ میں کئی بار تمہارے ایڈریس پر گیا تھا۔ پتا چلا ابھی ادھر کا چکر نہیں لگا۔"

اس سے پہلے کہ لفٹ مقررہ فلور پر پہنچتی۔ بٹن دبانے سے پہلے ہی باہر کھڑے سوٹڈ بوٹڈ مرد نے پروفیسر دانیال کو لفٹ باکس سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان کی فیلڈ کا بندہ تھا۔

"کیا حال ہیں جناب؟" پروفیسر صاحب گرم جوشی سے اس سے گلے ملے۔

"شاہین آپ ادھر صوفے پر بیٹھیں' میں ابھی پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں۔" وہ اسے ہال کمرے کے صوفے سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دی گئی۔

"پروفیسر دانیال مہدی۔" اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر نام گردش کرنے لگا۔

"میں اس کے ساتھ یہاں رات کے اس پہر اپنے گھر اور شہر سے دور کیا کر رہی ہوں۔" اتنا تو وہ دوران سفر جان چکی تھی کہ وہ اسلام آباد کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔

ہال کا بڑا سا سٹائلش کلاک رات کے سوا بارہ بجا رہا تھا۔ زمین و آسمان اس کی نظروں میں گھومنے لگے۔ اس نے اپنا آپ دیکھا۔

وہ کالج کے سفید یونیفارم میں تھی جس پر سڑک پر گرنے کی وجہ سے کہیں کہیں ہلکی سی مٹی اور سیاہی کے داغ لگے ہوئے تھے۔ بازو میں کالج کا بیگ لٹک رہا تھا۔

ہال کی چند ایک میزوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ مجموعی طور پر ماحول خاموش اور پرسکون تھا۔ کاؤنٹر پر کیپٹرز آپریٹ کرتے تین چار نائٹ ڈیوٹی ریسپشنسٹ اپنے کام میں مگن تھے۔ وہ اضطرابی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس سے پہلے کہ وہ واپس آئے مجھے یہاں سے بھاگ نکل جانا چاہئے۔" وہ چور نظروں سے ریسپشن پر مصروف افراد کو دیکھتی ہوئی بیرونی گلاس ڈور کی طرف بڑھی۔ وہاں موجود مستعد چوکیدار نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا' تاہم وہ آدھی رات کو یونیفارم میں ملبوس

اس کم سن لڑکی کو ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھ کر الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔

"میڈم آپ۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"وہ میرا کچھ سامان رہ گیا ہے گاڑی میں۔ وہ نکالنا ہے۔" وہ جلدی سے بات بنا کر بولی۔

"آپ چابی اور گاڑی نمبر بتا دیجئے میں پارکنگ لاٹ میں جا کر لے آتا ہوں۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔" وہ موذب لہجے میں گویا ہوا۔ نظروں میں ابھی تک شکوک اور واہمے چمک رہے تھے۔

"نہیں شکریہ۔ وہ چیزیں خفیہ خانے میں رکھی ہیں اور بہت پرسنل ہیں۔" نجانے کس طرح اس کے اندر اتنا اعتماد آ گیا تھا۔

چوکیدار کندھے اچکا کر خاموش ہو گیا۔

شاہین تیز تیز قدموں سے نیم تاریکی میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ چوکیدار اسے پارکنگ لاٹ کے بجائے مین روڈ کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہیں مشکوک خیال کرتے ہوئے پیچھے نہ آ جائے۔ پروفیسر دانیال کا خطرہ بدستور سر پر منڈلا رہا تھا۔

مین روڈ پر آتے ہیں اس نے اپنی رفتار تیز کر لی اور تقریباً بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ سڑک کے ساتھ بنے فٹ پاتھ پر دوڑ رہی تھی۔

وہ چاہتی تھی' ہوٹل سے کچھ دور پہنچ کر کسی سے راستہ پوچھے۔ سڑک پر ٹریفک کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ کون سا شہر تھا اور یہاں سے اسلام آباد واپس جانے کیلئے کتنی رقم درکار ہو گی۔

رقم کے ساتھ ہی اسے یاد آیا۔ اس نے نو سو روپے کی ہیروئن کی پڑیاں خرید کر بیگ میں رکھی تھیں' ابھی تک وہ بیگ میں تھیں۔

"اس سے پہلے کہ ان کی بدولت کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں' مجھے ان سے نجات حاصل کر لینی چاہئے۔"

وہ پھولتے ہوئے سانسوں کو بمشکل قابو میں کرتی ہوئی ایک لمحے کو رکی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے زپ کھول کر پڑیاں نکالنے لگی۔

پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ خوش قسمتی سے بائیں طرف ایک کھلے ہوئے گٹر کا منہ نظر

آ گیا۔ اس نے پڑیاں گٹر میں یوں پھینکیں جیسے اپنے جسم سے چمٹی بلاؤں کو دور کیا ہو پھر دوبارہ سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔

آگے سڑک تنگ ہو گئی تھی اس لئے فٹ پاتھ والی روسڑک پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

وہ جانے کتنا بھاگی۔ کن کن راستوں سے گزری۔

جب پاؤں تھک کر چور ہونے لگے تو وہ خود گھسیٹتی ہوئی ٹوٹتے بکھرتے سانسوں سمیت قریبی عمارت کی سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گئی۔

"اے بائی ---- ادھر کیا کرتی ہے۔ جا اوپر اندر۔ زنانیوں والے حصے میں چل کر آرام کر۔ او کملی چلی۔ میں تیرے سے بات کر رہی ہوں۔ اری اٹھ جا نصیبوں کی ماری۔"

شاہین نے دھیرے دھیرے تھکا ہوا دکھتا ہوا سر اٹھایا۔ اس عورت کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہو گی۔ گہرے سانولے چہرے پر بے شمار جھریاں وقت کی اس بے رحمانہ گردش کی گواہ تھیں۔ اس نے کالے رنگ کا جھلنگا سا چولا پہن رکھا تھا۔ گلے میں بہت سے منکے لٹک رہے تھے۔

"داتا صاحب کے دربار پر پڑی ہے تو کوئی روگ تو ہو گا جس نے گھر سے باہر کی اور ہڑکایا۔ چل آ جا اندر آ کے رہان (آرام) سے بتلا کیا بپتی تیرے ساتھ۔ کیا تیرا عاشق دھوکا دے کر تجھے پھنسا کر خود بھاگ گیا ہے یا خاوند نے مار پیٹ کے گھر سے نکال دیا ہے۔ یا پھر نادانی میں کسی کم ظرف پر بھروسا کر کے عزت لٹا بیٹھی ہے۔"

عورت نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔

"داتا صاحب۔" شاہین نے چکراتے ہوئے سر کو اٹھا کر اوپر دیکھا۔ مینار سے کنگرے اور آس پاس کی تاریخی عمارتیں از خود اس سوال کا جواب بن گئیں کہ وہ کہاں تھی۔

"کیا یہ لاہور ہے؟ میں لاہور میں ہوں؟" وہ تحیر سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔

بڑھیا اس کے اندر کو پاگل پن اور صدمے کی انتہا سمجھ کر افسوس سے سر ہلاتی اپنے ساتھ لے گئی۔

شاہین میکانکی انداز میں سیڑھیاں چڑھتی اس احاطے میں داخل ہو گئی جو خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ یہاں گویا ایک سرائے کا سا ماحول تھا۔ بے آسرا و بے اماں عورتیں داتا دربار کے اس

صحن اور کونوں کھدروں کو اپنا آخری بسیرا سمجھ کر یہیں آباد تھیں۔ اپنے اپنے سامان کی گٹھڑیاں باندھے دائیں بائیں آگے پیچھے کپڑا بچھائے بے فکری سے محو خواب تھیں۔ بوڑھی عورت اس کا ہاتھ پکڑے اندر لے آئی۔

"یہ میری جگہ ہے تو یہاں آرام کر۔" اس نے قدرے الگ تھلگ بنے اس گوشے میں بچھے کمبل پر شاہین کو بٹھا دیا۔

"ہمارے لنگر کا کھانا آتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں دیگ میں کچھ چاول اور بوٹیاں بچی ہوں گی۔ پانی پینا ہے تو یہ ساتھ میں کولر اور گلاس رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ المونیم کی پلیٹ میں چاول لئے واپس آ گئی۔

"لے کھا لے۔" وہ پلیٹ شاہین کے آگے رکھ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ شاہین یونہی بیٹھی رہی۔

"کھاتی کیوں نہیں ہے تو۔" پیلے بلب کی روشنی میں شاہین کا چہرہ اور سراپا واضح ہوتا چلا گیا۔ عورت نے جوں جوں اس کا جائزہ لیا اس پر حیرت اور فکرمندی طاری ہوتی گئی۔

"اری کرموں جلی۔ تو تو بہت چھوٹی ہے۔ کچی کلی ہے ابھی تو۔ تیرے کپڑوں سے لگتا ہے سکول کالج میں پڑھتی ہے۔ تو گلیوں بازاروں کا مال نہیں لگتی۔ میرے ذہن میں یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ کہیں زہرہ بائی کے کوٹھے سے تو بغاوت کر کے نہیں نکلی۔ پچھلے دنوں ایک طوائف آئی تھی بھاگ کر مگر زہرہ بائی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی۔ کتنی نے کھوج لگا لیا اور چونڈے سے پکڑ کر غریب کو واپس لے گئی۔ ری کون ہے تو۔ بتا تو۔"

بڑھیا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا جھنجھوڑا۔

شاہین کو جیسے ہلکی سی ٹھیس درکار تھی۔ اس کے چھوتے ہی آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وہ بلک بلک کر رو دی۔

"لے۔ رونے سے عورت جات کے مسئلے حل ہو جاویں تو وہ ثمانی آٹھوں پہر روتی رہے۔ چپ ہو جا۔ شاوا۔"

عورت کے انداز میں ہمدردی کی سچی اور مخلصانہ رمق پا کر اس نے مختصراً اپنے متعلق بتا دیا۔ ماں باپ کی سختی کی وجہ سے ایک بہت کو زبردستی گھر سے رخصت ہونا پڑا۔ دوسری بغاوت کر کے

نشے بازی کا شکار ہوگئی اور بہن کی ہمدردی خود اسے لے ڈوبی۔ باپ کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا خوف اسے ایک بالکل غیر اجنبی شخص پر بھروسا کرنے پر مجبور کر گیا۔ وہ شخص ان کے خاندان کا دیرینہ دشمن تھا۔ موقع دیکھ کر اسے ٹرانس میں لے کر لاہور لے آیا جب اسے اس کے مکروہ ارادوں کی خبر ہوئی تو وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے یہاں تک پہنچ گئی۔

"لے جھلی نہ ہو تو۔" بڑھیا کو سخت افسوس ہوا۔ "بھائی اور باپ نے دیکھ لیا تھا تو وہاں سے بھاگنے کی کیا جرورت تھی۔ ان کے ساتھ گھر آ جاتی' آ کر ساری بات بتلا دیتی۔ زیادہ سے زیادہ دو چار چانٹے اور ڈانٹ پھٹکار ہی کھانا پڑتی۔ آخر کو انہیں تیری سچائی پہ اعتبار آ جاتا تو بات ختم ہو جاتی۔ تو نے اپنے لئے کھوہ (کنواں) تو خود کھودا ہے۔"

"آپ نہیں جانتیں' میرے بابا جان کتنے ظالم ہیں۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔ "وہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ یہی سمجھتے کہ جس لڑکے سے باتیں کر رہی ہوں' اسی کے ساتھ یہاں تک آئی ہوں۔"

اولاد اور والدین کے درمیان باہمی اعتماد و یگانگت اور ہم آہنگی کی فضا قائم نہ ہو تو عموماً اسی طرح معمولی واقعات سنگین نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اعتماد کی کمی خوف پیدا کرتی ہے اور خوف سوچنے سمجھنے کی مثبت صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے میں جو قدم اٹھتا ہے وہ نفع سے زیادہ خسارے کی طرف جاتا ہے۔

"تو نے خود اپنے اوپر ظلم کمایا۔ مگر تیرا بھی قصور نہیں۔ تیری عمر ہی نادانیوں کی ہے۔" عورت ترحم بھرے انداز میں اس کا سراپا جانچ رہی تھی۔

"ایسی چھوئی موئی سی چھوری ہے تو۔ اوپر سے انجان اور ناواقف۔ کیسے رہے گی تو۔ پیچھے والوں نے تو تیرے لئے دروازے بند کر چھوڑے ہوں گے۔ ایک رات باہر بتا دینے کے بعد عورت کے لئے عزت والی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کسی کی بہن بیٹی یا بیوی نہیں رہتی۔ کوٹھے کی سجاوٹ بن جاتی ہے یا بھوکے بھیڑیوں کی تنخواہ دار کسی۔ یا پھر فقیرنی بن کر پیٹ کا دوزخ پالتی ہے۔ تیرا میں کیا کروں۔"

عورت صحیح معنوں میں اس کی ہمدرد اور خیر خواہ ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ مجھے اپنے پاس رکھ لیں یہاں۔" شاہین اس کے بازو سے لگ کر آنسو بہا رہی تھی۔

"یہاں.....؟" عورت کے دیدے پھیلے پھر اس کا سر انکار میں ہلنے لگا۔

"یہاں تو کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ کون سا پکا ٹھکانہ ہے۔ یہاں تو وہ بڑی بوڑھیاں آتی ہیں جنہیں اولاد بوجھ سمجھ کر گھر سے نکال دیتی ہے یا پھر ایسی عورتیں جن کے خاوند دوسری بیاہ کر گھر سے دربدر کر دیتے ہیں۔ بچے چھین کر بے آسرا ننگے آسمان تلے دھکیل دیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی دو سال پہلے یہی ہوا تھا۔"

"دو سال" شاہین اس سے الگ ہو کر آنکھیں جھپکتے ہوئے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ چہرے مہرے اور جلد سے تو وہ پچاس سے اوپر کی لگتی تھی۔ البتہ آواز میں مضبوطی اور ٹھہراؤ عمر سے میل نہیں کھاتا تھا۔

"ہاں۔" ایک طویل گہری سانس لے کر وہ منہ پر بنائی مصنوعی لکیریں اور سیاہی کھرچنے لگی۔ پھر ڈھیلا ڈھالا بدرنگ سا سیاہ لبادہ اتار دیا۔ نیچے وہ سرخ اور سبز پرنٹ کا لان کرتا شلوار پہنے ہوئے تھی اور جسمانی خدوخال کے اعتبار سے وہ کسی صورت تیس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ شاہین کی الجھی ہوئی نظریں اس کے سر کے بے رونق اور بکھرے ہوئے بالوں کی سفیدی پر گئیں۔

"یہ سفیدی اصلی نہیں ہے۔" عورت نے سرگوشی میں بتایا۔ "یہ میلہ کچیلا حلیہ' بے ترتیبی اور منکوں کے یہ ہار یہاں کی عورتوں کی طرح لگنے کے لئے اور اپنی جوانی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہیں۔ وگرنہ یہاں کی انتظامیہ مجھے دارالامان بھجوا دیتی اور میں کسی صورت وہاں نہیں جانا چاہتی تھی اس لئے یہ بڑھیا اور بزرگی طاری کر کے یہاں جگہ بنائی۔" اب کے اس کا لہجہ بھی سلجھا ہوا اور صاف تھا۔

شاہین اپنی افتادہ بھول کر آنکھیں اور منہ کھلے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ عورت نے دوبارہ لبادہ اور منکوں کے بار فٹ کر لئے۔

"میرا نام نسرین بانو ہے۔ میں لیہ کی رہنے والی ہوں۔ میٹرک پاس ہوں۔ میرے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ چاچی نے پالا پوسا اور اٹھارہ برس کی ہوئی تو اپنے بیٹے سے بیاہ دیا۔ وہ پہلے بھی ماں کی طرح نہ تھی۔ ساس بن کر رہی مروت سے بھی گئی۔ غریب گھرانہ تھا۔ بیٹا آرام پسند اور کاہل تھا۔ کام کاج اور محنت مزدوری سے جی چراتا تھا۔ پہلے تو چاچے کی دکان سے گھر کا راشن پانی چلتا رہا پھر وہ فوت ہوا تو میرے خاوند نے دنوں میں پیسے اڑا کر ساری دکان ٹھپ کر دی۔ اوپر

سے بچوں کی بھی ہر سال رحمت رہی۔ چھ بچے تھے اور ساتواں پیٹ میں تھا۔ سسر کے مرنے کے بعد مالی حالات بگڑے تو سب کا موڈ بھی بگڑتا گیا۔ ساس اور خاوند سارا غصہ مجھے دھنک کر نکالتے۔ بچے الگ روٹی کے لئے بلکتے ترستے۔ خاوند ذمہ دار ہونے کے بجائے نشے کی لت میں پڑ گیا۔ ساتھ میں جوا بھی شروع ہو گیا۔ ایک دن جوئے میں مجھے ہار آیا۔ میں اس بے غیرتی پر اس پر اُبل پڑی۔ وہ ہر صورت مجھے اپنے یار کے ہاں بھیجنا چاہتا تھا۔ انکار پر مارا پیٹا۔ ساس بھی مجھے اپنے بیٹے پر حملہ کرتے دیکھ کر پیٹنے لگی۔

عورت کی آنکھوں سے آنسوؤں کی خاموش لڑیاں ٹوٹتی چلی گئیں۔

"گالیاں بکتے اور مار پیٹ کرتے ہوئے میرے خاوند نے مجھے گھر کی دہلیز کے باہر پھینکا اور تین بار طلاق دینے کے بعد ہمیشہ کیلئے در بدر کر دیا۔ میرے بچے بھی چھین لئے۔ خبر نہیں بعد میں انہیں بھی جوئے میں ہار آیا ہو۔"

"پھر آپ یہاں آ گئیں۔" شاہین نے اختتامی جملہ خود ہی ادا کر دیا۔

"نہیں۔ میں روتی کراہتی گلیوں میں ٹکریں مارتی پھر رہی تھی کہ ایک لشکارے مارتی گاڑی میرے پاس رکی' وہ امیر زادے تفریح کے موڈ میں رات کو گھر سے باہر نکلے تھے۔ میری یہ حالت تھی کہ نہ پاؤں میں جوتے تھے اور نہ گلے میں دوپٹہ۔ انکی نظر مجھ پر پڑی تو گویا شکار مل گیا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے مگر وہ مجھے قابو کر کے گاڑی میں بٹھا کے لے گئے۔ دو دن اور دو راتیں اس اجاڑ بنگلے میں تینوں دوست میری عزت سے کھیلتے رہے۔ پھر کچھ پیسے دے کر دارالامان چھوڑ گئے۔ میں دو ماہ دارالامان میں رہی۔ ایک رات دارالامان کی مالکہ نے مجھے اچھے کپڑے جوتے اور زیور پہنا کر ایک کوٹھی میں بھیجا۔ وہاں ایک مالدار آسامی میری منتظر تھی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس کے چنگل سے نہ بچ سکی۔ اس کے بعد دارالامان میں ٹھہرنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔ میں وہاں سے بھی نکل آئی اور ٹکریں مارتی داتا دربار آن پڑی۔ یہاں ایک تحفظ کا احساس ہوا مگر یہ بھی ڈر تھا کہ یہاں آنے والوں میں سارے فرشتے نہیں ہوں گے۔ اگر کسی کی میلی نظر پڑ گئی تو پھر وہی کھیل شروع ہو جائے گا۔ دوسرے جوان جہان عورتوں کو دربار میں پناہ لینے کی اجازت دیتے ہوئے انتظامیہ ہچکچاتی ہے کہ اس سے بہت سے مسئلے شروع ہو جاتے ہیں اس لئے میں نے یہ سوانگ بھر لیا۔"

"مجھے بھی اسی سوانگ میں رنگ دیں۔" شاہین نے بے قراری سے اس کا گھٹنا دبایا۔

"تمہارے لئے ابھی بہت لمبی عمر باقی ہے۔ ایک دنیا ہے دیکھنے کو۔"

"میں نے اب کوئی دنیا نہیں دیکھنی۔ تھک گئی ہوں اس چکر سے۔"

"ابھی سے؟" عورت کے ہونٹوں پر بے معنی سی مسکراہٹ جھلکی۔

"ابھی تو بڑا لمبا پھیر باقی ہے عمر کا۔ ابھی دو تین دن رہو میرے ساتھ پھر کچھ سوچتے کرتے ہیں۔ میں تمہیں اپنی بھانجی بناؤں گی اب تم آرام کرو۔"

شاہین کو اس کا ساتھ اندھیرے میں اچانک نظر آ جانے والی روشنی کی لکیر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

موبائل فون بہت دیر سے بج رہا تھا۔

مہران واش روم سے تولیہ سر پر رگڑتے ہوئے باہر آیا اور بیڈ سائیڈ پر پڑا موبائل اٹھا لیا۔ نایاب کمرے میں نہیں تھی غالباً رات کے کھانے کی تیاریوں میں تھی اور ناظر کا ہاتھ بٹانے کیلئے نیچے کچن میں مصروف تھی۔ وہ ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔

"ہیلو۔"

"کیا حال ہیں حسین و جمیل ایس ایس پی صاحب۔" داور کی چہکتی ہوئی آواز کان میں پڑی۔

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"دور' بہت دور سے۔" وہ گنگنایا۔

"میں نے تمہارے آفس فون کیا تھا۔ پتا چلا کسی اہم "مشن" پر نارووال گئے ہو۔ کیا رہا؟" مہران بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

"تفصیلات واپسی پر بتاؤں گا' البتہ امید ہے اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

"اب تو جی چاہتا ہے' مستقل یہیں رہ جاؤں۔" داور کی بشاش آواز ابھری۔

"کیوں کیا کسی خزانے کا سراغ مل گیا ہے جس کی کشش تمہیں روک رہی ہے؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" داور شرارتی انداز میں گویا ہوا۔

"اوہو..... مہران خلاف مزاج چھیڑ خانی پر اتر آیا۔

"بھئی ہم نے تو تم سے سبق سیکھا ہے۔ تم نے ایک چھوڑ دو دو گھر بسا لیے تو کیا ہم ایک کے بارے میں بھی نہ سوچیں۔" داور چہک رہا تھا۔

"کون ہے وہ کوئی دیہاتی دوشیزہ یا قصبے کی الڑ مٹیار۔"

"دونوں میں سے کوئی نہیں۔"

"پھر۔" مہران نے مزید تفصیل چاہی۔

"وہ بڑی چیز ہے بھئی۔ بہت عام سی مگر بہت پراثر نہایت سادہ مگر نہایت پرکار۔"

"تو آ جاؤ ناں تم بھی۔ اسی علاقے میں ہے ناں تمہارا آبائی گاؤں۔" داور نے تصدیق چاہی۔

"ہوں۔" مہران کا لہجہ کھنچ گیا۔ ایک مدت کے بھولے بسرے مناظر آنکھوں کی پتلیوں میں عکس بنانے لگے۔

"اوکے۔" اس نے بات ختم کر کے موبائل بند کر دیا اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

میں حیران ہوں
کہ لمحے کیسے صدیوں میں بدلتے ہیں
کسی ٹیبل پہ رکھے پھول سے خوشبو بغاوت کر چکی ہے
اور ہاتھوں نے کوئی جنبش نہیں کی ہے
کسی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بسکٹ کے ٹکڑے کو پھپھوندی لگ چکی ہے
اور آنکھوں میں کوئی ردعمل اب تک نہیں جاگا
کسی کے پاس بیٹھے چند لمحے کی ہوئے ہیں
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں سے کسی ناراض پتھر کی رفاقت ہے
نجانے کتنی صدیوں سے یہاں پر وقت ٹھہرا ہے
ہوا اپنے پروں کو کھول کر اونچے درختوں پر کھڑی ہے

دھند کی چادر میں لپٹی خاموشی لے بن گئی ہے
سورج کی حرارت کھو گئی ہے
کسی کی چاپ ابھرتی ہے تو فطرت چونک اٹھتی ہے
ہوا کے ایک جھونکے سے بہت سے زاویے غمگین نگاہوں کو ترا وت دے رہے ہیں
میں حیران ہوں کہ لمحے کیسے صدیوں میں بدلتے ہیں۔

ارشین عصر کی نماز پڑھ کر گھر سے نکلی تھی۔ سورج کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ کم ہوتی ارہی تھی۔ وہ ٹہلتی ہوئی کھیتوں سے گزرتی اس علاقے کی طرف نکل آئی تھی جسے بھوتوں کا ڈیرا کہا اتا تھا اس جگہ کے اسرار کے بارے میں اس نے گاؤں والوں سے اتنا کچھ سنا تھا کہ لامحالہ ایک تیاق سا جاگ اٹھا تھا۔ بارہا اس طرف آنے کی ٹھانی مگر حالت کا چکر کچھ اس طرح زنجیر پا کیے ہا کہ ایسے وقت میں مہم جوئی کا یہ شوق تفریح اور عیاشی کی مانند لگتا تھا اس لئے اپنے شوق کو دبائے ہی۔ آج کچھ فراغت نصیب ہوئی تو بے احتیاط قدم اس سمت بڑھتے چلے گئے۔

کھیتوں کی حدود ختم ہو جانے کے بعد سامنے خاردار تاروں کے ساتھ کھڑی قد آدم باڑھ کی ب لمبی قطار دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جگہ کے گرد باڑھ کے ذریعے چار دیواری بنا دی گئی ہے۔

ارشین نے باڑھ کے پاس جا کر گھنے پتوں کے بیچ اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ دور تک ختوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

"اگر اندر کچھ بھی نہیں ہے تو تاریں لگا کر چار دیواری کی طرح باڑھ کیوں لگائی گئی ہے۔" وہ ندرت سے سوچنے لگی۔ "ہو سکتا ہے ان درختوں کے آگے کچھ ہو۔"

اسی لمحے اسے کسی جانور کے دھاڑنے کی آواز آئی۔

وہ دہل کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا محکمہ جنگلات نے جانوروں اور درندوں کے خطرے کے پیش نظر یہ چار دیواری بنوائی ہے؟"

وہ کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اندر سے گھنگھرو چھنکنے اور موسیقی کی تال تیز ہونے کی آواز آئی۔

وہ ہڑبڑا کر کچھ اور پیچھے ہو گئی۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی۔" ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ تیز وسل نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ..... یہاں؟" سفید شرٹ اور نیلے ٹراؤزر میں کیمرہ گلے میں لٹکائے دائیں ہاتھ میں نوٹ بک اور موبائل لئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر اتنا ہی حیران ہوا تاہم ظاہر نہیں کیا۔

"کیا بات ہے کیا مصور لوگ جاسوسی بھی کرتے ہیں"

"جاسوسی" وہ ناسمجھی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں چار دیواری سے کچھ فاصلے پر الگ ہٹ کر ایک بڑے پتھر کے پاس آ گئے۔

"ہاں۔ میں تو اسی مقصد سے یہاں آیا ہوں۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بھی پتھر کے ایک کونے پر ٹک گیا۔

"مجھے تجسس اور اسرار یہاں تک لایا ہے۔" ارشین نے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"میں نے یہاں کے لوگوں سے اس جگہ کی پراسراریت کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ ان کا خیال ہے یہ جگہ بھوتوں کا ڈیرہ ہے۔ یہاں عجیب و غریب درندے اور بلائیں آباد ہیں جو سرِ شام یہاں رقص و سرود کی محفل آباد کرتے ہیں۔ یہاں کی تاریخ کے مطابق جس نے بھی اس آسیبی جگہ پر قدم رکھا وہ زندہ واپس نہیں آیا۔"

"موسیقی اور جانوروں کی آواز تو میں نے بھی سنی ہے۔" داور تیز نظروں سے اس چار دیواری کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" اس کی نظریں ارشین کے سادہ چہرے پر جم گئیں۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی شعاعوں کی ٹھنڈی پرسکون لالی اس کے رخ پر بکھر کر انوکھی سی روشنی اور دمک پیدا کر رہی تھی۔ داور بے اختیار ہو کر دیکھنے لگا۔ پھر نامناسب جان کر ایک دم نگاہ ہٹا لی۔

"میرا خیال....." وہ کچھ ہچکچائی۔ "آپ نے فلموں کیلئے سیٹ تیار کرنے والی بات سنی ہوگی۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بھی کوئی ایسا ہی ڈرامہ ہے۔ یہ سیٹ اپ قدرتی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً بنایا گیا ہے۔"

داور نے بے ساختہ ستائشی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ اس نے جو معلومات مختلف ذرائع سے اکٹھا کی تھیں ان کے مطابق بارڈر ایریاں کے آس پاس منشیات کا ایک خفیہ اڈہ بنایا گیا تھا اور مقامی لوگوں کو اس جگہ سے دور رکھنے کے لئے ان کے سیدھے سادے ذہنوں کو آسیبی چکر میں الجھا دیا گیا تھا۔ اس کے لئے یقیناً ٹیپ ریکارڈر استعمال کیا جاتا تھا۔

"اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے تو اس باؤنڈری کے آس پاس نصب سپیکر کی تار مل جائے گی۔" ارشین نے مزید کہا۔

"وہ تار اور اس سے منسلک آلات میں کل ہی دریافت کر چکا ہوں۔" داور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "آپ کا انداز لاجواب ہے۔" اس نے سادگی سے تعریف کی۔

"میرا خیال ہے کوئی بھی پڑھا لکھا سوچ رکھنے والا بندہ اس مصنوعی پن کو محسوس کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔" ارشین نے کہا۔

"ویسے آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ کس سلسلے میں اس جگہ کا جائزہ لے رہے ہیں؟"

"ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق اس جگہ منشیات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے اور سرحد پار سمگلنگ کے لئے آسان راستہ بھی ہے۔ میں کرائم رپورٹر ہوں اس لئے ان چیزوں میں دلچسپی لینا میری مجبوری ہے۔"

"فرض کریں آپ نے حقائق معلوم کر لئے پھر۔ میرا مطلب ہے ان حقائق کے پریس تک پہنچتے ہی سمگلر چوکنے ہو کر جگہ چھوڑ جائیں گے۔ اخبار کے چھپ کر افسران بالا تک پہنچنے کی مدت ان کے فرار کے لئے بہت کافی ہوگی۔"

"اس کا پکا بندوبست ہے اپنے پاس۔" داور نے دعوے سے کہا۔ "اسلام آباد کے ایس ایس پی مہران سے میرے خصوصی تعلقات ہیں۔ اس تک لمحے لمحے کی رپورٹ پہنچ جائے گی۔ جونہی میری معلومات مکمل ہوئیں اسے مقامی ایس ایس پی سے بات کر کے ریڈ کرنے کا سگنل دے دوں گا۔ رپورٹ چھپنے سے پہلے مجرم گرفتار ہو چکے ہوں گے۔"

ایک ایک کر کے ارشین کی حسیات سن ہوتی گئیں۔

یہ حوالہ کہاں سے نکل آیا؟

اور اگر یہ "اس" کا جاننے والا ہے تو پھر میرے نام سے بھی واقف ہوگا۔

"کیا ہوا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مس بخاری۔" اس کی اڑتی ہوئی رنگت داور کی نظروں سے چھپ نہ سکی۔

"جی ہاں۔" ارشین نے بروقت جواب دیا۔

"ویسے آپ کا ذاتی نام کیا ہے۔ میرا مطلب ہے پورا نام؟"

"ارشین۔" جواب دے کر ارشین نے گہری نظروں سے اس کا ردعمل نوٹ کیا لیکن داور کے ذہن میں مہران کے حوالے سے اس نام سے آشنائی نہیں جاگی۔ اس کے لئے ایک خوبصورت نام تھا اور بس۔ یوں بھی عموماً ہی نام یادداشت میں رہتا ہے جس کو کسی حوالے سے انسان بار بار زبان پر لاتا ہے۔ مخاطب کرتا ہے اور پکارتا ہے۔ مہران کی بیوی کا نام ارشین ضرور تھا مگر داور نے کبھی نہیں دیکھا تھا نہ بات چیت کی تھی کہ کوئی حوالہ یا شناسائی یاد رہتی اس لئے وہ نام سن کر نارمل رہا۔ شاید ذہن اپنے مشن میں نہ الجھا ہوتا تو تانا بانا جوڑنے کا موقع مل جاتا مگر ایسے مصروف حالات میں اس قسم کے اتفاقات کی گہرائیاں ناپنے کی فرصت ناممکن تھی۔

"تعلیم کی عدم دستیابی توہمات کو جنم دینے اور انہیں پختہ کرنے کا سبب بنتی ہے اور بے علم لوگوں کی اس محرومی کا فائدہ اٹھانے والوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔" داور نے پلٹ کر ایک نظر چاردیواری کی سمت پھینکی تھی۔

"درست کہتے ہیں آپ۔ ان چالاک اور سازشی لوگوں نے کس خوبصورتی سے گاؤں والوں کے ذہنوں کو قابو کیا ہے۔"

"بہرحال جلد ہی اس ڈھونگ کا پول کھل جائے گا۔ میں دو تین دن کے اندر اندر اپنی معلومات مکمل کرلوں گا۔"

"وہ لوگ جنہوں نے اس باؤنڈری سے آگے جانے کی، وہ زندہ واپس نہیں آئے۔ آپ کے ذہن میں اس کی کیا توجیہہ بنتی ہے؟"

"انہیں راز کھل جانے کے ڈر سے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا ہوگا۔"

"ایک بات۔" ارشین نے ہاتھ اٹھا کر وضاحت چاہی۔ "گاؤں والوں کے مطابق کچھ ایسی لاشیں بھی ملیں جس میں جسم پر گولی، چاقو چھری یا کسی اور زخم کا نشان تک نہیں تھا۔ اس کے

علاوہ بعض لاشوں کے دائیں یا بائیں پاؤں کے گرد نیلی موٹی سی گول چیز کے گہرے نشانات پائے گئے۔"

"یہ بھی کوئی مشکل نہیں۔ شکاری عموماً بڑے جانوروں اور درندوں کو پکڑنے کے لئے روایتی طریقے استعمال کرتے ہیں جیسے گڑھا کھود کر شکنجہ لگانا یا کڑکی لگا کر شکار کرنا۔ ہوسکتا ہے اس چاردیواری کے آگے ایک خندق کھود کر بظاہر اس کو گھاس پھونس سے چھپا دیا گیا ہو۔ ایسے میں انجان شخص چلتا چلتا سیدھا اس خندق میں گر کر جان گنوا سکتا ہے۔ خندق میں لگے شکنجے میں پھنس کر اس کا پاؤں موٹی زنجیر میں قید ہو جاتا ہوگا۔ یہ لوگ اسکے مرنے کے بعد شکنجہ کاٹ کر اس کی لاش باہر پھینک دیتے ہوں گے۔"

ارشین غور سے اسکا تجزیہ سن رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی ہیں۔ بوا کو کھانا بنا کر دینا ہے۔"

"کیا میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر تک چل سکتا ہوں۔" نجانے کیوں وہ اس کے طرز رہن سہن اور جائے رہائش کے بارے میں متجسس ہو رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار ہر لحاظ سے اسے یہاں کے باسیوں سے مختلف ثابت کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے درخت کی مانند لگتی تھی جو اپنی جڑ پیچھے بھول آیا ہو۔

ناچار ارشین کو اسے گھر تک لانا پڑا اور مروت میں چائے پانی بھی پوچھنا پڑا وہ مزے سے سر ہلا کر صحن میں بچھی چارپائی پر براجمان ہوگیا۔

"خاصا قدیم طرز تعمیر ہے آپ کے گھر کا۔" وہ تنقیدی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کافی حصہ غیر آباد پڑا ہے۔ اس پر چھوٹا موٹا باغ بنایا جاسکتا ہے۔"

"میرا ارادہ ہے، فرصت اور سرمایہ ملے تو یہاں دو چار کمرے ڈلوا کر سکول شروع کروں گی۔"

"یہ کام تو آپ ابھی بھی شروع کرسکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی سے کمروں کی تعمیر کا کام شروع کرائیں گی تو بات بنے گی۔ ایسے پراجیکٹ بہت وقت مانگتے ہیں۔"

"اس کام کے لئے سرمایہ چاہئے اور سرمائے کے لئے آمدنی کا مستقل ذریعہ۔ آپ کے ہاں جاب کرتے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی اور ابھی تو بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ گھر کا خرچہ پورا ہو

جاتا ہے۔"

وہ سادگی سے بتا کر پھر سے رادر کو الجھن میں ڈالنے لگی۔ اسے اس کا بیک گراؤنڈ اور موجودہ صورت حال ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ یہاں اس اجاڑ سے ویران گھر میں کام کرتی ہوئی مس فٹ لگ رہی تھی۔

بہر حال اس نے اس بحث کو کسی اور وقت کے لئے رکھ چھوڑا اور گونگی بوا سے اشارتی گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

"اجازت دیجئے۔" اس نے رسماً روکا۔

"ضرور۔ مگر آج نہیں پھر کسی دن۔ خدا حافظ۔" اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ زندگی اور خوشی نصیب کرے۔"

جاتے جاتے اس نے ارشین پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی۔ لہجے میں شرارت تھی مگر ارشین نے اس چیز کو محسوس نہیں کیا۔

اس کا ذہن زندگی اور خوشیوں کے لئے دی جانے والی دعاؤں پر مرتکز تھا۔

اس کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ کواڑ بند کرتے ہوئے جانے کس احساس نے اس کے دل کو جکڑ لیا تھا۔

وہ پلٹی تو اس کے لبوں پر مضمحل سی مسکراہٹ تھی۔

زندگی کی دعائیں نہیں دیجئے
ضد نہیں کیجئے ڈوبنے دیجئے
اپنی تشنہ لبی کا تقاضا تھا یہ
پانیوں کے سفر پر چلیں جس گھڑی
ساحلوں پر کوئی بھی ہمارا نہ ہو
اجنبی دیس کی ملگجی شام کے
آسمانوں پر کوئی ستارا نہ ہو
آخری دم تک کشتی عمر کو
بادبانوں کا کوئی سہارا نہ ہو

اب ہمارا تعاقب نہیں کیجئے
ڈوبنے دیجئے.....

"بوا! اندر گرمی ہو رہی ہے۔ آپ کا بستر بھی باہر صحن میں بچھا دوں؟" کھانا کھانے کے بعد اس نے پوچھا۔

پھر ان کے سر ہلانے پر بان کی دوسری چارپائی نکال کر بچھانے لگی۔ بوا کا بستر تیار کر کے لٹانے کے بعد وہ بھی دوسری چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نظریں آسمان پر تھیں اور ذہن کہیں دور اڑانیں بھر رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں یہ شخص میرے حال اور ماضی کے مابین سفر کرتے اتنے واضح خلا اتنا نمایاں سوالیہ نشان کے بارے میں تجسس رکھتا ہے اور کسی نہ کسی طرح میرا اصل کھوجنا چاہتا ہے لیکن میں اسے کیسے بتا سکتی ہوں کہ میری ذات کے در پر جا بجا چپکے اندھیروں کا ذمہ دار کون ہے۔ مجھے کس نے شہر بدگمانی کی تاریکی میں دھکیلا ہے۔"

"کس نے ان راستوں پر ڈالا ہے جہاں نہ چاند کی دستک ہے نہ روشنی کے قدم! کیسے بتاؤں اسے کہ میری روح کی ملتابیں اس کے عزیز دوست نے اکھاڑی ہیں۔ اسی کے سرد تعلق کے بے ثمر لمحوں نے مجھے اس دوراہے پر کھڑا کیا ہے جہاں اپنی پہچان بھولنے لگی ہے' جہاں یقین کاغذ کی کشتی کی طرح وسوسوں کی بارش میں بھیگ کر ٹوٹ جاتا ہے۔

جہاں دیار ذات کے تاریک بام و در میں خوشی اور خوش قسمتی کی کوئی کرن نہیں جگمگاتی۔

وہ کروٹ بدل کر رات گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اب تو ہر رات یہی کام رہ گیا تھا کہ انتظار کی گلی میں گم ہو کر بھٹکتی گھومتی پھرتی رہے۔

☆☆☆☆☆

"جب سے میرا ٹرانسفر لاہور ہوا ہے' اتنی مدت میں آج میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔ اتنی مصروف زندگی ہے کہ فرصت نکالنا بھی گویا پہاڑ کھودنے سے کم دشوار نہیں لگتا۔"

سعد اپنے رینک کے فوجی افسر کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر جا رہا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ دوپہر کو بیٹھے بٹھائے دونوں نے ادھر کا پروگرام بنایا تھا سو ایک گھنٹے میں تیار ہو کر پہنچ گئے۔ دونوں گھریلو لباس میں تھے اور دوسرے لوگوں میں گھل مل کر چل رہے تھے۔

معاً اس کی نگاہ خواتین کے لئے مخصوص جگہ کی سمت اٹھی۔ اور پھر جیسے بے اعتباری سے ادھر کی چپکی رہ گئی۔

بڑی سی سبز ملگجی چادر اوڑھے سر جھکائے گلے میں دو تین منکے ڈالے وہ خاتون سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسکی گود میں کھانے اور پھولوں کے دو پیکٹ کوئی آتا جاتا رکھ گیا تھا۔ یوں تو اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن جونہی اس نے چہرے کو آدھے سے زیادہ ڈھانپی چادر کو درست کرنے کے لئے ذرا سا منہ اوپر کیا تو اس کی صورت نمایاں ہوگئی۔ گو کہ اس نے دوبارہ چادر آگے کر لی تھی مگر سعد کی بینائی نے اچھی طرح اس کا چہرہ ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔

"شاہین! او مائی گاڈ کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ وہ یہاں کہاں مگر نہیں یہ سو فیصد شاہین تھی۔" اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ پھر وہ نہ رہ سکا۔ اردگرد کے ہجوم کی پرواہ کئے بغیر کسی طرح جگہ بناتا اس کے سامنے گیا اور پوری شدت سے پکارا۔

"شاہین!" اور اس پکار کے ساتھ ہی جھٹکے سے اس کا سر اٹھانا اور اسے سامنے پا کر آنکھوں کا پتھرا جانا از خود اس کے واہمے کی تصدیق کرتا چلا گیا۔

"تم یہاں!" زمین و آسمان سعد کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔ شاہین کو یہاں نسرین بانو کی پناہ میں آج چار دن ہو گئے تھے۔

"سعد بھائی!" اس کا جی چاہا وہ دھاڑیں مارتی ہوئی اس سے لپٹ جائے مگر موقعہ کی مناسبت سے اس نے ضبط کیا۔

"کیا ہے چھوری؟" نسرین نے اس فوجی ہیئر کٹ والے بندے کو شاہین سے باتیں کرتا دیکھ کر لپک کر ادھر آ گئی تھی۔

"خالہ! یہ میرے رشتے کے بھائی ہیں۔ میرے عزیز ہیں۔" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"یہ میری مدد ضرور کریں گے۔" اسے جیسے پورا یقین تھا۔

"اندر جا کر اپنے پرانے کپڑے بدلو اور خاموشی سے اس کے ساتھ نکل جاؤ۔" نسرین نے تیز سرگوشی کی۔

"میرے دل سے ایک بڑا بوجھ سرک گیا۔ جاؤ شاید اس کی انگلی پکڑ کر تم عزت و آبرو کی زندگی کو جانے والا راستہ تلاش کر لو۔ اٹھو دیر نہ کرو۔"

سعد ناسمجھی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔

"میں ابھی آتی ہوں سعد بھائی۔ آپ جائیے گا نہیں۔"

وہ تھوڑی دیر بعد آئی تو کالج کے یونیفارم میں تھی۔ کاندھے پر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ سعد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" وہ بڑبڑایا۔ وہ اس حلیے میں لاہور میں کہاں ماری ماری پھر رہی تھی۔ یہاں تک کس وسیلے سے پہنچی۔ وہ اسے بچپن سے جانتا تھا۔ ڈرپوک، کمزور دل والی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوف سے سہم کر ارشین کی گود میں چھپ جانے والی وہ سیدھی سی لڑکی تن تنہا گھر سے سینکڑوں میل دور آنے کی ناقابل یقین جرأت کیونکر دکھا سکتی تھی۔

صورت حال کے پیش نظر وہ بولا کچھ نہیں، چپ چاپ اسے لئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ وہ اتنا شاکڈ تھا کہ اپنے ہمراہ آئے میجر تنویر کو مطلع کرنا بھی بھول گیا۔

"مجھے کسی محفوظ جگہ لے چلئے سعد بھائی۔" سڑک پر آتے ہی وہ سعد کی آستین پکڑ کر خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پروفیسر دانیال مہدی کا آسیب ان پانچ دنوں میں ہر لمحہ اس کا تعاقب کرتا رہا تھا۔

لفٹ لیتے ہوئے اسے کہاں خبر تھی کہ وہ شیر کی کچھار میں قدم رکھ رہی ہے۔ پروفیسر دانیال مہدی کس قدر خطرناک، سازشی اور کمینی خصلت کے مالک تھے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھی۔ بابا جان کو بھڑکا کر جس طرح ارشین آپا سے زیادتی پر آمادہ کیا اور پھر العبرین کو لیلیٰ شاہ کے توسط سے جس طرح برباد کرنے کی کوشش کی اس کے بعد ان جیسے شخص کے کردار کے بارے میں مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ وہ تو شکر تھا معجزانہ طور پر وہ اپنے حواسوں میں پلٹ کر ہوٹل سے فرار ہو گئی تھی۔ ورنہ اب تک وہ پامال کی جا چکی ہوتی۔ پروفیسر دانیال انسان کے روپ میں ایک شیطان تھے۔ ایک مہذب درندہ جو انسانیت کی بے ضرر کھال میں چھپ کر وار کرتا ہے۔

سعد نے جیپ کا فرنٹ ڈور کھولا۔ شاہین لپک کر سوار ہو گئی۔ اس نے دوپٹہ اچھی طرح اپنے چہرے پر لپیٹ لیا تھا تاکہ کوئی شناخت نہ کر سکے۔ سعد نے یہ بات خصوصی طور پر نوٹ کی اور اپنے طور پر کچھ اخذ بھی کر لیا۔

"کتنے دن سے یہاں ہو؟" وہ جیپ سٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔ وہ اتنا تو جان چکا تھا کہ کچھ غیر معمولی واقعہ ہوا ہوگا جب ہی وہ یہاں دکھائی دے رہی تھی۔

"آج کا دن ملا کر پانچ دن ہو گئے ہیں۔" وہ چور لہجے میں سر جھکائے آہستگی سے گویا ہوئی۔

"گھر والوں کو پتا ہے تم کہاں ہو؟" سعد کو خود بھی احساس تھا کہ وہ ایک بے مقصد سوال پوچھ رہا ہے۔

"نہیں۔" اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ "وہ مجھے دو پیٹ کر صبر کر چکے ہوں گے۔"

"گویا تم پانچ دن سے بغیر بتائے گھر سے غائب ہو۔ مائی گاڈ۔" وہ حیرت و ملامت کے سے انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"اتنے دن سے دربار پر ہی پڑی ہو یا کہیں اور بھی ٹھکانا ہے۔"

راستے میں مین روڈ کے دائیں طرف ایک پبلک پارک نظر آیا تو سعد نے احتیاط سے جیپ سائیڈ پر لگا دی۔ پارک کے نام پر درختوں کی چند قطاریں تھیں اور گاہے گاہے رکھے چار سنگی بینچ۔ ابھی شام ڈھلی نہ تھی اس لئے گہما گہمی اور لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ فی الحال موقوف تھا۔ سعد نے دو درختوں کے بیچ سائے میں لگا بینچ منتخب کیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی جلدی سے ایک کونے میں براجمان ہو گیا۔ وہ پوری بات سننے کو بری طرح بے تاب دکھائی دیتا تھا۔

"نہیں۔ اگر کوئی محفوظ ٹھکانا ہوتا تو دربار میں نہ پڑی ہوتی۔"

"ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔ تم یہاں کیسے پہنچیں؟ کیا کر رہی ہو یہاں اور کس حادثے نے تمہیں یہاں تک پہنچایا۔ اگر بالفرض کسی سانحے نے تمہیں اتنی دور پہنچا دیا تھا تو آزادی پا کر اپنے گھر لوٹنا تمہارا فرض نہیں تھا کیا؟"

شاہین نے گہری سانس لی۔ سعد کی تفتیش اس کے دل کو سہا رہی تھی۔

"آپ تو ہر بات سے واقف ہیں سعد بھائی۔" وہ ملتجی لہجے میں گویا ہوئی۔ "ہمارے گھر کے حالات، ماحول اور اس کے اثرات، ہر چیز آپ کے سامنے رہی ہے۔ آپ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ ارشین آپی کے ساتھ اس شیطان صفت پروفیسر دانیال نے کیا کیا۔ امبرین باجی کس طرح

مسلسل ناکامیوں اور گھر والوں کے ناروا سلوک کے ہاتھوں ذہنی مریض بنیں۔ آپ سب جانتے ہیں۔ بس ہوا یہ کہ وہ ان ناکامیوں کا انتقام لینے کے لئے معاشرے کے ساتھ ساتھ خود سے بھی خفا ہو گئیں اور خود اذیتی کے اس جوش کو لیلیٰ شاہ کی چالبازی اور مجرمانہ سازشوں نے مزید بڑھایا۔ انہیں نشے کی لت لگا دی جو اتنی بڑھی کہ امر باجی اس کے بغیر رہ نہ پاتی تھیں۔ گھر والوں کو پتا چلا تو رسیوں سے باندھ دیا مگر مجھ سے ان کی نشہ ٹوٹنے کے بعد والی خوفناک اور قابل رحم حالت دیکھی نہ گئی۔ ان کی منتوں واسطوں سے میں پگھل گئی اور نشہ لینے چل پڑی۔ واپسی پر بابا جان کی نظر پڑ گئی۔ ان کی دہشت اتنی تھی کہ میں بے سوچے سمجھے ان سے بچنے کے لئے بھاگتی چلی گئی اور کسی طرح پروفیسر دانیال سے ٹکرا گئی۔ پروفیسر مجھے ذہنی طور پر مفلوج پا کر غالباً ارشین آپی سے انتقام لینے کے لئے یہاں لے آئے۔ شاید وہ کچھ بہت زیادہ برا کرتے میرے ساتھ مگر میرے اعصاب بیدار ہو گئے۔ مجھے جیسے ہی خطرے کا احساس ہوا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور یوں دربار تک پہنچ گئی۔" شاہین کی آواز آنسوؤں میں ڈوب رہی تھی۔ بڑے دن کے رکے ہوئے آنسو موقع پا کر تیز بوچھاڑ کی طرح بہتے چلے گئے۔

"کیا اندازہ کر سکتی ہو تمہارے پیچھے تمہارے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟" سعد کا لہجہ بھنچا ہوا تھا۔

شاہین خاموشی سے سر جھکائے روتی رہی۔

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" سعد نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" شاہین نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دونوں بازو اپنے اردگرد سکیڑ کر باندھ لئے۔

سعد کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"نادانی کی باتیں مت کرو۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔ "ابھی کم سن ہو نا سمجھ آگے کی کٹھنائیاں نظر نہیں آ رہیں۔ جتنی حماقت کر چکی ہو اتنی ہی کافی ہے مزید نادانی کا ثبوت نہ دو۔"

"بابا جان مجھے مار ڈالیں گے سعد بھائی۔" وہ رو رو کر پاگل ہو رہی تھی۔

"وہ تو ایک ہی دفعہ ماریں گے ناں۔ یونہی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی رہیں تو دنیا پل پل مارے گی۔ روند ڈالے گی تمہیں۔ دنیا انسانوں کا ایک سمندر ہے جس کی ہر موج طوفان بن کر ٹکراتی

ہے۔کہاں کہاں بچو گی ان طوفانوں سے۔اور کس طرح؟"

سعد کا لہجہ تلخ تھا۔امبرین کی تباہی کی داستان اس کے دل میں گہرے گھاؤ ڈال رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا بات اس انتہا تک بھی پہنچ سکتی ہے۔اتنی گھریلو سی لڑکیاں دقیانوسی اور تنگ نظر ماحول کی پروردہ' دنیاوی چھل فریب سے ناواقف اور کیا کر بیٹھی تھیں۔کہاں لے آئے انہیں حالات۔

"اگر آپ کو میری ذمہ داری بوجھ لگ رہی ہے تو واپس دربار چھوڑ آئیں مگر یہ طے ہے کہ میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔آپ کو کیسے سمجھاؤں' وہ لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔" اس بات کا اندازہ سعد کو بھی تھا لیکن پھر بھی وہ اسے اس کے والدین تک پہنچانا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا تھا۔

"ضد نہ کرو۔شاباش۔" وہ نرمی پر اتر آیا۔"آؤ۔" اس نے بچوں کی طرح اسے بہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور اٹھانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں یا نہر میں دھکا دے دیں۔یہ بات طے ہے کہ میں گھر واپس نہیں جاؤں گی۔" وہ جنونی ہو رہی تھی۔سعد پریشان ہو کر اس کی جذباتی کیفیت پر غور کرنے لگا۔وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔بخاری صاحب اور صباحت کسی قیمت پر اسے قبول نہ کرتے بلکہ انتہائی حدود پر کھڑے شاید کچھ کر ہی گزرتے۔

"آپ جانتے تو ہیں سب کچھ۔پھر بھی مجھے قتل گاہ پر لے جانے کے لئے بضد ہیں" سرخ آنکھیں مسلتے ہوئے وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی۔

"اچھا۔یہ رونا دھونا بند کرو۔مجھے کچھ سوچنے دو۔" سعد نے ایک ہاتھ سے اس کے گال صاف کئے۔وہ عجیب دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا۔وہ میس میں رہتا تھا' ظاہر ہے اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔بہت دیر تک سوچوں کے گھوڑے ادھر ادھر دوڑانے کے بعد بالآخر اسے ایک مناسب حل سوجھ گیا۔

"چلو آؤ۔" وہ جیپ کی چابی جیب سے نکال کر کھڑا ہو گیا۔

"مم.....میں نہیں جاؤں گی۔" وہ بدک گئی۔

تمہارا ہی ٹھکانا کرنے جا رہا ہوں احمق۔" وہ جھلا گیا۔"گھر واپس نہیں جانا تو آخر کہیں تو

رہنا ہے نا.....کیا خلا میں لٹک کر عمر گزاروں گی۔" وہ ٹھیک ٹھاک ڈانٹ رہا تھا۔

"آپ.....میرے ساتھ دھوکا تو نہیں کر رہے؟" وہ ابھی تک مشکوک تھی۔

"اب چلو گی بھی یا اٹھا کر لے چلوں؟" اس نے دھمکایا۔

"نن.....نہیں۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں داتا دربار اپنے دوست میجر تنویر کے ساتھ آیا تھا۔تمہارے چکر میں اس غریب کو وہیں بھٹکتا چھوڑ آیا ہوں۔وہ وہاں میری شان میں قصیدہ پڑھ رہا ہوگا۔اسکا گھر یہیں ہے لاہور میں۔ہر ویک اینڈ پر مجھے زبردستی ساتھ لے جاتا ہے۔اس کی امی شبانہ خالہ بہت اچھی ہیں۔تنہا خاتون ہیں' بڑی نیک اور میٹھی طبیعت پائی ہے۔میرا خیال ہے تمہیں عارضی ٹھکانے کے لئے ان کے پاس چھوڑ دوں۔بھروسے کے لوگ ہیں۔اس صورتحال میں اس سے بہتر جائے پناہ اور کوئی نہیں ملے گی۔"

ناچار شاہین اس کے پیچھے چل پڑی اور جیپ میں بیٹھ گئی۔راستے میں گاہے گاہے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔وہ اندر سے ابھی تک ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے بہلا پھسلا کر اسلام آباد نہ لے جائے۔یہ ڈر تب ختم ہوا جب جیپ شہر کی حدود میں قدرے ہٹ کر ایک پرسکون سی سرسبز جگہ پر رکی۔بیل دینے پر ایک شفیق سی خاتون سفید کریپ کا دوپٹہ سر پر لپیٹے آنکھوں پہ نظر کی عینک لگائے ایک ہاتھ میں اخبار لئے باہر آئی تھیں۔سعد اسے اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر آیا تھا۔

"سلام خالہ جی۔"

"ارے سعد بیٹے! کیسے ہو تم۔" شبانہ خاتون کے چہرے پر خوش خلق مسکراہٹ اور انداز میں گرمجوشی تھی۔انکی نظریں جیپ کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھیں جیسے مزید کسی کے اترنے کی منتظر ہوں۔

"تنویر میرے ساتھ نہیں آیا' خالہ۔"

"اوہ اچھا۔تم اندر تو آؤ ناں۔یہ بچی کون ہے؟" انکی نظریں سلے ہوئے سفید یونیفارم میں ملبوس زرد اور سہما ہوا چہرہ لئے سر جھکائے آنسو روکتی اس کم سن سی دوشیزہ پر سوالیہ انداز میں جم گئی تھیں۔

"یہ میری کزن ہیں۔ اسی کے مسئلے کے حل کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ اندر چلئے ساری بات بتاتا ہوں۔"

شبانہ خاتون انہیں اندر لے آئیں۔

"بچی! تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چاہو تو ہاتھ منہ دھولو۔ شاید دور کے سفر سے آئی ہو۔" جہاندیدہ خاتون تھیں لڑکی کی صورت حال انہیں بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔

"نسرین! باجی کو میرے کمرے میں لے جاؤ۔" شبانہ کے بلانے پر دس گیارہ سالہ سانولی رنگت والی شوخ سی لڑکی اچھلتی ہوئی اندر آ گئی۔

"آؤ باجی جی۔" وہ شاہین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔

شاہین نے ہچکچاتی نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

"جاؤ شاہین۔" سعد نے نرمی سے کہا۔ "منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو لو۔" وہ خود بھی یہی چاہتا تھا تاکہ شبانہ خاتون سے تنہائی میں بات کر سکے۔

ان کے جانے کے بعد وہ سنجیدگی سے شروع ہو گیا۔

"خالہ! یہ بچی مصیبت زدہ ہے اور اسے ایک پناہ گاہ چاہئے۔ میں اسے آپ کے پاس لایا ہوں۔"

"تم پوری بات بتاؤ پہلے۔ کیا بپتی اس ننھی سی چڑیا پر۔ یہ تو بہت چھوٹی ہے۔" سعد نے ان کے انداز میں سچی ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بخاری فیملی کے بارے میں بہت مختصر سا تعارف کرانے کے بعد شاہین کے یہاں تک پہنچنے اور بھٹکتے پھرنے کی داستان بتائی۔

"خالہ!

فی الحال میں اسے کہیں بھی نہیں لے جا سکتا۔ اگر میرے والدین ان کے پڑوس میں نہ رہتے ہوتے تو ان کے پاس چھوڑ دیتا مگر ایسی صورت حال میں اسے اسلام آباد میں کسی جگہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کوئی محفوظ راستہ نہ پا کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہ بہت کم عمر ہے۔ نادانی میں اپنا ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھی ہے۔ ایسا نہ ہو جو "بچت" ابھی تک ہے وہ بھی نہ رہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میری بات!!" سعد کی نظر جھک گئی۔

"میں سب سمجھ رہی ہوں بیٹے۔" شبانہ خاتون نے گہری سانس لی۔ "عورت کی عزت اس

کی سب سے بڑی بچت ہوتی ہے۔ عمر بھر کی کمائی۔ تم جب تک چاہو گے یہ بچی میرے پاس رہے گی۔ اللہ کرے اس مسئلے کا کوئی قابل قبول حل نکل آئے۔ ویسے تم اپنے والدین کو آگاہ کر دو۔ تم انہیں اس بچی کے والدین سے بات کر کے صورتحال سمجھانے کے لئے کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے مسئلہ سلجھ جائے۔"

"شاید!" سعد سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن فی الحال یہ مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے والد بزرگوار آتش فشاں بنے ہوئے ہوں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چلتا ہوں خالہ۔ میں فون کرتا رہوں گا۔ ویک اینڈ پر تنویر کے ساتھ آؤں گا۔ شاہین کو بتا دیجئے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔" انہوں نے تسلی دی۔

☆☆☆☆☆

"آؤ خالہ! بڑے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔ یہ کیا لے آئیں؟"

ارشین ایزل پر جھکی انہماک سے پینٹنگ کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ قدموں کی چاپ پر مڑی تو خالہ برکتے کو اسٹیل کی پلیٹ سرخ کپڑے سے ڈھانپ کر ہاتھ میں تھامے اندر آتے دیکھا۔

"تمہارا منہ میٹھا کرانے آئی ہوں۔ خیر سے میرے گھر میں خوشی آئی ہے۔ دادی بن گئی ہوں میں۔ رانو کو اللہ نے بیٹا دیا ہے۔"

"ارے....." ارشین کو دلی خوشی ہوئی۔ "بہت بہت مبارک ہو خالہ! یہ تو سچ مچ مٹھائی والی خبر ہے۔ لو جلدی سے منہ میٹھا کراؤ۔ بڑے عرصے سے منہ کا ذائقہ نہیں بدلا۔"

خالہ برکتے نے ایک لڈو اس کے منہ میں ڈال دیا۔ خوشی سے ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"اور لاڈو کیسی ہے۔ اپنے گھر میں خوش تو ہے ناں۔ اس کو اطلاع پہنچائی آپ نے۔ وہ پھوپھی بن گئی ہے۔" ارشین کے لہجے میں مخلصانہ سا اشتیاق تھا۔

"ہاں! اس کے سسرال میں بھیجا ہے خیر دین کو۔ شام تک آ جائے گا۔"

خالہ برکتے کو سر تمیں بے ٹھکانہ کئے دے رہی تھیں۔ سادہ، بے خبر اور قناعت پسند لوگوں کے لئے زندگی کے چھوٹے چھوٹے احسان کتنے یادگار اور بڑے ہوتے ہیں۔

وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے خالہ برکتے کے محسوسات میں شریک رہی۔

"اچھا بیٹی! میں چلتی ہوں۔ ابھی سارے پنڈ میں لڈو بانٹنا ہیں۔ صدقہ دینا ہے۔ بابا سائیں کو نیاز بھجوانی ہے۔ بڑے کام ہیں ابھی۔"

خالہ برکتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑی ہو گئیں۔

"طیفا بتا رہا تھا' تم بھوتوں کے ڈیرے کے آس پاس بہت جاتی ہو۔ ارے بیٹی ایسی غلطی نہ کرو۔ اللہ نہ کرے کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔ اگر جنوں بھوتوں کی تم پر نگاہ پڑ گئی تو....."

"نہیں پڑتی مجھ پر نظر۔" ارشین ایک مدت کے بعد بے اختیار اور کھل کر ہنسی تھی۔ خالہ برکتے کو اس کا مذاق اڑانے کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ افسوس اور ملامت کے ساتھ دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔

"اچھا بیٹی! تمہاری مرضی۔" جاتے جاتے ان کی ٹھنڈی سانس ارشین کو گدگدا گئی۔

"لو بوا۔ لڈو کھاؤ۔" وہ باہر صحن میں آم کے درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر منہ پر دوپٹہ ڈالے لیٹی بوا کے پاس پلیٹ لے آئی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ گرمی کی شدت کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ بوا دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آم کی چھاؤں میں پڑ کے سوئی ہوئی تھیں۔ ان کی نیند عموماً بہت گہری ہوتی تھی۔

"تم کیسے اتنا سو لیتی ہو بوا! میں تو کوشش کر کر ہار گئی۔ دن کو چھوڑ رات کو بھی پلکیں آپس میں نہیں جڑتیں۔"

ارشین نے انہیں ہلا جلا کر دیکھا وہ بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔

"چلیں۔ نیندیں پوری کریں۔" وہ مسکرا کر اٹھ گئی۔ اسی لمحے باہر کا دروازہ بجا۔ کھولا تو داور کو ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ تھامے کھڑا پایا۔

"آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔ ویسے کیا تو ہوگا کہ نوکری کرنے والوں کے لئے چھٹی کا دن سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔" سلام دعا کے بعد وہ بشاش موڈ لئے اندر آ گیا۔

"سونے جیسا قیمتی بھی ہوتا ہے اور سونے کے لئے بھی۔" ارشین نے اضافہ کیا۔

"بوا کہاں ہیں؟ اچھا یہ رہیں۔ غالباً سوئی ہوئی ہیں۔" داور کو آم کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پہ سوئی ہوئی بوا نظر آ گئی تھیں۔ "آپ رکئے گا میں بیٹھنے والے کمرے کی چابی لاتی ہوں۔"

"کیا مطلب!" وہ برآمدے میں دیوار سے لگے بینچ پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑا حیرانی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ لوگ اپنے گھر کے کمروں کو تالے لگا کر رکھتے ہیں؟"

"نہیں۔ مگر یہ خاص کمرہ ہے اور عام حالات میں بند رہتا ہے۔" وہ یہ نہ بتا سکی کہ یہ کمرے کے مالک کا حکم ہے۔

"تو پھر بند ہی رہنے دیں۔ مجھے کسی "عام" کمرے میں لے چلئے جو عام حالات میں زیر استعمال رہتا ہے۔"

ارشین کچھ ہچکچا کر اسے سامنے والے چھوٹے سے سٹور روم میں لے آئی۔

داور نے چونک کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بان کی چارپائی' دو موڑھے (جو ارشین نے پچھلے ماہ خریدے تھے) اور ایک دیوار گیر الماری۔ سامنے لوہے کی سلاخوں اور لکڑی کے پٹ والی کھڑکی کھلی تھی جہاں سے قبرستان کا منظر نظر آ رہا تھا۔

عجیب بے کیف اور بے چارا سا ماحول تھا۔ داور نے تو سادگی سے کہہ بھی ڈالا۔

"بھئی۔ مجھے تو یہاں بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کیسے رہ لیتی ہیں۔ میرا مطلب ہے آرٹسٹ لوگ تو بڑے نازک خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔"

ارشین کے ہونٹوں پر بے معنی مسکراہٹ آ کر چلی گئی۔

داور نے موڑھا سنبھال لیا تھا اور اب وہ بیٹھا غور سے ایزل پر بنی پینٹنگ دیکھ رہا تھا جسے ارشین آخری ٹچ دے رہی تھی اور غور سے دیکھتے ہی اچانک اسے وہ احساس جاگا تھا۔

اس نے ایک نظر پینٹنگ کو اور پھر اسے دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" ارشین کو وہ گہری الجھن میں گرفتار نظر آیا۔

"یقیناً آپ کو پینٹنگ کا سبجیکٹ مختلف لگا ہوگا۔ میرا شروع سے یہی سٹائل ہے۔ اس طرح کالے آؤٹ بنا کر کام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اندر کسی تہہ میں لپٹے ہوئے پوشیدہ احساسات کاغذ کے سینے پر سمٹ آئے ہیں۔"

وہ اپنے طور پر یہی سمجھی تھی کہ الجھن کا سبب پینٹنگ ہے۔

"میں اس طرح کا آرٹ ورک دیکھ چکا ہوں پہلے۔ مگر کہاں؟" وہ بڑبڑایا۔ کچھ سال پہلے

میں اخبار میں کلچرل رپورٹنگ کے شعبے میں کام کرتا تھا' انہی دنوں ایک نمائش ہوئی تھی اور کسی خاتون مصور کی تصویر کو فرسٹ پرائز ملا تھا۔ اس تصویر کی کیمرہ فوٹو گراف اخبار میں چھپی تھی۔ اس پینٹنگ کا عنوان تھا..... آں....." وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

"انسان کی تلاش۔" ارشین نے آخری سٹروک لگاتے ہوئے آہستگی سے جملہ مکمل کیا۔

داور بری طرح چونک پڑا۔

"بالکل یہی تھا۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "اور اب اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ تصویر بھی ان ہی ہاتھوں سے تکمیل پائی تھی جو اس وقت برش سنبھالے ہوئے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے ہوئے عین اس کے سامنے آ کر رک گیا۔

"آپ کون ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"جو بھی ہوں آپ کے سامنے ہوں۔" وہ نظریں چرا گئی۔

"نہیں! کم از کم اس درجہ انسان شناسی تو بہر حال آتی ہے مجھے۔ آپ اس خطے کا حصہ نہیں ہیں۔ اتنا تو میں جانتا ہوں بلکہ یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا اٹھنا بیٹھنا اور رابطہ و واسطہ مہذب اور اعلیٰ قسم کی سوسائٹی کے افراد کے ساتھ رہا ہے۔ کوئی حادثہ آپ کو یہاں تک لایا ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں ناں؟"

ارشین تردید نہ کر سکی تاہم مزید وضاحت بھی نہیں کی۔ خاموشی سے اپنا کام مکمل کرتی رہی۔

"مجھے آپ کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ کیا آپ میرا تجسس دور کر سکتی ہیں؟ میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ مہران کو رپورٹ بھجوا دی ہے۔ شاید کل تک بھوتوں کے اس ڈیرے کے تمام رازوں سے پردے اٹھ جائیں اور سادہ لوح لوگوں کا خوف و ہراس ختم ہو جائے۔ میں پرسوں چلا جاؤں گا۔ میرا خیال ہے' آپ کی ذات سے متعلق سچ کا مجھ تک پہنچنا آپ کے لئے خطرے کا باعث نہیں بنے گا۔"

"یہ سچ آپ تک کیا کسی تک بھی پہنچ جائے' میرے لئے خطرے یا نقصان کا سبب نہیں بنے گا۔ اب مزید نقصان کیا ہو گا؟"

وہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی۔

"ویسے بہتر ہو گا' یہ سوال آپ اپنے ایس ایس پی دوست مہران آفریدی سے کریں۔ ان

کے پاس اس کا مکمل جواب بھی ہے اور جواز بھی۔ یہ گھر ان ہی کا ہے۔" اس نے گویا دھماکا کیا۔

"جگہ مہران کی ہے؟" داور کے سینے میں "کچھ" ڈوبنے لگا۔

"جی ہاں۔ انہوں نے یہ ٹھکانا میرے قیام کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہی مجھے ساتھ لائے تھے اسلام آباد سے۔ آپ جان ہی گئے ہوں گے' کوئی غیر آدمی کس رشتے سے' کسی کی بیٹی کو گھر سے وداع کرا کے لاتا ہے۔"

جیسے چھت کی بہت ساری کڑیاں تڑخ سے داور کے سر پر آ گری تھیں۔ وہ سلو موشن میں دوبارہ موڑھے پر ٹک گیا۔ کچھ دیر تک یوں سر جھٹکتا رہا جیسے کچھ سمجھ نہ پا رہا ہو پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا تاہم چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔

"تو آپ وہ والی ارشین ہیں۔ ارشین بخاری۔ مصوری کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام۔" چہرے اور آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجے کی بشاشت بھی غائب ہو گئی تھی۔

"کمال ہے۔ اتنا احمق اور کم عقل بھی نہ ہو کوئی۔ سامنے کی بات تھی اور میرے ذہن میں نہ آئی۔" وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"مجھے یہ تو پتا تھا کہ مہران کا آبائی گاؤں یہیں کہیں ہے اور وہیں اس نے اپنی بیوی کو رکھا ہوا ہے۔ بیوی اسلام آباد کی مشہور مصور' کالج کی لیکچرار اور پڑھی لکھی خاتون ہیں اور اتنی معلومات کے باوجود میں دھوکا کھا گیا۔ ایک مصور اور پڑھی لکھی خاتون کو ایک ویرانے میں پڑے دیکھ کر اس سے مل کر' اسے دوسروں سے مخاطب پا کر بلکہ اپنی بات کا بار بار اظہار کرنے کے باوجود رشتے کا یہ کنکشن نہ ملا سکا۔ تف ہے بھئی میری ذہانت پر۔ میں آج تک خود کو بڑا افلاطون سمجھتا تھا۔ بڑا ناز تھا اپنی سمجھ بوجھ پر۔ چہ چہ۔" وہ خود کو ڈانٹ رہا تھا۔ انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ ارشین کو ہنسی آ گئی۔

"اللہ آپ کو ہمیشہ ہنسی سے نوازے۔ خاتون یہ تو ارشاد فرمائیے' صبر کا کون سا نشہ آور گھونٹ پی کے ایک سال سے اندھیر نگری کے اس بھوت بنگلے میں بسیرا کئے ہوئے ہیں۔ میں تو بطور مہمان بیٹھتے ہوئے بھی سخت ناگواری اور تکلیف محسوس کر رہا ہوں یہاں۔ داد دیتے ہیں آپ کی ہمت اور بہادری پر۔"

"میں یہاں سکون سے ہوں۔ یا کم از کم عادی ہو گئی ہوں اس طرح رہنے کی۔" وہ مختصراً بولی۔

"لیکن یہ ظلم ہے اور آواز اٹھانا آپ کا حق تھا۔"

"چیخ چلا کر یا رونے دھونے کے علاوہ بھی ظلم کے خلاف احتجاج کیا جا سکتا ہے۔ اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آواز اٹھا کر شور برپا کرنے سے بہتر ہے خاموشی سے عمل کی آنچ تیز کر دو۔ جب تک انسان کا "اندر" زندہ اور بیدار ہے اس کے باہر کا انسان نہیں مر سکتا۔ ہتھیار ڈالنا شکست نہیں کہلاتا کیونکہ ہار جیت تو میدان عمل کا حصہ ہوتی ہے اپنی شکست کو تسلیم کر لینا اصلی شکست ہوتی ہے۔ لڑائی تلوار کی نوک سے نہیں دل کے اندر بھڑکنے والے جوش کے تیر و تلوار سے لڑی جاتی ہے۔ جنگ انتقام اور دشمنی اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک کہ دل ایسا نہیں چاہتا۔ مجھے شکست نہیں ہوئی اس لئے کہ میں نے ابھی تک کسی موڑ پر شکست تسلیم ہی نہیں کی۔ میرے اندر آج بھی اتنی ہی ہمت، سچائی، بہادری اور خود اعتمادی ہے جو ہمیشہ سے میری ذات کا حصہ رہی ہے۔"

"اس سچائی اور مضبوطی کو مہران سے کیوں نہ منوا سکیں؟"

داور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دیوار سے ٹیک لگائے موڑھے پر بیٹھا اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

"جو لوگ آپ کی زندگی میں آنے والے کمزور لمحوں کے گواہ ہوتے ہیں ان کے سامنے سر اٹھا کر اعتماد سے بات کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کا تحقیر آمیز اور استہزائیہ انداز آپ کو کم تر اور بے حیثیت ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کوشش کے باوجود اپنی صفائی یا دلیل نہیں پیش کر سکتے اور یوں بھی میں ایس ایس پی صاحب سے تمغہ جرات وصول کرنے کی کوئی تمنا نہیں رکھتی۔"

"میں آپ کے محسوسات کو سمجھ سکتا ہوں۔" داور نے سچائی سے کہا۔ "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو شاید میں بھی ایسی صورت حال میں ذہنی طور پر معذور ہو کر رہ جاتا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ شدید ذہنی جھٹکے کے بعد انسان سرد پتھر کی مانند ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبات کا خانہ خالی اور خاموش ہو جاتا ہے۔ وہاں سناٹے بولنے لگتے ہیں۔ لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ آپ کے مہر بہ لب رہ کر خود پر ظلم کیا۔ آپ کو اپنے حق کے لئے بولنا چاہئے تھا۔ اپنی بات زبردستی اس کے گوش گزار کرنی چاہئے تھی کیونکہ غلط فہمیاں اگر دور نہ کی جائیں تو بدگمانیوں کا روپ دھار کر زندگی کی لطافت میں تلخیوں کا زہر گھول دیتی ہیں۔ آپ کسی بھی طرح سہی اصل بات اس تک پہنچا دیتیں تو شاید

صورتحال مختلف ہوتی۔"

"نہیں! صورتحال پھر بھی یہی رہتی۔" اس نے یقین سے کہا۔

"جن لوگوں کو شروع سے یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں ہمیشہ حق پر اور درست ہوتے ہیں، وہ لوگ کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کیا کرتے۔ وہ اپنا ہر عمل جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کا ہر فتویٰ اور اندازہ صحیح ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیال کبھی غلط نہیں ہوتے۔"

"اب آپ نے آگے کیا سوچا ہے؟"

داور گہری سوچ میں گم گویا ہوا۔

"اس سے پہلے میں نے ہمیشہ دوسروں کے لئے سوچا۔ اور کیا اب میں اپنے لئے کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ اپنے لئے ایک نئی دنیا آباد کرنا چاہتی ہوں۔ کب تک دوسروں کے حصے کے چپو چلا کر کشتی کھیتی رہوں۔ اب میری زندگی کا سفینہ اپنی روانی چاہتا ہے۔ میں اپنے ساتھ مزید ظلم نہیں کروں گی۔"

داور سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

"تم نے تو کمال کر دکھایا۔ میں نے اپنی رپورٹ میں خصوصی طور پر تمہارا تذکرہ کیا ہے۔ حکام بالا تک وہ رپورٹ پہنچا دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ روز میں تمہیں جی ایچ کیو سے کال آئے۔"

"ہم کو ان تمغوں ستاروں سے کیا غرض۔ حسین و جمیل ایس ایس پی صاحب! جو اپنا فرض تھا بجا لائے۔ بس۔" داور نے ہاتھ جھاڑے۔ وہ دو دن پہلے اسلام آباد پہنچا تھا۔ وسن کوٹ کے نواحی گاؤں میں بارڈر کے پاس منشیات کے اس خفیہ ذخیرہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مہران نے داور کی تحقیقات مکمل ہو جانے کے بعد اس کی تیار کردہ رپورٹ پر فوری ایکشن لیا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ حکام سے صلاح و مشورے کے بعد مقامی پولیس آفیسرز کو اعتماد میں لے کر اڈے پر چھاپہ مارا گیا تھا جو کہ مکمل طور پر کامیاب رہا۔ اگلے دن کے اخبارات میں اس واقعے کو تفصیلی طور پر کوریج دی گئی تھی۔

داور اس وقت مہران کے گھر پر موجود تھا۔

"اور کیسی گزر رہی ہے تمہاری "دوسری" ازدواجی زندگی۔" داور نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس سے سوال کیا۔ لہجے میں لطیف سی چبھن تھی جسے مہران نے بدرجہ اتم محسوس کیا۔

"چوٹ کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔" اس کے انداز میں تنبیہ تھی۔

"تم نے بھی تو چوٹ لگانا نہیں چھوڑا۔" وہ برجستگی سے گویا تھا۔

"کیا وہ بھیڑ بکری ہے جسے اپنے نام کے کھونٹے سے باندھ رکھا ہے؟ نہیں بسانا چاہتے تو آزاد کر دو۔ اسے زندگی اپنی خواہش سے گزارنے کا حق دو۔ اس طرح خلا میں کیوں لٹکا رکھا ہے۔ تم اپنی مرضی کا ساتھی منتخب کر کے اس کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر چکے ہو۔ اپنی جگہ مطمئن ہو۔ انتقام کے الاؤ پر اب تک کافی سے زیادہ چھینٹے پڑ چکے ہوں گے۔ بس کرو بے حسی کا یہ کھیل۔"

مہران داور کو اپنے سامنے اکھڑتے دیکھ کر ایک لمحے کو دنگ رہ گیا تھا۔

"وہ" کہاں سے ٹپک پڑی اس سارے قصے میں۔

اس کو کیسے یاد آ گئی۔

کہیں اس سے مل تو نہیں چکا۔

"اس کے وکیل بن کے آئے ہو تو اس کا مطلب ہے مل بھی چکے ہو۔" مہران نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سپاٹ انداز میں قیافہ لگایا۔

"وہ ہے ہی ایسی۔ یہی ایک جادو سیکھا ہے اس نے۔ اپنی ادا و انداز اور نام نہاد معصومیت سے دوسروں کو قائل کر لینے کا فن اسے خوف آتا ہے۔ ایک تم ہی کیا جو بھی اس سے ملتا ہے اسے اپنی مظلومیت و حقانیت کے جال میں الجھا کر میرے خلاف کر دیتی ہے۔ نجی نازش سفیان ناظر سب اس کی حمایت میں میرے مخالف بن جاتے ہیں۔"

مہران کا لہجہ کڑوا تھا۔

"میں کیوں چھوڑوں اسے۔ کیوں اس کی زندگی آسان کروں؟ کیوں لینے دوں اسے سکھ کا سانس۔ میرا سکون قرار چھین کے مجھے بھی تو بے سکون کر رکھا ہے اس نے۔"

"تمہارا سکون چھن کہاں سے چھن گیا۔ دوسرا بیاہ کر کے کیا زندگی کا لطف اٹھا رہے۔"

مہران اس کے سوال پر خاموش رہا۔

"یہ زیادتی ہے۔ ناانصافی ہے اس کے ساتھ۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔ تم تو بہت پرہیزگار

اور مذہبی ہو۔ یقیناً معلوم ہو گا کہ اسلام میں دونوں بیویوں کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تم قانون کے رکھوالے ہو کر بھی لاقانونیت دکھا رہے ہو۔ یا تو اسے بیوی بنا کر عزت اور مقام دو یا پھر شرافت کے ساتھ چھوڑ دو۔ وگرنہ اس معاملے میں یقیناً تمہاری پکڑ ہو گی۔ اگر یہاں نہیں تو خدا کی عدالت میں جواب طلبی اور مواخذہ ہو گا۔ اس عمل سے تم بچ نہیں سکو گے۔"

داور اتنا سنجیدہ کبھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

"ناانصافی اور بے ایمانی میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ میں دھوکا دہی کا کیس کس عدالت میں پیش کروں؟ کھوٹی عورت اور کھوٹے پیسے کی قیمت ایک سی ہوتی ہے۔" وہ زہر خند ہوا۔

"تم نجانے کون سی صدی کی بات کر رہے ہو؟ اتنے غیر حقیقت پسندانہ اور انتہائی قسم کے خیالات آج کے زمانے میں ناقابل عمل تصور کیے جاتے ہیں۔ کہاں سے ایک ایسا بندہ بشر ڈھونڈا جائے جس کے ذہن میں کسی دوسرے کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہو۔ نہیں ملے گا ایسا کوئی صاف شفاف ماڈل۔ یہ دنیا ہے اور یہاں ہر قدم پر اچھے برے لوگ ٹکراتے رہتے ہیں۔ دامن بچا کے گزرنے کے باوجود بسا اوقات راستے کی جھاڑیاں لباس میں الجھ جاتی ہیں مگر ان کانٹوں کو احتیاط سے چن کر الگ بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ کیا اتنی سی بات کے لیے سارا لباس ضائع کر دیا جاتا ہے؟"

"نہ تم میرا نقطہ نظر سمجھ سکتے ہو اور نہ میں تمہاری توجیہات مان سکتا ہوں۔ تو لاحاصل بحث سے کیا فائدہ!"

مہران بے زاری سے گویا ہوا۔

داور نے اس کی طرف دیکھتے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

☆☆☆☆☆

راشد صاحب ہکا بکا "بخاری لاج" کے گیٹ پر کھڑے تھے۔

"یہ کیا۔ بخاری صاحب! آپ مکان چھوڑ کر جا رہے ہیں کیا؟" سوزوکی کیری پر ضروری سامان لادا جا چکا تھا۔ دیگر چیزیں بیچ دی گئی تھیں البتہ فرنیچر اسی طرح پڑا تھا۔

"ہاں۔" ان کا لہجہ تھکا ہوا اور دھیما تھا۔ "ہم شہر چھوڑ کر گوٹھ جا رہے ہیں۔ ویسے تو کوئی خاص چیز باقی نہیں رہ گئی البتہ فرنیچر جوں کا توں رکھا ہے۔ ہو سکے تو گھر کا دھیان رکھیے گا۔ کبھی دوبارہ اسلام آباد آنا ہوا تو اسے بھی بکوا دوں گا۔ ابھی ٹائم نہیں ہے اور نہ اتنا دم ہے۔"

آناً فاناً اسلام آباد سے سندھ کے پسماندہ سے گوٹھ میں واپس لوٹ جانے کا فیصلہ راشد صاحب کے لیے نہایت حیران کن تھا' تاہم بخاری لاج کے مکین گزشتہ کئی مہینوں سے جن مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس کے پیش نظر راشد صاحب نے نازک معاملات پر پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"بہتر ہوتا اگر مکان کرایے پر چڑھا دیتے۔ اس طرح بند پڑا رہے گا تو صفائی ستھرائی نہیں رہے گی۔ کرایہ داروں کی موجودگی میں گھر کھلا رہے گا۔"

"نہیں۔ کرایے پر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہمیں۔"

راشد صاحب نے خاموشی سے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ایک کام کیجیے گا۔ امبرین کو گاہے بگاہے دیکھنے اور حال چال دریافت کرنے کے لیے بارہ کہو جاتے رہیے گا۔"

"بارہ کہو؟" وہ ناسمجھی کی کیفیت میں انکی صورت دیکھنے لگے۔

بخاری صاحب کے کندھے ڈھلک گئے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔

"وہ تقریباً تقریباً ختم ہو چکی ہے ڈاکٹرز جواب دے چکے ہیں۔ انہوں نے یہ تجویز دی تھی کہ وہ نشے کی اس اسٹیج پر ہے جہاں سے واپسی کے لیے کسی اسپیشل ڈرگ کنٹرول کلینک یا سینٹر میں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ایڈمٹ رکھنا ہوگا۔ شاید طویل علاج اور دیکھ بھال کے ذریعے وہ صحت یاب ہو جائے۔ انہی کے صلاح مشورے سے اسے بارہ کہو میں واقع سینٹر میں ایڈمٹ کرایا ہے۔ وہاں ڈاکٹر رضا ہوتے ہیں۔ سنا ہے ان کے ہاتھ میں بہت شفا ہے۔ وہاں اور بھی اس طرح کے بے شمار مریض ہیں ہم نے چھ ماہ کے ڈیوز جمع کرا دیے ہیں۔ بیچ میں چکر لگا کے عدنان یا میں اسے دیکھنے آتے رہیں گے۔"

ان کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ یوں لگ رہا تھا' چند ماہ میں وہ سو سالہ لرزہ براندام اور ضعیف و لاچار' رعشہ زدہ بوڑھے کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔

راشد صاحب کو بخاری لاج کے در و دیوار پر بہت ترس آ رہا تھا۔ کوئی خوشی بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

سامان رکھنے کے بعد عدنان' صباحت اور ثمرین بک کروائی ہوئی ٹیوٹا ہائی ایس میں بیٹھ

گئے۔ عدنان نے گیٹ پر موٹا سا تالا لگا دیا تھا۔

رقیہ بیگم بھی چلی آئی تھیں۔

"میری کوئی بیٹی واپس لوٹی تو میری طرف سے تم میکے کا فرض ادا کر دینا۔"

بہت ضبط کے باوجود ان کی سسکیاں نکل گئیں۔

"صبر بہن' صبر کرو۔" رقیہ بیگم نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ ان کی اپنی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"کیا بتاؤں گی گوٹھ والوں کو' اپنے جگر کے تین ٹکڑوں کو کہاں چھوڑ آئی۔ کن کے نام کر آئی اولاد کی دولت۔"

"رونے سے کوئی واپس تھوڑی آ جاتا ہے' صباحت بہن۔"

"میں کیا کروں۔ کس طرح سمجھاؤں خود۔ جانے کہاں چوک ہو گئی اور زندگی نے اس بھول کی اتنی بڑی سزا دی کہ....." وہ بلک رہی تھیں۔

"بس کریں..... دیکھیں بچی پریشان ہو رہی ہے۔"

انہوں نے سہارا دے کر صباحت بیگم کو سیٹ پر بٹھایا اور پریشان صورت لیے بیٹھی ثمرین کے گال تھپکے۔ بالآخر گاڑی روانہ ہو گئی۔ پیچھے تھکا ہارا شکست زدہ اور ویران بخاری لاج چھوڑ کر۔

شاید مکان بھی اپنے مکینوں کا عکس ہوا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

"السلام علیکم سعد بھائی۔ آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں۔" شاہین اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھ کر لپک کر اس کی طرف آئی تھی۔

"بھئی ڈیک اینڈ سے پہلے کس طرح آ سکتا تھا۔" وہ خوشدلی سے مسکرایا۔

"اور تم ٹھیک رہیں' دل لگ گیا ہے یہاں؟"

"جی بس۔" وہ ناچار مسکرا دی۔ "دل لگے نہ لگے رہنا تو یہیں ہے۔ گھر کی طرف واپسی کی تو کوئی راہ نہیں بچی لیکن سعد بھائی! میں اس طرح بیکار نہیں بیٹھنا چاہتی۔ میرے پاس اپنے کالج کا بیک موجود ہے۔ ایک دو کتابیں اور چاہیے ہوں گی کیوں نہ میں اپنا ایف اے مکمل کر لوں؟ شبانہ آنٹی کا بھی یہی مشورہ ہے بلکہ وہ مجھے اسٹڈیز میں ہیلپ بھی کرا دیں گی۔ وہ کہہ رہی تھیں....."

"ٹھیک ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔"

اس دوران شبانہ خاتون بھی آ گئیں۔

"اور بھئی کیا گپ شپ ہو رہی ہے۔ میری شکایتیں تو نہیں لگ رہیں؟"

"شکایتیں اور آپ کی؟" شاہین نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"ایک ماہ ہوا ہے آپ کے پاس آئے ہوئے۔ مگر یوں لگتا ہے صدیوں کی آشنائی رہی ہو۔"

"بیٹیاں گھروں کی رونق ہوتی ہیں۔ میرا تو گھر سج گیا ہے اس کے وجود سے۔" انہوں نے پیار سے اس کی ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" شاہین اٹھ گئی۔

"یہ سب سے اچھی بات کہی ہے خاتون آپ نے۔" تنویر نہا دھو کر فریش ہو کر گنگناتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا۔

"آپ تو چائے پر جیتے ہیں۔ اگر آپ کا بلڈ ٹیسٹ کرایا جائے تو آپ کی شریانوں میں خون سے زیادہ چائے دوڑتی ہوئی پائی جائے گی۔"

شاہین نے اسے چڑایا۔ وہ اس ایک ماہ کی مدت میں ماں اور بیٹے دونوں سے گھل مل گئی تھی۔ یوں بھی میجر تنویر سادہ دل، خوش مزاج اور ملنسار قسم کا بندہ تھا۔ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ اس کی پچھلے سال شبانہ کے جاننے والوں کے ہاں منگنی ہوئی تھی۔ صالحہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں فرسٹ ائیر میں پڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں کی فیملی یہیں لاہور میں رہتی تھی۔ شاہین ایک بار شبانہ آنٹی کے ساتھ صالحہ کے ہاں جا چکی تھی۔ شبانہ نے اسے اپنی دور کی عزیزہ کی بیٹی کے طور پر متعارف کروایا تھا۔

"اور بلڈ ٹیسٹ کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ گھر کا ڈاکٹر جو موجود ہے۔" شبانہ آنٹی نے بھی چھیڑ چھاڑ میں شاہین کا ساتھ دیا۔ وہ بڑی زندہ دل اور کھلے دماغ کی خاتون تھیں۔ بچوں کی خوشی میں خوش رہنے والی تھیں۔

"آنٹی! کب تک ارادہ ہے موصوف کے سر پر سہرا سجانے کا۔" سعد نے شرارتی نظروں

سے تنویر کو دیکھا۔

"ابھی بچی کا میڈیکل مکمل ہونے میں دو سال باقی ہیں اس کے بعد ہی شادی ہوگی۔ اس کی بھی یہی مرضی ہے۔"

"میری شادی کی فکر چھوڑو یہ بتاؤ خود کب گھر آباد کر رہے ہو؟ مجھ سے عمر میں دو تین سال بڑے ہو۔ اصولاً پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہونے چاہئیں۔" تنویر نے حساب برابر کیا۔

سعد ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال گیا۔

"جب قسمت میں لکھا ہوگا ہو جائے گی شادی وادی۔"

"مگر بچے! ابھی عمر ہے تمہاری۔ پھر ماشاء اللہ برسر روزگار ہو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو، کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں ہے۔ ہر طرح سے شادی کے لائق ہو۔ ماں باپ کی خوشیوں پر پانی کیوں پھیرتے ہو۔ شادی نہ کرنے کی ضد قطعی نامناسب ہے۔"

شبانہ آنٹی نے سمجھایا۔ وہ اپنے تئیں اکثر اسے اس نوعیت کے لیکچر دیتی رہتی تھیں۔

"جو مرضی کہہ لیں۔ ادھر کون سا ان کے کان پر جوں رینگنے لگی۔" تنویر نے سعد کے کانوں کو ہولے سے مروڑی۔

"اوں ہوں بدتمیزی نہیں۔"

"کس کے انتظار میں بڑھے ہو رہے ہو۔ یہ تو بتا دو اللہ کے بندے۔ ہم جا کر اسی کی منت سماجت کریں۔" شبانہ آنٹی کسی کام سے باہر گئیں تو تنویر کی بن آئی۔

"منتوں سے کب کوئی زندگی میں واپس لوٹا کرتا ہے۔" سعد کی آنکھوں میں ایک شبیہہ سلگنے لگی۔

"کہاں رہتی ہے وہ؟" تنویر سنجیدہ ہو گیا۔

"دل میں، دماغ میں، سوچ میں، صبحوں میں، شاموں میں، سانسوں میں۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟" تنویر ہکا بکا اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ "اتنا آگے جا چکے ہو۔ کیا "اس" کو خبر ہے۔"

"ساری خبریں ہیں اس کو مگر بے خبر بن کے رہنا اور خود فریبی و خوش امیدی کا خول چڑھائے رکھنا اس کی عادت ہے۔"

سعد کی نظریں خلا میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

"نام کیا ہے؟" تنویر نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارشین!" سعد نام بتا کر چپ ہو گیا۔

"شادی کیوں نہیں ہو سکتی یا ہو سکی؟"

"کیونکہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔"

"ویری سیڈ۔ پھر تو تمہیں اس کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔"

"جس کے ساتھ ہوئی ہے اس نے بسایا نہیں اور میرے ساتھ وہ بسنا نہیں چاہتی۔"

"ناکام شادی۔" تنویر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "گویا تمہارے لیے امید کا دیا روشن ہے۔"

"دیا جلے یا بجھے اس دل کو تو بس اسی ایک رستے پہ چلنا ہے۔ ساری عمر آخری سانس تک۔"

تنویر سعد کا پرعزم چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا نایاب۔" آفاق کی نظروں میں شکایت اور رنج کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"میں تین چار دن پہلے امریکہ سے واپس لوٹا ہوں۔ بابا نے تمہاری شادی کا بتایا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کراچی سے جو پہلی فلائٹ ملی لے کر ادھر دوڑا ہوں۔ شکر ہے تم گھر پر مل گئیں ورنہ تمہارے سسرال آنا پڑتا اور جانے وہاں میں کس طرح ری ایکٹ کرتا۔"

"آفاق! پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں تھے۔ میں شادی کر چکی ہوں تم بھی اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔" نایاب نے سکون سے سمجھایا۔

"مگر کیسے؟" وہ جیسے بے چین ہوا۔ "پہلے مجھے وہ گزرے لمحے واپس لوٹا دو جو میں نے اور تم نے اکٹھے گزارے تھے۔ میں دو سال یہاں رہا ہوں اور ان دو سالوں میں تم سے دل کا سچا اور گہرا رشتہ استوار کر لیا تھا۔ تم میرے جذبوں سے باخبر تھیں۔ یاد کرو ہم کتنا گھوما کرتے تھے۔ اکٹھے لنچ کرتے تھے۔ ہوٹلنگ کرتے تھے۔ اسلام آباد کے چپے چپے پر ہماری رفاقتوں کے نشان ثبت ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ مجھے اسٹڈیز کے لیے امریکہ کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل گیا اور تمہیں پولیس میں جاب مل گئی۔ اس طرح عارضی طور پر ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے مگر ہمارے دل تو ایک

دوسرے سے دور نہیں ہوئے تھے۔ میرے کتنے کارڈز اور لیٹرز تمہارے پاس ہیں اور تمہارے بھیجے گئے برتھ ڈے اور دیگر وش کارڈز بھی میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کس طرح اتنا بدل گئیں۔"

آفاق کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اتنی دوستی تھی ہم دونوں میں۔ ہر طرح کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے کبھی براہ راست "ہاں" میں جواب نہیں دیا تھا مگر تمہارا ہر ہر انداز رضامندی کا غمازی کرتا تھا۔ خود انکل نے اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ عنقریب میرے والدین تمہارے ہاں آنے والے تھے پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ تم نے اس طرح مجھے ہرٹ کیوں کیا۔"

"آفاق! جو گزر چکا وہ گزر چکا۔ خواہ مخواہ بحث سے فائدہ۔ میرے تمہارے ستارے نہیں ملتے تھے۔ ٹھیک ہے تم سے دوستی تھی۔ بے تکلفی تھی بہت سا وقت ہم نے اکٹھے گزارا مگر ساری زندگی اکٹھے گزارنا ممکن نہیں تھا۔ اور....."

شاید نایاب کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر باہر دروازے پر کھڑے اسے میکے سے گھر لانے کے لیے ادھر آئے مہران کے اندر کا شور اتنا بڑھ گیا تھا کہ مزید سننا ممکن نہیں رہا تھا۔

کھری عورت خالص اور پاکیزہ ان چھوئی سوچوں کی حامل۔ اس کے اپنے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

"آپ اکیلے ہی آ گئے ہو۔ بھول گئے کیا آپ نے کہا تھا واپسی پر نایاب کو لیتے آئیں گے۔" نئی لان میں ناظر سے گلاب کے پودوں کی نئی قلمیں لگوا رہی تھیں۔ مہران کو اکیلے جیپ سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ حیرت سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"ادھر نہیں گیا۔" مہران کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے چہرہ انتہائی سرخ آنکھیں بھی لال ہو رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹے۔" وہ انہیں حواس سے باہر لگ رہا تھا۔

"جی!" وہ اندر کی سمت بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔

"بھائی جان کا موڈ خراب لگ رہا ہے۔" ناظر نے سرگوشیانہ کہا۔ اس کی نگاہیں جاتے ہوئے مہران کی پشت پر تھیں۔

"کام کی تھکن ہوگی۔ آپ ایسا کرو ناظر! اوپر سے سفیان کو بلاؤ اسے کہو گاڑی کی چابی لیتا آئے۔ میں اس کے ساتھ چل کر بہو کو لے آتی ہوں۔ وہ انتظار میں ہوگی۔"

وہ جس طرح کھڑی تھیں ویسے ہی چل دیں اور اسے لے آئیں۔

درنایاب اپنے مخصوص موڈ میں ہلکے پھلکے انداز میں بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔

"السلام علیکم۔" بستر پر آڑے ترچھے لیٹے مہران کو دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔

"ارے! آپ مجھے لئے بغیر گھر آ گئے؟ میں انتظار میں تھی کہ آفس سے واپسی میں اس طرف آئیں گے۔"

وہ نارمل انداز میں بات کر رہی تھی مگر جونہی مڑ کر مہران کی طرف دیکھا اس کے اندر خوف کی اک لہر دوڑ گئی۔ وہ بالکل سپاٹ لیٹا تھا۔ چہرہ عجیب پراسراری کیفیت کا اظہار کر رہا تھا اور آنکھیں آنکھوں میں جیسے الاؤ بھڑک رہے تھے۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کے قریب آ گئی۔ "آ۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی "ٹھیک تو ہیں نا آپ؟"۔

مہران اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنی لہورنگ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کیا تمہیں سچ بولنا آتا ہے؟" لہجہ عجیب سی برفیلی کیفیت لیے ہوئے تھا۔

"جی۔۔۔!" وہ بری طرح گھبرا گئی۔ دل وحشت زدہ انداز میں دھک دھک کرنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہارے اس گھر میں آنے کے پہلے ہی روز تم سے کیا کہا تھا؟"

نایاب بالکل بھی نہ سمجھ سکی۔

"ساری دنیا کھنگال کر ایک عالم کو پرکھنے کے بعد میں نے تمہارا انتخاب کیا تھا۔

جانتی ہو کیوں؟ صرف ایک خوبی کے پیچھے کہ تم ایک ایسی عورت ہو جو اندر باہر ہر لحاظ سے کھری ہے۔ جس کے ظاہری و باطنی آئینے کسی کی پرچھائیں سے محفوظ ہیں۔ جس کا جسم اور دل دونوں کورے ہیں۔"

درنایاب کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا۔

اسے اب کچھ کچھ حقیقت سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

کیا انہیں آفاق کے بارے میں کوئی بھنک پڑی ہے۔۔۔!

"غلط بیانی دھوکا دہی ہے۔ جان بوجھ کر پردہ پوشی کرنا جھوٹ کہلاتا ہے۔ تم نے اپنا ماضی

مجھ سے کیوں چھپایا؟ تمہاری کسی مرد سے دوستی رہی تھی۔ یہ بات تمہیں مجھ تک پہنچانی چاہیے تھی۔ تم نے چھپایا گویا وہ واقعی چھپانے والی بات تھی۔ اگر تمہارے دل میں چور نہ ہوتا تو تم ایسا کیوں کرتیں۔"

"میری بات سنیے مہران! میں۔۔۔" وہ لب کاٹ کر کچھ کہنے کو تھی مگر مہران نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"لفظوں کو بلاوجہ غلط جگہ پر استعمال کر کے ان کی اہمیت ختم نہ کرو۔ ایک مرد تمہاری زندگی میں رہا تھا جس کے بارے میں تم نے شادی کے لیے سوچا تھا۔ بھلے سے لمحاتی طور پر ہی سہی بلکہ دیکھا جائے تو تم نے اسے جھوٹی آس دلا کر فریب میں مبتلا کر کے اتنے عرصے تک بے وقوف بنایا۔ اگر تمہارے دل میں اس کی جگہ نہ ہوتی تو تم بہت شروع میں انکار کر چکی ہوتیں۔ تم نے کچھ دیر کو ہی سہی اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچا تھا۔ پھر میری شکل میں بہتر چوائس سامنے آ گئی تو اس کو بھول بھال کر میری زندگی میں شامل ہو گئیں۔"

وہ بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ بات کر رہا تھا مگر اس کا ہر لفظ درنایاب پر قیامت گزر رہا تھا۔

"میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں نے بہت دفعہ بتانے کی کوشش کی مگر ہمت نہ کر سکی۔" وہ لرز رہی تھی۔

"اگر تم بتا دیتیں تو شاید حالات مختلف ہوتے مگر تم نے مجھ سے اپنا ماضی چھپایا اور اب میں تمہیں اپنے حال اور مستقبل سے الگ کر رہا ہوں۔ سامان سمیٹو اور ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ۔"

اسکے لہجے میں حتمی پن تھا۔

پلیز میری بات سنیے۔" نایاب کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

"جاؤ۔" وہ ایک لخت دھاڑا۔ "اس سے پہلے کہ میرے اندر سویا وحشی انسان ایک مرتبہ پھر جاگ جائے یہاں سے چلی جاؤ۔"

جانے اس کے خوف آشام لہجے میں کیا بات تھی کہ نایاب کو زمان و مکاں بھول گئے وہ الٹے پاؤں باہر نکل گئی۔

مہران نے اپنا سر تھام لیا۔

اس کے کانوں میں ہنٹر کی شوں شوں گونج رہی تھی۔

اسی بات پر اس نے کسی نرم و نازک وجود کو بے رحمی سے کوڑوں سے مارا تھا اور لہولہان حالت میں اجنبی ویران جگہ پر رات کے اندھیروں میں بے ہوش پڑا چھوڑ کر دور چلا گیا تھا۔

اس نے تو کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ سب کچھ اس کے گوش گزار کیا تھا۔

نایاب نے دوستی کے لیے آفاق کا انتخاب اپنی مرضی اور خوشی سے کیا تھا جبکہ پروفیسر دانیال مہدی نے فریب کاری سے جال بچھا کر ارشین پر عرصہ حیات تنگ کیا تھا۔ وہ تو پروفیسر کی زیادتیوں کا شکار تھی بلکہ وہ کیا اس کا پورا خاندان پروفیسر دانیال کے انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وہ اپنی جگہ مظلوم تھی اور ہمدردی کی مستحق تھی۔

مگر دوسروں کے ساتھ ساتھ میں بھی اس کے خلاف تیز تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے بارہا سچائی کا اعتراف کرنے اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اپنے زعم میں توجہ نہ دی۔

میں اس پر ان الزامات کی بوچھاڑ کرتا رہا جن کی وہ سرے سے مستحق نہ تھی اور جو مستحق تھی اسے بیوی بنا کر عزت و آبرو کی چادر ڈال کر فخر سے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

"ہم فرشتے نہیں ہیں' انسان ہیں اور غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں فرشتوں سے نہیں۔" داور نے ایک بار کہا تھا "ایسی عورت تمہیں کہیں بھی نہیں ملے گی جو ہر لحاظ سے کھری ہو۔ بھلے سے ساری زندگی تلاش میں گزار دو۔ کبھی پچھتاؤ گے تم۔" نازش کے الفاظ اسے یاد آئے۔

تو کیا یہ سب یونہی ہوتا ہے۔

یہ اتار چڑھاؤ انسانی فطرت کا حصہ ہیں؟

یہ "روٹین" کی باتیں ہیں؟

بچپن سے لڑکپن اور جوانی سے بڑھاپے تک کے زمانے میں زندگی میں بے شمار لوگ آتے جاتے ہیں۔ کچھ زندگی کی ٹرین پر بس لمحاتی طور پر نظر آتے اور غائب ہو جاتے ہیں' کچھ کے ساتھ تھوڑا سفر کٹ جاتا ہے' کچھ اگلے اسٹیشن پر اتر جاتے ہیں اور کچھ سفر کے زیادہ تر حصے میں ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں سے بھلا کتنے ہوتے ہیں جو آخر منزل تک ساتھ دیتے ہیں؟ بہت ہی کم.....

اور خیال کا کیا ہے آتا ہے اور گزر جاتا ہے اگر اس پر عمل کرنے کے بارے میں سوچا جائے تو.....

ایک اعتراف مجھے بھی تو خود سے کرنا ہے۔

بہت شروع میں جب ارشین ہمارے ہاں سفیان اور نینی سے ملنے آتی تھی تو وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ لطیف احساسات اپنے دل میں محسوس کیے تھے' مگر پھر جب پروفیسر دانیال مہدی کے حوالے سے اس کا تعارف سامنے آیا تو لطیف جذبے خود بخود سرد پڑ گئے اور پھر انتقام اور نفرت کا آتش فشاں پھٹا اور پھیلتا چلا گیا۔

انتقام کے اس چکر نے مجھے کیا ہے کیا بنا دیا۔ کہاں وہ ایس پی مہران آفریدی جو وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار رہتا تھا اور جس کا جینا مرنا اپنا پیشہ تھا۔ اپنے گھر کے افراد اور اپنے پیش ورانہ فرائض کے علاوہ کوئی تیسری سوچ ذہن میں آتی ہی نہ تھی اور کہاں یہ وحشتوں کا مارا انسانیت کے درجے سے گرا ہوا درندہ نما بے حس مہران آفریدی جو بیک وقت دو بیویوں کا شوہر ہے' مگر دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہے۔

یہ میں ہوں۔

اس نے آئینے میں اپنی وحشت زدہ صورت دیکھتے ہوئے جھرجھری سی لی۔

اسے اپنے کریہہ الفاظ یاد آئے جو اس نے ایک دفعہ ارشین سے کہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں تمہیں تباہ و برباد کر دوں۔ تمہارا یہ حال ہو جائے کہ تم دو وقت کی روٹی کو ترسو۔ تم گلیوں میں ماری ماری پھرو اور بچے تمہیں پتھر ماریں۔ میں تمہیں ذلت و رسوائی کی انتہا پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

یا اللہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو مٹھی میں بھینچا۔

میں کس طرح اتنی پستیوں میں اتر گیا تھا۔

"انسان کی شخصیت کی پہچان اس بات سے ہوتی ہے کہ بچے' بوڑھے اور عورت کے ساتھ کس قسم کا رویہ برتتا ہے۔" نینی نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

احساس جرم کی سوئیاں اس کی رگ رگ میں اتر رہی تھیں۔

اب وہ پہلی فرصت میں دین کوٹ جانا چاہتا تھا مگر رکاوٹ یہ تھی کہ تین دن تک اسے ایک

کیس کے سلسلے میں کورٹ میں پیشی کے لیے شہر میں ہی رہتا تھا۔

کم از کم میں یہ تو معلوم کروں اس کے گھر والے کس حال میں ہیں؟

اسے معا ارشین کی نشے کے مرض میں مبتلا بہن امبرین کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں میں اس نے جس بے رحمی ولاتعلقی سے کام لیا تھا اس پر اسے اس سے پہلے بھی بارہا افسوس ہوا تھا۔

وہ بالوں میں برش کر کے گاڑی کی چابی لے کر نیچے آ گیا۔

لاؤنج میں نینی پریشان صورت بیٹھی ہوئی تھیں۔

"مہران! بچے ادھر آؤ۔ یہ بہو روتی ہوئی اپنے میکے کیوں روانہ ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی آپ نے گھر سے نکال دیا ہے۔ یہ کیا ڈرامہ کھیل رہے ہو بچے! کیوں ہمارے اعصاب کا امتحان لینے پر تلے ہوئے ہو۔"

وہ ان کے قریب آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نینی! اب میں سارے ڈراموں کا ڈراپ سین کر رہا ہوں۔ بکھری اور بھولی ہوئی چیزیں اپنی جگہ پر واپس لا رہا ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔

"مگر بہو کو میکے کیوں بھیجا ہے؟"

"کیونکہ اب وہی اس کا مستقل ٹھکانہ ہوگا۔" وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوا۔ نینی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک جا رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"درنایاب کو بھول جائیں آپ۔" وہ لاپروائی سے بولا "میں ارشین کو یہاں لا رہا ہوں۔ اسے وہی نام اور عزت دے رہا ہوں جو آپ چاہتی تھیں۔ اب تو آپ خوش ہیں نا۔"

"مہران!" نینی سر تھام کر صوفے پر گر سی گئیں۔ "میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "اپنا اور ہمارا تماشا بنا رکھا ہے۔ جانے کس کس طرح سے کرچیاں سمیٹ کر عزت کا شیشہ جوڑتے رہے ہیں۔ اب کیا چوک میں بٹھا دو گے۔ میں کہاں چلی جاؤں۔"

"نینی پلیز!" وہ ان کے پاس بیٹھ کر لجاجت سے بولا "آخری بس آخری بار میری خاطر یہ تبدیلی برداشت کر لیں۔ اس کے بعد کبھی نہیں ستاؤں گا جو کہیں گی کروں گا۔ آپ کو اپنا پرانا بیٹا

چاہیے نا وہی مہران جسے آپ نے حب الوطنی، عالمگیری اخوت و محبت اور امن و آشتی کے سبق پڑھائے تھے۔ وہ بیٹا لوٹ آئے گا انشاءاللہ۔ میرے وجود پر لینا وحشی و حیوانی خول چڑھ گیا ہے۔ کچھ عرصے میں اندر سے وہی شفاف و پرجوش مہران نمودار ہو جائے گا۔ بس آخری بار۔"

وہ انہیں حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

"بخاری لاج" پر پڑے تالے نے اسے متعجب کر دیا۔ معلومات کے لیے ساتھ والے گیٹ پر بیل دی تو راشد صاحب نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو محض سوالیہ تاثرات ابھرے یکلخت جیسے کسی آشنائی کے احساس نے انہیں چونکا دیا۔

"جناب! یہ بخاری لاج پر تالا کیوں پڑا ہے؟"

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو میں آپ سے اس سے قبل مل چکا ہوں۔ غالباً بخاری لاج میں ہی۔" وہ لڑکی کی طرف سے گواہوں میں شامل تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے اس کو دیکھا تھا۔ مہران کو بھی یاد آ گیا۔

"جی! میں ارشین کا شوہر ہوں۔" اس کا لہجہ دھیما تھا۔ بالآخر اس نے اس رشتے کا اعتراف کر لیا تھا۔

"وہ! آیئے..... اندر تشریف لایئے۔" وہ اخلاقاً بولے۔

"شکریہ جناب! میرے سوال کا جواب؟"

"آپ سے کیا چھپانا صاحبزادے۔ آپ تو یوں بھی ان کے مسائل و معاملات میں انوالو رہے ہیں۔ اس گھر کو وہی موذی ڈس گیا جس نے ارشین جیسی غیر معمولی لڑکی کا کیریئر تباہ کیا۔ پہلے امبرین اور پھر شاہین۔"

پروفیسر دانیال مہدی اور شاہین والا معاملہ کچھ روز پہلے ہی ان کے علم میں آیا تھا جب بخاری لاج کے گیٹ کے اندر ڈاک سے آیا۔ ایک خط ان کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ رقیہ بیگم کے یاد دلانے پر بخاری لاج کی صفائی کی غرض سے تالا کھول کر اندر گئے تھے۔ اس اثنا میں ڈاکیا خط پھینک گیا تھا۔ انہوں نے کھولا تو پتا چلا پروفیسر دانیال مہدی نے بخاری صاحب کے نام دھمکی لکھی تھی۔

"امبرین کو تباہ کرنے کے بعد خود بخود ارشین کی دوسری بہن شاہین میرے ہاتھ لگ گئی، میں اسے لاہور اڑا لے گیا تھا مگر وہاں سے کسی طرح وہ میرے چنگل سے آزاد ہو گئی۔ بہرحال

دوبارہ جھپٹ لوں گا جلد ہی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے باحفاظت آپ تک پہنچا دوں تو آپ کو ارشین کا پتا بتانا ہوگا۔ مجھے وہ ایڈریس چاہئے جہاں مہران آفریدی نے اسے چھپا رکھا ہے۔"

راشد صاحب مہران کو ڈرائنگ روم میں لے آئے تھے۔

"آپ یہ خط پڑھ لیں بلکہ رکھ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے آپ بھی اس معاملے میں فریق ہیں۔" انہوں نے خط اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے مختصراً بتایا کہ کس طرح بخاری صاحب فیملی سمیت شہر چھوڑ کر گوشہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ امبرین کے بارے میں بھی بتایا۔ بارہ کہو کے ڈرگ کنٹرول سینٹر کا نام سن کر وہ بے چین ہوگیا۔

اس کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر رضا اس سینٹر کے انچارج تھے۔ وہ امبرین کے لئے ان سے بات کر سکتا تھا۔

اس نے خط کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور راشد صاحب سے اجازت لے کر باہر آ گیا۔

اس کا رخ ڈرگ کنٹرول سینٹر کی طرف تھا۔

"ارے ایس پی صاحب! آپ کیا سادہ لباس میں یہاں چھاپہ مارنے آئے ہیں۔" ڈاکٹر رضا چھتیس سینتیس برس کے ہنوز کنوارے اور پختہ مزاج کے نفیس انسان تھے۔ ان سے ملنے والا کبھی مل کر مایوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کا نفسیاتی ٹریٹ منٹ اور گفتگو کی نرمی مخاطب کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔

"تم سے کچھ انفارمیشن چاہئے تھی۔" وہ رسمی آداب بالائے طاق رکھتا ہوا براہ راست کہتے ہوئے ان کے مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ہمیشہ کی طرح اعتراض ہے کہ کم از کم چھ برس بڑے ایک انتہائی معزز ڈاکٹر کو "تم" کس حساب میں کہا جاتا ہے۔" وہ شگفتگی سے گویا ہوئے۔

"یہ تو پرانا جھگڑا ہے؟" وہ بمشکل مسکرا سکا۔

"دوستی میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اب یہ بتاؤ پچھلے ماہ امبرین بخاری نام کی جو مریضہ سینٹر میں ایڈمٹ کرائی گئی تھی اس کی کنڈیشن اب کیسی ہے۔"

"وہ انیس بیس سال کی کم عمری میں وہائٹ کی ایڈکشن کے باعث تقریباً تقریباً ختم ہو چکی تھی۔" ڈاکٹر رضا ایک دم چونک پڑے۔

"تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔"

"تعلق تو بڑا قریبی ہے۔" مہران نے ماتھے کو دائیں ہاتھ سے مسلا۔

"اگر ایسا ہے تو مجھے اس کی پوری ہسٹری بتاؤ۔ مجھے اس کیس میں خاص دلچسپی ہے۔ یوں بھی مشکل اور تقریباً ناممکن کاموں میں ہاتھ ڈال کر انہیں ممکن بنانا میری ہابی ہے۔ تم مجھے الف تا لیے اس کی ہسٹری بتاؤ۔ شاید میں اسے دوبارہ اس کی زندگی کی طرف لوٹا سکوں۔ ویسے کافی سارے کلیو اس کی ٹوٹی بکھری باتوں سے بھی ملے ہیں۔ وہ اچانک بے ربط ہو کر کوئی قصہ چھیڑ بیٹھتی ہے۔ اپنی کیفیت کا خود ہی اظہار کرنے لگتی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے وہ اپنے ماضی کو کھول کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے۔ وہ الجھنوں کی گتھیاں سلجھا کر ذہن کی سلیٹ کو صاف کرنا چاہتی ہے۔ یہ مثبت عمل ہے اور اس عمل کو مہمیز کرنے کے لئے مجھے اس کا تفصیلی فیملی بیک گراؤنڈ درکار ہے۔"

"ٹھیک ہے! میں بتا دیتا ہوں مگر اس سے پہلے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" مہران کو کسی قدر اطمینان محسوس ہوا تھا۔

"اس وقت وہ اینٹی ڈپریسنٹ میڈیسنز کے زیر اثر غنودہ کیفیت میں ہے۔ اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"اوکے!" پھر وہ مختصراً بخاری فیملی کے بارے میں بتانے لگا اس میں وہ تفصیل بھی تھی جو وقتاً فوقتاً اسے بیٹی، سفیان اور نازش وغیرہ سے ارشین کی فیملی کے متعلق ملتی رہتی تھی۔

"ایسے فیملی گراؤنڈ رکھنے والے بچے عموماً اسی طرح ایب نارملیٹی کا شکار ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر رضا نے گہری سانس لیتے ہوئے بائی فوکل گلاسز ٹیبل پر رکھ دیے۔ ان کا اشارہ امبرین کی طرف تھا۔

"ایک قسم ہوتی ہے جسے اضطرابی بچے کہا جاتا ہے۔ ان کی ایب نارملیٹی کی وجہ اس قسم کا بیک گراؤنڈ ہوا کرتا ہے جو امبرین کا ہے۔ گو کہ باقی بہن بھائی بھی والدین کے مابین ناخوشگوار تعلقات، گھریلو پابندی اور والدین کی طرف سے لاتعلق رویوں سے متاثر ہوئے مگر امبرین کے اعصاب اتنے طاقتور نہیں تھے کہ وہ حالات کا بہادری سے مقابلہ کر سکتی۔ نتیجتاً اس نے ردعمل کے

طور پر منفی طرز فکر اپنا لیا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی محرمیوں کا انتقام اپنی ذات سے اور اپنے سے قریب رشتوں سے لینے لگی۔ خود کو تباہ کر لینے کا انتہائی قدم آدمی اس وقت اٹھاتا ہے جب وہ ہر رشتے اور ہر معاملے میں ٹھکرایا گیا ہو مایوس اور ناکام رہ جائے اور کہیں سے جذباتی و ذہنی سہارا نہ ملے۔ یہ اسٹیج بہت نازک ہوتی ہے اور خصوصاً لڑکپن سے جوانی جیسے شوریدہ دور میں داخل ہونے والے نوجوانوں پر تو ایسے حالات کا اثر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ نجانے کیوں زندگی کے ایسے دشوار مرحلے پر والدین بچوں سے لاپروا اور غافل ہو جاتے ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ان کم عمر نوجوانوں کی والدین کی توجہ و تسلی محبت اور شفقت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر والدین بچوں کے سچے ہمدرد دوست اور قابل اعتماد رازدار بن جائیں تو وہ گھروں سے باہر تاریک راستوں میں نہ بھٹکیں۔"

ڈاکٹر رضا خاموش ہو گئے۔

مہران کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"میں چلتا ہوں پھر آؤں گا۔"

"ضرور آنا اور اب مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ اعتماد اور امید کے ساتھ مریضہ کا علاج کر سکوں گا۔"

وہ بہت پر امید اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

"آنٹی! آپ نے بلایا تھا مجھے؟"

سعد شبانہ خاتون کو سلام کرنے کے بعد ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"آؤ بیٹے! تنویر بتا رہا تھا تمہارا پھر تبادلہ ہو گیا ہے کراچی کی یونٹ میں۔"

"جی آنٹی! کل ہی آرڈرز آئے ہیں۔"

"کب جوائن کرنا ہے؟"

"ایک ہفتے بعد جا کر رپورٹ کرنی ہے۔"

"تو گویا تم لاہور چھوڑ کر جا رہے ہو ایک ہفتے بعد۔" انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ جانچا۔

"جی ہاں مجبوری ہے۔" وہ مسکرایا۔ وہ ابھی تک اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

"آنٹی! وہ ابھی کچھ عرصہ تک آپ کے پاس رہے گی پھر میں اسلام آباد کا چکر لگاؤں گا اور پھر اس کے والدین سے بات کر کے ماحول سازگار پاتے ہی اسے اس کے گھر لے جاؤں گا۔"

وہ جتنی دیر تک بولتا رہا شبانہ خاتون چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انداز نشست بدلا تھا۔

"ایک بات کہوں بیٹے اگر برا نہ مانو تو۔"

"آنٹی پلیز! میں بھی تنویر کی طرح ہوں آپ کے سامنے۔ آپ حکم کیجیے۔"

"بیٹے! اپنے تنویر کی طرح سمجھتے ہوئے میں ایک تجویز دے رہی ہوں۔ تم سے توقع کرتی ہوں کہ جذبات کے بجائے عقل سے کام لے کر اس پر عمل کرو گے۔"

"جی! ارشاد۔"

"بیٹیاں بوجھ نہیں ہوا کرتیں۔ میں شاہین کو عمر بھر اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں مگر سوچو تو کس حوالے سے، کس رشتے سے؟ آخر کو اسے ایک مستحکم اور پائیدار مستقبل چاہیے۔ ابھی تو تعلیم مکمل کرنے کی مصروفیت ہے مگر یہ بہلاوا ابھی کب تک.....؟ ظاہر ہے اس کے بعد اسے ایک گھر، زندگی کا باعتماد ساتھی اور معاشرے میں ایک باعزت مقام درکار ہو گا اور اسے یہ نام و مقام کون دے گا.....؟"

"آپ کا مطلب ہے اس کی شادی کر دی جائے؟" سعد چونکا "لیکن ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔ سترہ برس کی ہو گی غالباً یا حد سے حد اٹھارہ۔"

"شادی کے لیے سترہ سال کی عمر ایسی غیر معمولی بھی نہیں ہوتی۔ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے اونچے گھرانوں میں اس عمر کی لڑکیاں بیاہنے کا رواج دیکھا ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر آپ اس کے لئے کوئی مناسب سا رشتہ ڈھونڈ لیں۔" اسے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھی سیدھا سادہ فوجی بندہ تھا۔

"بیٹے! رشتہ لینے والے سارا آگا پیچھا کنگالتے ہیں۔ لڑکی کے خاندان کی ہسٹری معلوم کرتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ اچانک آپ کے جاننے والوں کی بیٹی کہاں سے

اگ آئی.....؟ اس کے ماں باپ کہاں کے رہنے والے ہیں' کدھر ہیں؟ سو طرح کی معلومات فراہم کرنا ہوتی ہیں۔"

سعد الجھن کے عالم میں انہیں دیکھنے لگا۔

"اسی لئے کہہ رہا تھا آنٹی! کچھ عرصہ آپ اسے اپنے پاس رکھیے۔ میں اسلام آباد کا چکر لگا کے....."

"کیا بیوقوفوں والی باتیں کرتے ہو بیٹے۔" شبانہ خاتون نے برہمی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"شریف والدین اتنے دن تک گمشدہ رہنے والی بیٹیوں یک قلم گمشدگی کی اطلاع مشہور کر دیتے ہیں۔ پھر وہ زندہ لاشیں بن کے دوبارہ ان کی دہلیز پر آئیں بھی تو واپس لوٹا دی جاتی ہیں۔ عزتوں کے آگے اولادوں کی زندگیاں قیمت نہیں رکھتی ہیں۔" ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

سعد جیسے کسی خواب سے بیدار ہوا۔

شاہین کو گھر سے نکلے ڈھائی ماہ گزر چکے تھے۔ ظاہر ہے اب اس کی واپسی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی جو بدنامی ہونا تھی سو ہو چکی تھی۔

"کیا اب تم میری بات سمجھ گئے ہو.....؟"

انہوں نے مخاطب کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"کچھ کچھ۔ آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس کے والدین کے پاس بھیجنے کا اب کچھ فائدہ نہیں اور یہاں رہ کر کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی ہونا مشکل ہے۔"

"ہاں! اور اسے ایک ایسا ہمدرد ساتھی چاہئے جو اس کے حال' ماضی سے واقف ہو اور اس کی معصومیت و پاکیزگی کی قسم کھا سکتا ہو۔ جس کا خلوص اتنا کمال درجے کا ہو کہ وہ اسے کبھی ماضی کے حوالوں کا طعنہ نہ دے کر دکھ نہ دے۔" شبانہ خاتون سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

"اور ایسا ہمدرد شخص ایک ہی ہو سکتا ہے' میجر سعد۔"

سعد کے بہت قریب جیسے کوئی بم پھٹا تھا۔

وہ یوں بدکا جیسے اور بلاؤ دیکھ لیا۔

"خدا کے واسطے آنٹی! خدانخواستہ کیا آپ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی ہیں؟" وہ

نشست سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"ہوش کی دوا تمہیں کرنی چاہئے میاں! تمہاری عزیزہ ہے' برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ اس کے خاندان کی ایک ایک بات تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ بچی کی میٹھی اور نرم طبیعت سے بھی واقف ہو' پھر کاہے کو اعتراض ہے۔ دیکھنے میں بھی ماشاءاللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔"

"آپ کو کن لفظوں میں سمجھاؤں آنٹی! آپ نہیں سمجھیں گی۔" وہ اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔

"آنٹی! وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ غالباً دس برس یا اس سے بھی کچھ زیادہ کا فرق ہوگا۔"

"اے لو۔ دس گیارہ سال کا بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ بالکل بے کار اعتراض ہے۔" انہوں نے صاف رد کر دیا۔

"میں نے اس کے بارے میں کبھی بھی ایسا نہیں سوچا۔ وہ چھوٹی سی بچی جسے میں زیادہ سے زیادہ چھوٹی بہن کی طرح ٹریٹ کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"شادی سے پہلے شریف والدین کے بچوں کے لئے سب بہن بھائی ہی ہوتے ہیں۔ رشتہ تو شادی کے بعد بدلتا ہے۔" انہوں نے یہ دلیل بھی ٹھکرا دی۔

وہ کیسے بتاتا کہ وہ کس ان دیکھی زنجیر سے بندھا ہوا ہے؟

"اسی بہانے تم بھی کسی کھونٹے سے بندھ جاؤ' تم جیسی اولادوں کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔ زبردستی پکڑ کے شادی کر دینی چاہیے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی مجھے شادی نہیں کرنی۔ یہ نیا فیشن چل نکلا ہے آج کل کے لڑکے لڑکیوں میں۔" وہ ٹھیک ٹھاک خبر لے رہی تھیں۔

سعد سر پیٹ کر رہ گیا۔

"ہاں! ایک واحد معقول اعتراض ہے' جسے زیر غور لایا جا سکتا ہے تمہارے والدین کی رضامندی۔ انہیں اس سلسلے میں اعتماد میں لینا ہوگا۔ یہ بتاؤ تم اسلام آباد جا کر انہیں اس بات کے لیے قائل کر لو گے یا میں خود بات کر لوں۔ بہتر ہوگا انہیں بہانے سے لاہور بلوا لو اور میرے گھر پہ لے آؤ۔ میں خود ہی ساری بات بتا کر انہیں قائل کر لوں گی اور اگر وہ رضامند ہو گئے تو انشاءاللہ شاہین کی ڈولی یہیں سے اٹھے گی۔"

وہ اپنے ارمان سجانے لگیں۔

"اُفوہ....." سعد نے زور سے پاؤں پٹخا۔ معزز خاتون پاگل ہوگئی ہیں شاید۔ خود ہی سے ساری اسٹوری بناتی چلی جارہی ہیں۔

"آنٹی پلیز!" اس نے سختی سے انہیں ٹوک دیا۔ "میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس چیپٹر کو ہمیشہ کے لئے کلوز کردیں اور پلیز اس طرح کی کوئی بات شاہین کے کانوں تک نہ پہنچے خدارا مجھ پر رحم کیجئے۔"

وہ آندھی طوفان کی طرح تیزی سے سر جھٹکتا باہر نکل گیا تھا۔

کمال بات کرتی ہیں یہ معزز خاتون۔ سارے راستے وہ بڑبڑاتا رہا۔ میں اور شاہین۔

اُفوہ قطعی ناممکن۔

اور شادی۔

شادی کی گاڑی تو کچھ لو اور دو کے اصول پر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ میرے پاس کسی کو دینے کے لئے کیا بچا ہے؟

دل و روح، قلب و جاں، خیالات و احساسات، حتیٰ کہ میری آتی جاتی سانسیں سب اس کے نام ہیں۔ وہی دھڑکتی ہے سینے میں دل بن کر۔ وہ بستی ہے سوچوں کی نگری میں، جس کو یاد کئے بنا میں سانس نہیں لیتا، جس کو آنکھوں میں سموئے بنا میں پلکیں نہیں جھپکتا جس کو سوچے بنا میں کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کی جگہ میں کسی اور کیسے دے سکتا ہوں.....!؟

مجھے محسوس ہوتا ہے۔

محبت کم نہیں ہوگی۔

محبت ایک موسم ہے۔

کہ جس میں خواب اگتے ہیں۔

تو خوابوں کی ہری شاخیں۔

گلابوں کو بلاتی ہیں۔

انہیں خوشبو بناتی ہیں۔

یہ خوشبو جب ہماری کھڑکیوں پر دستکیں دے کر گزرتی ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے۔

محبت کم نہیں ہوگی۔

میں اس کے لئے ساری زندگی انتظار کرسکتا ہوں۔ اس نے عزم سے سوچا تھا۔

☆☆☆☆☆

"مہران! ذرا ادھر آؤ۔ تمہاری خبر لوں۔ کیوں پریشان کر رکھا ہے تم نے نینی کو۔" نازش نے بے تکلفی سے اس کے کمرے میں داخل ہوکر لائٹ جلائی تھی۔

"وہ! آپ۔ آیئے" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیڈ کے سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں آپ کی طرف آنے کا سوچ رہا تھا۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔"

"پہلے میری بات کا جواب دو۔ پھر اپنے حساب کتاب کے کھاتے کھولنا۔ تم نے نایاب کو گھر سے کیوں نکالا۔ کیا تم مردوں کے پاس یہی ایک ہتھیار ہوتا ہے عورت کو دبانے کا۔ کبھی لاتعلقی دکھا کے دل سے نکال دیتے ہیں تو کبھی الزام لگا کر گھر سے بے دخل کردیتے ہیں۔ کیا قصور تھا اس سیدھی سادی، دبوسی فطرت رکھنے والی لڑکی کا۔"

وہ اچھی طرح اس کی خبر لے رہی تھی۔

"اس کا "کارنامہ" بھی بتا دیتا ہوں پہلے یہ پڑھ لیں۔" اس کا لہجہ کٹیلا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" نازش نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔

"پڑھیں اسے جب تک میں واش روم سے ہو آؤں۔ آکر ان سرخیوں کا اصل "متن" سناتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر چپل پہننے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو نازش کو سفید چہرہ لیئے بت کی مانند ساکت بیٹھے پایا۔ کاغذ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے.....؟" بہت دیر بعد وہ بیٹھی بیٹھی لرزیدہ آواز میں گویا ہوئی تھی۔

"اپنے سرتاج کی ہینڈ رائٹنگ پڑھ اور پہچان سکتی ہیں نا۔" وہ طنزیہ بولا۔

"اب میں آپکو تفصیلی شناخت کراتا ہوں۔" پھر اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ لیلیٰ شاہ اور اس کے گروہ کے بارے میں پولیس کو جو خفیہ معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق پروفیسر

دانیال اور لیلیٰ شاہ کے درمیان امبرین کے حوالے سے "ڈیل" بھی طے ہو چکی تھی۔

نازش سکتے کے عالم میں بیٹھی انتقام میں پاگل ہو جانے والے اپنے شوہر نامدار کی دیوانگی اور کمینگی کی داستانیں سن رہی تھی۔

جو لوگ محبت جنون اور دیوانگی کو ایک ہی معنوں میں لیتے ہیں وہ غلط کرتے ہیں۔

دیوانگی ہوش سے عاری ہوتی ہے۔

جنون اندھا ہوتا ہے۔

محبت تند و تیز ریلا نہیں ایک پرسکون اور بہتا ہوا دریا ہے۔ آندھی طوفان کی طرح سر پر چڑھ کر جانے والی پسندیدگی جو دیوانگی میں ڈھل کر تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ محبت ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی۔ محبت تو نرمی ہے' مٹھاس ہے' لطافت ہے' پیار ہے۔

ضد و زبردستی اور انا و انتقام محبت کی نہیں' وحشت کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ ہم نے نجانے کیوں اسے محبت جیسے لطیف جذبے کی علامت سمجھ لیا ہے۔

کوئی اگر محبت کی انتہا پر پہنچ کر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ملک و قوم اور اخلاقیات کے نافذ کردہ قوانین و احکامات توڑتا ہے تو وہ قابل تحسین نہیں قابل سزا ٹھہرایا جانا چاہئے۔

محبت غلط اور ناجائز راستوں پر بھٹکنا تو نہیں سکھاتی۔

محبت رشتوں کو توڑنا نہیں جوڑنا سکھاتی ہے۔

محبت توازن کا نام ہے۔

رشتوں کا توازن' احساسات و جذبات کا توازن' معمولات زندگی کا توازن۔

یہ توڑ پھوڑ' انتشار' بربادی' ویرانی یہ تو محبت کی روایت نہیں ہوتی۔

انتہا پرستوں نے اس معاشرے کو کتنا بدصورت اور بے رونق کر رکھا ہے۔

انتہا پرستی کا یہ زہر جانے کب تک ہماری نسلوں کی رگوں میں دوڑتا رہے گا۔؟

نازش نے گہری سانس لی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندر سے ختم ہو گئی ہو۔

اس میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔

وہ آئی تو نجی کی کال پر اس کو سمجھانے تھی' مگر اب یہ حالت تھی کہ خود اس کو سنبھلنے اور سمجھنے کے

لئے حوصلہ چاہئے تھا۔

"میں چلتی ہوں۔ پھر بات ہو گی۔"

وہ بمشکل اپنا وجود گھسیٹتی وہاں سے نکل آئی۔

"اوہ ابی بی جی شکر ہے آپ آ گئیں۔ بے بی مہوش کے آج پھر سینے میں درد اٹھا ہے۔ وہ جی پچھلے دو تین ہفتوں سے ہر دوسرے تیسرے دن بچی تڑپنے لگتی ہے۔"

مہوش کی آیا نے اسے دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ پروفیسر دانیال مہدی امریکہ میں تھے۔ وہ ان دنوں گھر میں اکیلی رہ رہی تھی۔ پہلے تو گھریلو ٹوٹکے کرتی رہی پھر قریبی کلینک میں جنرل چیک اپ کرایا۔ انہوں نے میڈیسن کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیسٹ لکھے تھے جو ابھی کرانے تھے کہ اس دوران دوبارہ تکلیف شروع ہو گئی۔

وہ پریشانی کے عالم میں اسے نزدیکی کلینک لائی تھی۔ انہوں نے عارضی طور پر درد کم کرنے کی دوا دے دی اور ٹیسٹ کے لئے زور دیا۔

نازش کو عجب طرح کی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔

اس نے فون کر کے سفیان کو بلوا لیا۔

"میرے ساتھ شفا انٹرنیشنل چلو۔ میں مہوش کے ٹیسٹ کروانا چاہتی ہوں۔ نجانے کیوں مجھے اس کی یہ بیماری بری طرح بدحواس کئے دے رہی ہے۔ میں اپنی تسلی کرانا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

چیک اپ' ٹیسٹ' ایکس رے اور اسکیننگ وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد اس کی رپورٹس مل گئیں۔

"نہیں نہیں! یہ میری بچی کی رپورٹ نہیں ہو سکتی۔"

رپورٹس پڑھتے ہی اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ اس نے ہذیانی انداز میں انہیں اسپیشلسٹ کی ٹیبل پر پھینک دیا اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ "میری بیٹی کو لنگ کینسر ہے قطعی ناممکن۔ کینسر تو بڑی عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے۔ یہ معصوم سی پھول سی بچی۔ نہیں ہرگز نہیں۔"

"حوصلہ کریں مسز دانیال" ڈاکٹر اس کے شدید ردعمل کو سمجھ رہا تھا۔

"میڈیکل سائنس کینسر کا علاج دریافت کر چکی ہے انشاء اللہ آپ کی بیٹی ایک دن اس

موذی مرض سے نجات پالے گی۔ آپ ہمت پکڑیں' بہادر بنیں۔ آپ کے شوہر کہاں ہیں؟"

"ان ہی کے اعمال کا لگایا ہوا پودا ہے یہ مرض' ان کے کرتوتوں کا پھل۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

ڈاکٹر سمجھ نہیں سکا اور نازش اسے سمجھانے کے لئے رکی بھی نہیں تھی۔

گھر آئی تو غیر متوقع طور پر پروفیسر دانیال مہدی کو موجود پایا۔

پچھلے دنوں ان کا فون آیا تھا تو نازش نے مہوش کی بیماری کے متعلق بتایا تھا۔ یہی اطلاع پاکر وہ باقی کام ملتوی کر کے پاکستان واپس آئے۔ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ اپنی بیٹی عزیز تھی۔ مہوش میں تو ان کی جان تھی۔

"آیا بتا رہی تھی تم رپورٹس لینے ہاسپٹل گئی ہو۔ کہاں ہیں رپورٹس؟" انہوں نے اس کے سوالوں کا جواب دے کر بے چینی سے سوال کیا تھا۔ جواب میں نازش کی آنسوؤں سے بھری سرخ آنکھیں ان کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"کیا کیا تھا آپ نے ارشین اور اس کی فیملی کے ساتھ' اس کی بہنوں کے ذریعے کس قسم کا انتقام لے رہے تھے آپ۔" اس کا لہجہ بہت آہستہ تھا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں تم سے۔"

وہ کچھ ٹھٹھک سے گئے تھے۔

"وہی بتا رہی ہوں میں بھی۔" معاً وہ پلٹی اور دراز میں سنبھال کر رکھا ہوا خط ان کا ہاتھ جھپٹ کر سیدھا کرتے ہوئے ہتھیلی پر پٹخ دیا۔

"اسے پڑھیں غالباً یہ اعتراف نامہ' دھمکی نامہ آپ نے ہی لکھا تھا ارشین' امبرین اور شاہین کے والد صاحب کو۔"

اتنی معلومات اور ایسی گہری رسائی کہ بھیجا ہوا خط تک ہاتھ لگ گیا۔ پروفیسر دانیال مہدی اندر سے کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ "اور اس کے ساتھ ہی یہ رپورٹس ملاحظہ کریں۔" اس نے ان کے دوسرے ہاتھ میں رپورٹس تھما دیں۔

"یہ..... یہ..... کیا ہے.....؟" رپورٹس پڑھتے ہی وہ سرتاپا کانپ گئے۔

"یہ مکافات عمل ہے پروفیسر صاحب۔" نازش کی آواز بھر گئی۔ وہ آنسو پینے کے لئے مسلسل ہونٹ کاٹ رہی تھی' پھر ضبط جواب دے گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور

پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"جب ہم دوسروں کی بیٹیوں کے سر سے چادریں چھین کر انہیں بے سائبان کر اپنے آنگن میں کھیلنے والی بیٹیوں کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ آپ کو بیٹی دنیا میں سب عزیز ہے نا۔ بقول آپ کے مہوش آپ کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کے آنے جانے ہے۔ اسی کی خاطر آپ مجبوراً مجھے برداشت کر رہے ہیں نا۔ قدرت نے آپ کے کئے کی ہی کے سکون میں واپس لوٹائی ہے۔ دوسروں کی زندگیوں کے درپے تھے ناں سو آج اپنی امان خطرے میں ہے۔ بھلا اس عمر میں کینسر ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایسی پھول سی بچی کو۔"

پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

پروفیسر دانیال گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئے تھے۔

انداز شکست خوردہ اور ہارا ہوا تھا۔

ان کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

ارشین اور اس کی ذات سے منسلک شدید جنونی و منتقمانہ جذبات ہر چیز یک لخت سکرین سے واش آؤٹ ہو گئی تھی۔ یوں جیسے دوسرے سے اس معاملے سے نا آشنا۔ یاد رہا تھا تو فقط اتنا کہ ان کے اندر کے برے انسان نے اپنی ہی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔

ان جیسا جزا و سزا کے عمل سے انکاری رہنے والا شخص خود ہی اپنی بچھائی ہوئی بساط کھا گیا تھا۔ ویسے تو شاید وہ عمر کی آخری سانس تک ارشین کا پیچھا نہ چھوڑتے لیکن قدرت کی ہوش مندی اور ضمیر کی بیداری کے لئے جزوی انتظام کر دیا تھا۔

ایسی ٹھوکر لگی تھی کہ اگلے پچھلے سارے نشے ہرن ہو گئے تھے۔

وہ بے تاب لہرین کر مہوش کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ پروفیسر دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔

"میری بیٹی' میری چندا' میری جان' میری زندگی۔" وہ اسے چومے جا رہے تھے آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک کر مہوش کے چہرے اور بازوؤں پر بکھرے جا رہے۔

☆☆☆☆☆

"مجھ پر سارے دروازے بند ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ آپ کیوں ہر روز امید

سورج اٹھا کے مرے سامنے لے آتے ہیں۔ تنگ آ گئی ہوں میں اس بے کار کی مشقت سے۔

امبرین روز کی طرح اس وقت بھی انجکشن لیتے ہوئے ڈاکٹر رضا سے جھگڑ رہی تھی۔

"آں ہاں! ہلنا نہیں۔ یہ بندروں کا ناچ نہیں چلے گا۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"آرام سے ٹک کر انجکشن لگواؤ پھر باہر ہائیکنگ کے لئے بھی جانا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ ضدی پن سے بولی۔ "مجھ سے اونچائی پہ نہیں چڑھا جاتا۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔"

"کچھ دن اور گزر جانے دو۔ طاقت پکڑ لی تو نہیں پھولے گی سانس۔ پھر صرف تم پھولو پھولو گی۔ ایک صحت مند پُر جوش اور بھرپور لڑکی کے روپ میں انشاء اللہ۔"

"آپ اتنے پرامید کیوں ہیں.....؟" امبرین ان کے لہجے کے یقین سے ٹھٹھک کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔

"کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ زندگی کے بے شمار دروازے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ بند بھی ملیں تو بھی اپنا عزم بلند رکھتے ہوئے دوسرے دروازوں پر دستک دینی چاہئے اور یہ کہنا تو سرے سے غلط ہے کہ مجھ پر زندگی کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں' کیونکہ ان دروازوں کی تعداد تو بے شمار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس وقت وہی گنے چنے راستے نظر آتے ہیں اور جب ان میں ناکامی ہوتی ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں اب امکان کا ہر دروازہ بند ہو گیا ہے' حالانکہ ابھی اور بھی بہت سے دروازے ہماری دستکوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ ہم ان کو کھوجتے ہی نہیں خود ہی سے فرض کر کے بیٹھ جاتے ہیں کہ سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ پھر قصور تو ہماری سمجھ کا ہوا نا۔ زندگی کا کیا قصور۔"

وہ اسے ہمراہ لے کر سنٹر کے سامنے بنے خوبصورت سے سرسبز احاطے میں آ گئے۔ اکثر مریض یہاں کی سرسبز پگڈنڈی پر ٹہلتے ہوئے گھنے درختوں کی جھاڑی اور جنگلی جڑی بوٹیوں کی مسحور کن خوشبو سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ علاج کے سلسلے میں یہ سیر و تفریح بھی ایک مثبت سرگرمی تھی۔ جو مریضوں کی صحت پر خوشگوار اثر ڈالتی تھی۔

"میں نے بہت سارے غلط کام کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔" وہ ایک سرسبز پگڈنڈی پر چلتے

چلتے خود ہی اپنی رو میں شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر رضا دھیان سے سن رہے تھے۔

"میں نے اپنی بڑی بہن کے ساتھ بہت دفعہ زیادتی کی۔ وجہ یہ تھی کہ جسے میں پسند کرتی تھی اسے میری بہن پسند تھی۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص میری زندگی میں آیا مگر وہ رشتہ بھی میری بہن کے حوالے کی وجہ سے نہ طے پا سکا مجھے اس چیز نے بہن سے اور متنفر کر دیا۔"

"ایسے کیسز میں اکثر اسی طرح کا ردعمل سامنے آتا ہے۔" ڈاکٹر رضا کا لہجہ نارمل تھا۔

"اچھی بات یہ ہے کہ تمہیں خود ہی اس خامی کا احساس ہو گیا ہے۔"

"مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے" وہ دھیرے سے بولی۔

"انگریز کہتے ہیں "اٹس نیور ٹو لیٹ۔" ان کا انداز حوصلہ افزا تھا۔ "دیر سویر بھی تو انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ بس ایک بات کو کبھی ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہئے کہ میں اس دنیا میں ایک فالتو اور بے کار انسان ہوں' لہٰذا اگر میں نے خود کو کوئی نقصان پہنچا بھی دیا تو کیا فرق پڑتا ہے یہ بات غلط ہے۔ اس اعتماد کے ساتھ جینا چاہئے کہ زندگی ہماری طلبگار رہے۔ اس کو ہماری ضرورت ہے۔"

"میری اب کس کو ضرورت ہے؟" وہ اداس ہو گئی۔ "اب تو ماں باپ بھی اپنی دانست میں مجھ پر فاتحہ پڑھ کے شہر میں اکیلا چھوڑ کے گوٹھ چلے گئے ہیں۔"

"بہت سے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ تمہیں صحت یاب اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر پرجوش انداز میں یقین دلایا۔

"مگر میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ یہاں کا ماحول بہت پرسکون اور خوشگوار ہے۔"

"خبردار! ہم آپ کو مریض بنا کر ہرگز لمبے عرصے کیلئے نہیں رکھنا چاہتے۔ مریض کی صورت میں بالکل قبول نہیں؟"

"چلیں! یہاں کے مریضوں کی تیمارداری کے طور پر تو رہ سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے اگر میں ٹھیک ہو کر نرسنگ کا کورس کر لوں؟"

"زبردست! یہ کی ہے ناں میرے دل کی بات۔ یہی ری ایکشن میں چاہ رہا تھا۔" انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر مسرت کا اظہار کیا۔

"زندگی کا چیلنج قبول کرنا چاہئے اس سے دور بھاگنے اور مقابلہ نہ کرنے والے بزدل کہلاتے ہیں۔ کچھ بھی کرلو مگر جامد و ساکت ہو کر نہ بیٹھو۔ یہی زندگی کا درس عمل ہے۔"

بڑے عرصے بعد امبرین کو اپنا آپ ہلکا پھلکا لگا تھا۔

☆☆☆☆☆

ارشین ابھی ابھی سوشل ڈائجسٹ کے دفتر سے واپس آئی تھی۔ جمیل صاحب نے اسے ایک آفر دی تھی۔

"مس بخاری! آپ کا کام اعلیٰ سطح پر بہت سراہا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کچھ دنوں میں آپ کے مرکزی آفس میں ٹرانسفر ہونے کے آرڈر آ جائیں۔ آپ کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافے کے ساتھ۔"

سوشل ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ اس کا پینٹنگ اور پورٹریٹ بنانے کا کام بھی کافی چل نکلا تھا۔ اب تقریباً ہر ہفتے اسے یاسمین سنٹر کے مالک کی طرف سے نیا آرڈر مل جاتا تھا۔

وہ جلدی اس لئے آئی تھی کہ ان دنوں گوگی بوا کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی بلکہ کبھی کبھی تو ایسے لگتا جیسے اس بے چاری کا آخری وقت بالکل قریب آ گیا ہے۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو مہران کا کمرہ کھلا ملا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی بوجھتی یا کوئی خیال قائم کر سکتی۔ سفید شلوار قمیص میں سر جھکائے شرمندہ نظریں اور شکست کا تھکا ہوا گہرا تاثر ہمراہ لئے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیسی ہو تم؟" اس نے دوستانہ انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" کچھ دیر تک اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے کے بعد اس نے آہستگی سے جیسے انگلیاں مس کر کے ہاتھ ملانے کی رسم پوری کرنے کے بعد ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"ارشین! تم پیکنگ کر لو ہم گھر چل رہے ہیں۔" مہران کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ "گوگی بوا کو بھی تیار کر دو اس کی حالت خاصی خراب ہے۔ انہیں تو ہاسپٹلائز کرنا پڑے گا۔"

"کس کے گھر؟"

"اپنے گھر۔" مہران کی نظر جھک گئی۔ "وہ گھر جو صرف تمہارا ہوگا۔" وہ اس سے نظر نہیں ملا رہا تھا تاہم اس کی گہری سوال کرتی نظریں بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

"ورنا یاب اپنے والد صاحب کے گھر واپس بھیج دی گئی ہے۔ آفریدی ہاؤس تمہیں عزت و احترام سے اپنے گھر کی بہو تسلیم کرنے اور تمہارا استقبال کرنے کو تمہارا منتظر ہے۔ معافی تلافی کے لئے تو مجھے ساری عمر درکار ہے ارشین! لیکن فی الوقت پرانی چیزوں اور باتوں کو ذہن سے فراموش کر دو۔ میرے ساتھ چلو۔ پلیز! اسے درخواست سمجھ لو یا خواہش۔" ارشین بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی۔

"مجھے آپ کی آمد اور آپ کے الفاظ پر قطعی حیرت نہیں ہوئی۔" اس نے گہری سانس لی۔

"میں جانتی تھی ایک دن ایسا ہوگا۔ آپ آئیں گے اور یہی الفاظ کہیں گے۔"

"خبر نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرا دماغ جانے کس رو میں بہہ نکلا تھا کہ میں وحشت..... اور بے حسی کی انتہاؤں کو چھوتا چلا گیا۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ دھیرے دھیرے جیسے خود سے اعتراف کر رہا تھا۔

"انتہا پسندی کا عمل نیکی کے لئے ہو یا بدی کے لئے ہر دو لحاظ سے غلط ہے کہ خود ہمارا مذہب ہمیں اعتدال توازن اور بیچ کی راہ منتخب کرنے کا درس دیتا ہے۔ تمہاری جو غلطیاں ہوں گی وہ اس طویل سزا یا مشقت کے نتیجے میں مٹ کے صاف ہو چکی ہوں گی۔ مگر مجھے اپنی کوتاہیوں کی خدا سے معافی مانگنے کے لئے طویل ریاضت درکار ہوگی۔"

وہ ہاتھ مل رہا تھا۔

"ایک بات جس کا شاید تم بھی یقین نہ کرو۔" وہ آہستگی سے بول رہا تھا۔ "کیونکہ خود میں بھی اس کا اعتراف نہیں کرتا تھا وہ بات یہ ہے کہ میرے دل میں شروع سے تمہارے لئے ایک سوفٹ کارنر تھا۔ وہ لطیف جذبات جو شاید بہت طریقے سے محبت میں تبدیل ہو جاتے۔ ان کا اظہار بھی ان ہی وحشتوں کی نذر ہوتا گیا۔ میں جب پہلے پہل تم سے ملا تھا تو تم مجھے اچھی لگی تھی۔ تمہاری جگہ آج بھی کوئی نہیں لے سکا۔"

"آؤ گھر چلیں۔ ایک نئی اور محبت و عزت کے جذبوں سے بھرپور زندگی شروع کریں۔"

مہران نے قریب آ کر سے بازو سے تھام لیا۔ اس کی سبز روشن آنکھوں میں ارشین کے لئے نرم گرم جذبوں کے ہزاروں چراغ جل رہے تھے۔

"آپ نے شاید کبھی کسی بزرگ دانشور کا یہ قول سنا ہو "انسان معاف تو کر سکتا ہے بھلا نہیں

سکتا۔" جہاں تک معافی تلافی کی بات ہے میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا مگر میں بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ماضی کے تمام واقعات میرے ذہن کی سلیٹ پر نقش ہیں۔ نہ مٹ سکتے ہیں نہ دھل سکتے ہیں۔ میں بھلے سے لاکھ کوششیں کرتی رہوں۔"

وہ بہت ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں سر جھکائے بول رہی تھی۔

"اگر تم کسی طرح کا حساب کتاب کرنا چاہتی ہو یا میری کوتاہیوں کی لسٹ بنا کر مجھے سزاوار ٹھہرانا چاہتی ہو تو تمہیں اس کا پورا حق ہے۔ میں تمہارے لگائے ہوئے تمام تر الزامات سننے اور ماننے کو تیار ہوں۔ آج میں ہر بات ہر شکایت اور اپنا جرم سنوں گا۔ تم باری باری میرا ایک ایک ظلم ایک ایک زیادتی بتاؤ' مجھ سے اس کا حساب مانگو۔ میرے دیئے ہوئے زخم دکھاؤ اور پھر اس کے مطابق سزا تجویز کرو۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"نہیں۔ اس طرح کی عدالت لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب نہ اس کی کوئی اہمیت ہے اور نہ فائدہ۔ میں آپ سے صرف ایک چیز طلب کروں گی۔"

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"مانگو۔ تم جو کہو میں دینے کو تیار ہوں۔" وہ فوراً بولا۔

"مجھے اس نام نہاد بندھن سے چھٹکارا چاہئے۔" وہ قدرے رخ موڑ کر آہستگی سے بولی۔

"کیا؟" مہران کو جیسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ جھٹکا اتنے زور کا تھا کہ وہ سرتاپا ہل کر رہ گیا تھا۔

"ہاں....." ارشین کا لہجہ دھیما مگر فیصلہ کن تھا۔

"ان حالات میں اس سے بہتر حکمت عملی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ کے ہمراہ گزرے لمحوں کی اذیت ناک یادیں ہمیشہ میرے اعصاب پر سوار رہیں گی۔ اس دوران جس طرح میری عزت نفس مجروح ہوتی رہی' جتنا ذہنی و جسمانی عذاب مجھ پر نازل ہوا' اور جس طرح آپ کے جملوں اور ہاتھوں کے حملے مجھے اندر باہر سے ریزہ ریزہ کرتے رہے' اس کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ برابری کی سطح پر نگاہ اور قدم ملانا قطعی ناممکن امر ہے۔ آپ خود سوچئے جس عورت کی گناہ گار اور سرتاپا آلودہ ہستی پر آپ ایک نظر ڈالنا گناہ سمجھتے تھے اسے پاکیزہ و مصفا قرار دے کر کس منہ سے پہلو میں بٹھا کر اپنی توجہ اور پیار سے نوازیں گے اور کیا ایسا کرتے

ہوئے ماضی کے نوکیلے پتھر آپ کو خود پر برستے محسوس نہیں ہوں گے؟"

"شروع میں اسی طرح لگتا ہے ارشین! مگر بعد میں خود بخود تعلق میں روانی آ جاتی ہے۔" اس نے سنبھل کر جواز پیش کیا۔

"یہ کوئی جادوئی عمل نہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی سمٹ آئی۔ "اور اگر بالفرض محال ایسا ہوتا بھی ہے تو صرف ان کیسز میں جہاں تعلق کے آغاز میں کوئی لطافت اور اپنائیت رہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو گاڑی نہیں چل پاتی' محض آگے پیچھے بھاگتے رہنے سے کیا حاصل۔ سفر تو وہ ہے جو قدم سے قدم ملا کر طے کیا جائے۔ میرے دل میں آپ کیلئے کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میں خود کو اس معاملے میں اپاہج پاتی ہوں۔ آئی ایم سوری....."

"ساتھ رہنے سے محبتیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں۔ مجھے یقین ہے' ہم بہت اچھی اور خوشگوار زندگی گزاریں گے۔"

ارشین کا ضبط ختم ہو گیا۔ اس کی رگ رگ میں رچا ہوا زہر اس کے جسم و جان میں تناؤ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

"سنئے ایس ایس پی صاحب! آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔" اس کی سانس پھولنے لگی۔ "میں چاہ رہی تھی یہ زہر میں اپنے اندر ہی سموئے رکھتی کہ جس سے وسطہ نہ رکھنا ہو' ان سے دل کی بات کہنے کی کیا ضرورت ہے مگر اب آپ نے مجبور کر ہی دیا ہے تو سنئے۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ آج سے نہیں اس دن سے جب اس رشتے کے حوالے سے میں آپ کی زندگی میں زبردستی شامل ہوئی۔ میرا بس چلتا تو میں لمحے کے ہزارویں حصے میں اس حصار سے نکل چکی ہوتی۔ میں نے آپ کے ہر ہر عمل سے ردعمل کے طور پر نفرت محسوس کی ہے۔ جوں جوں آپ کی شخصیت کی پرتیں کھلتی گئیں اس سے نفرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ آپ کی سوچ' آپ کے جذبات' آپ کا رویہ' غرضیکہ آپ کی شخصیت کا ہر پہلو ایسا ہے کہ اس سے متنفر ہوا جائے۔ آپ سمجھتے تھے میں آپ کے خوف و دہشت سے یا احساس جرم کے باعث آپ کے سامنے سر نہیں اٹھاتی تھی؟" غلط..... میں محض مصلحت نباہ رہی تھی۔ میں کبھی بھی آپ سے خوفزدہ نہیں ہوئی۔ ہاں بدلتے ہوئے وقت کی نئی کروٹوں سے ڈرتی تھی۔ میں نے آپ کے ڈر سے نہیں حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے آپ کو اس گمنام و پسماندہ جگہ پر رولا' وہ کام کئے جو خیال و خواب میں بھی نہ سوچے تھے۔ میرا رواں رواں

آپ سے نفرت کرتا تھا اور میں فقط حالات کے ہاتھوں زنجیریں پہن کے منہ پر قفل ڈال کے خاموش ہو جاتی تھی۔ میں اپنے آپ کو اپنی خفیہ صلاحیتوں کو آزما رہی تھی۔ اپنی برداشت کا امتحان لے رہی تھی۔" وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی۔

مہران بہت خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ اس کے اعصاب سن ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی ذات ہمیشہ دوسروں کے لئے آئیڈیل رہی تھی۔

مثالی۔ قابل تقلید فخر قابل احترام.....

یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ایک دن اس طرح اس کی شخصیت کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔

"یہ نفرت عداوت کی بناء پر بیدار نہیں ہوئی تھی مہران صاحب! یہ بے اختیاری جذبہ تھا جو خود بخود ردعمل کے طور پر ابھرتا اور پھلتا پھولتا گیا۔" وہ تھک کر بولی۔

"اور اب نفرت کا یہ پودا ایک تناور درخت بن گیا ہے۔ اس کی جڑیں کاٹنا اب ممکن نہیں رہا۔ میں کس دل سے آپ کا ساتھ دوں۔ وہ امنگ، وہ جوش، وہ عزم کہاں سے لاؤں جو نئے اور خوش آئند سفر کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تسلیم کر لیں ہم ایک دوسرے کیلئے غیر موزوں ہیں۔ ہمارے ستارے آپس میں نہیں ملتے۔"

"اگر میں تمہیں طلاق نہ دوں:.....؟" وہ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔

ارشین کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ در آئی۔

"اگر آپ ساتھ چلنے اور گھر بسانے کی بات نہ کرتے تو میں یہ مطالبہ یا اپنے دلی جذبات آج بھی آپ کے سامنے نہ رکھتی۔ اسی طرح زندگی کا سفر جاری رہتا۔ اپنے اپنے حصار اور معمولات کے ساتھ۔ ہاں میں آپ کو شوہر ہونے کے ناطے آپ کا حق کبھی نہ دیتی۔ اس بات کا عہد میں نے اس دن خود سے باندھا تھا جب آپ کی درنایاب کے ساتھ شادی کا دعوتی کارڈ موصول ہوا تھا۔ طلاق نہیں دینا چاہتے نہ دیں۔ اسی طرح چلنے دیں۔ ہاں اپنے ساتھ بسانے کی بات نہ کریں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں یہیں خوش ہوں۔"

"ارشین! ایک مرتبہ ٹھنڈے دل سے صورتحال پر غور کرو۔ میں درخواست کرتا ہوں۔"

مہران پریشان ہو گیا۔

"ہزار مرتبہ غور کر لوں تو بھی یہ بات طے ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ آپ

بھلے سے ساری عمر اپنے نام کے ساتھ باندھے رکھیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس مجھ سے میرا اپنا آپ نہ مانگیں۔ وہ میں آپ کو نہیں دے سکتی۔ میں اس سلسلے میں خود سے مجبور ہوں....."

ارشین نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو تم میرے ساتھ آفریدی ہاؤس نہیں چلو گی.....؟"

"نہیں....." ارشین کے لہجے میں سکون تھا۔ "آپ مجھے یہیں رہنے دیں میں خوش ہوں، مصروف ہوں اور اپنے حال سے مطمئن ہوں۔ آپ میرے معمولات کار میں دخل اندازی نہ کریں۔ نوازش ہو گی۔"

مہران کچھ دیر تک اس کا چہرہ پڑھتا رہا جہاں ہمیشہ کی طرح سکون، ٹھہراؤ اور طمانیت تھی پھر وہ آہستگی سے پلٹ گیا۔

ارشین بت کی مانند کھڑی رہ گئی۔

ٹھیک تین دن بعد ارشین کو ڈاک کے ذریعے دو رجسٹریاں موصول ہوئیں۔ ایک میں دن کوٹ کا یہ گھر اور مہران کی یہاں کی تمام زمین ارشین کے نام کر دی گئی تھی۔ اسے گھر اور زرعی اراضی کا مالک و مختار بنا دیا گیا تھا۔ وہ بھی جائیداد والی ہو گئی تھی۔ اب اسے کوئی بے گھر نہیں کر سکتا تھا اور دوسری رجسٹری میں طلاق نامہ تھا۔

طلاق کے ساتھ پچاس ہزار حق مہر کی رقم اور تین لاکھ کا بان نفقے کا چیک تھا۔ اسے تمام فرائض اس وقت یاد آئے تھے۔ جب رشتہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

اور کیا اہل ستم کاٹیں گے
زہر بویا ہے تو سم کاٹیں گے
اپنا غم ختم ہوا شام ہوئی
اب کسی اور کا غم کاٹیں گے
ہم نے کاٹی ہیں طنابیں دن کی
ہم ہی یہ شام الم کاٹیں گے

ارشین دھیرے دھیرے روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی اپنے سٹور نما کمرے میں آئی اور الماری سے بیگ نکال کر اسے کھولنے لگی۔ اس نے دراز سے ایک لفافہ نکالا اس میں دو کاغذ تھے۔

اس نے سامنے چارپائی پر دونوں کاغذوں کو کھول کر بچھانے کے بعد ہاتھ میں پکڑی رجسٹری بھی ساتھ رکھ دی۔

شادی کا نکاح نامہ پہلے نمبر پر تھا دوسرے نمبر پر مہران کی دوسری شادی کا دعوت نامہ تھا اور اس کے ساتھ طلاق نامے والا کاغذ پڑا تھا۔

تین ورق مختلف عنوانات کے ساتھ مطالعے و ملاحظے کے لئے تیار رکھتے تھے۔

وہ انہیں دیکھتی رہی دیکھتی رہی پھر اسی گم صم کیفیت میں دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھائے اور انہیں پھاڑنے لگی۔ کچھ دیر بعد کاغذات ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے اور ان ٹکڑوں پر ارشین کے خاموش آنسو موتیوں کی طرح بکھر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

"مسٹر کرائم رپورٹر! تم گزشتہ تین ماہ سے کہاں دفن تھے بھئی۔ ہم نے تو کنوؤں میں بانس تک ڈلوا کر دیکھ لیے۔"

نیازی صاحب نے نیوز رپورٹس کھنگال کر ہیڈ لائن کے بارے میں سوچتے ہوئے داور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خوشدلی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کے پرانے کرم فرماؤں میں سے تھے اکثر اخبار کے دفتر آتے رہتے تھے۔ داور سے بھی ان کی بڑی اچھی سلام دعا تھی۔

"اخاہ۔ نیازی بھائی۔" داور نے بھی جوابی خوشدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"میں یورپ کے "رنگین و سنگین" قسم کے ٹرپ کے مزے لوٹ کے آیا ہوں جناب۔ سرکاری خرچے پر ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ گئے تھے۔ ساتھ میں کچھ چنیدہ اخبارات کے صحافی بھائی بھی تھے۔ خوب لطف رہا۔"

داور کی ایک خوبی تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے مخاطب کے ذوق ذہنیت اور اسٹائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بات کرتا تھا۔ نیازی صاحب خوب ہنسے۔

"بڑے شیطان ہو بھئی تم۔ اور سناؤ کیا کیا "مزے" کیے۔"

"یہ "پرائیویٹ" باتیں یہاں نہیں کی جا سکتیں۔" داور نے شرارتاً ایک آنکھ دبائی نیازی صاحب کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔

"تب ہی تو صاحب جس کو دیکھو یورپ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ لوگ پکی نوکریاں چھوڑ کے باہر سیٹل ہو رہے ہیں۔ اپنے ایس ایس پی صاحب کی مثال سامنے ہے۔ اچھی بھلی معززانہ جاب سے استعفیٰ دے کر فرانس جا پہنچے۔ ابھی تو وزٹ ویزے پر گئے ہیں۔ سنا ہے کچھ ماہ کے اندر اندر وہیں سیٹ ہو رہے ہیں اپنا کوئی کاروبار شروع کر رہے ہیں وہاں۔"

نیازی صاحب تو اپنی جھونک میں کہتے جا رہے تھے اور داور کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

"ایک منٹ نیازی بھائی! کیا آپ ایس ایس پی مہران آفریدی کی بات کر رہے ہیں؟" وہ عجلت میں بات کاٹ کر بولا۔

ظاہر ہے میرے بھائی۔ اس شہر میں اور کتنے ایس ایس پی ہوا کرتے ہیں....." نیازی صاحب اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہوئے۔

"کیا وہ یہاں نہیں ہیں؟"

"ہاں بھئی۔ فرانس میں بیٹھے ہیں۔ کمال ہے اتنی اہم خبر تم تک نہیں پہنچی تمہارے اخبار نے تو تین ماہ پہلے بڑے چٹ پٹے انداز میں خوب نمک مرچ لگا کے یہ اسٹوری چھاپی تھی۔"

"اس وقت میں یہاں نہیں تھا۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

اگر مہران فرانس سیٹل ہو رہا ہے تو ارشین؟

وہ کہاں ہوگی۔ اس کے بارے میں کیا انتظام کیا گیا ہے؟

ایسی کیا افتاد ٹوٹ پڑی جو آناً فاناً استعفیٰ دے کر منظور کروا کے ملک سے فرار ہو گیا۔ وہ تو بہت محب وطن ہوا کرتا تھا۔ اپنا ملک چھوڑ کر باہر جا کر اپنی ذات بیچنے والوں کے بارے میں ہمیشہ نفرت کا اظہار کرتا تھا۔

وہ نیازی صاحب کو ٹال کر تیزی سے آفس سے باہر نکل گیا۔

اس کا رخ آفریدی ہاؤس کی جانب تھا۔

بیل بجانے پر ناظر باہر آیا تھا۔ گھر پر اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ناظر اسے اندر لے آیا تھا اور بیٹھنے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ مجھے نجی اور سفیان سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔"

داور بے چینی سے نظریں گھما رہا تھا پھر اچانک کچھ یاد آ جانے پر وہ ناظر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہم گھر کے معاملات میں ہمیشہ انوالو رہے ہو میرا خیال ہے میرے سوالوں کے جواب تم بھی دے سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کیا مہران پولیس جاب سے استعفیٰ دے کر یورپ چلا گیا ہے؟....."

"ہاں جناب....." ناظر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"اس گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ سفیان بھیا ہیں تو ان کے ہونٹوں کو جیسے کسی نے آپ میں سی دیا ہے۔ خاموش انتہائی سنجیدہ اور الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ نئی کالج کے بعد اپنے کمرے کی ہو کے رہ جاتی ہیں۔"

"اور بھابھی؟" داور نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ "دنایاب بھابھی کہاں ہیں۔ مہران کے ساتھ چلی گئی ہیں کیا....."

"انہیں تو بھائی جان کب کے میکے بھیج چکے ہیں۔"

"کیا؟" داور کو جھٹکا سا لگا۔

"ہاں....." ناظر نے افسوس سے سر ہلایا۔

"پتا نہیں بھائی جان کو کیا ہو گیا تھا۔ نایاب بھابھی کو گھر سے نکال کے ارشین آپا کو لینے گئے تھے مگر واپس آئے تو پتا چلا انہیں طلاق دے دی ہے۔"

"کیا؟....." اب کی دفعہ کا جھٹکا گویا چار ہزار وولٹ کے کرنٹ کے برابر تھا' داور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جی....." ناظر کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

"کیا مہران پاگل ہو گیا ہے؟" داور کا بس نہیں چل رہا تھا مہران کا گریبان پکڑ کر اسے بری طرح جھنجھوڑ کر اپنے سوالات کے تفصیلی جوابات چاہے۔

"آپ بیٹھیے تو۔ اٹھ کیوں گئے۔"

"چلتا ہوں اب....." وہ بے خیالی میں بڑبڑاتا ہوا ایک دم کمرے سے نکل گیا۔ وہ فوراً سے پیشتر وسن کوٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

"مس ارشین بخاری کہاں ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ہیں اس وقت؟"

وہ سوشل ڈائجسٹ کے آفس میں پہنچتے ہی جمیل صاحب سے دریافت کرنے لگا۔

"سر جی انہیں تو پچھلے مہینے لاہور والے آفس میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔"

جمیل صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"لاہور....." داور نے حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں۔ آپ نے خود ہی تو سائن کیے تھے ان کی تنخواہ میں اضافے اور لاہور میں ٹرانسفر کے آرڈرز پر۔ آپ کے جانے کے بعد قائم مقام ایڈیٹر رضوی صاحب نے پچھلے ماہ آرڈر پر عمل درآمد کروا لیا۔ ارشین صاحبہ کی ایک عزیزہ گونگی بوا کا انتقال ہو گیا تھا ان کے سوئم کے بعد وہ لاہور چلی گئیں۔"

"اوہ۔ میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا سائن کرتے ہوئے۔" داور نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور انگلی سے کنپٹی بجانے لگا۔

"گویا اب وہ لاہور ہوں گی۔" اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے جمیل صاحب کی طرف دیکھا۔ "مگر ان کی رہائش کا بندوبست اور دیگر انتظامات۔" وہ فکر مند تھا۔

"رضوی صاحب نے بتایا تھا مس بخاری نے ورکنگ ویمن ہوسٹل میں کمرہ لے لیا ہے' وہیں رہتی ہیں۔"

"مجھے کھانا کھلاؤ۔ شام کو مجھے لاہور روانہ ہونا ہے۔"

وہ دوسری کرسی پر پاؤں پھیلا کر ایزی ہوتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

اسلام آباد سے وسن کوٹ۔

پھر وسن کوٹ سے لاہور۔

دوسری دفعہ بے ٹھکانا ہوئی تھی' مگر اب کی بار مالی اور ذہنی اعتبار سے پوزیشن مضبوط تھی۔ مہران کی طرف سے مہر اور نان نفقے کی رقم ملا کر ساڑھے تین لاکھ کا چیک جسے وہ کیش کروا چکی تھی' اس کے بہت سے مسائل حل کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہاسٹل کا چھ ماہ کا ایڈوانس کرایہ دینے کے بعد اس نے بقیہ رقم اپنے نام سے اکاؤنٹ کھلوا کر بینک میں جمع کروا دی تھی۔ اپنے گزارے کے لیے آفس سے ملنے والی ماہانہ تنخواہ کافی تھی۔

ذہنی لحاظ سے مضبوطی کے لیے وسن کوٹ میں رہنے کا تجربہ ہی بہت تھا۔ وہ جن کٹھن حالات

سے گزری تھی اس کے بعد مشکلات کا سامنا کرنا گویا روٹین کا حصہ بن گیا تھا۔

ایک عرصے کے بعد وہ آسودگی سے سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تھی۔

"اس دن وہ آفس سے جلدی نکل آئی تھی۔ اسے کچھ کپڑے اور جوتے لینے تھے ایک دو اور بھی چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا تھیں۔

خریداری کے بعد وہ یوں ہی وقت گزاری کو ایک فاسٹ فوڈ پر کافی پینے بیٹھ گئی۔ شام کو ساڑھے چھ بجے وہ ہاسٹل پہنچی تو پتا چلا کوئی صاحب گزشتہ ایک گھنٹے سے وزیٹنگ روم میں محو انتظار ہیں۔ پہلے اس کے آفس گئے تھے۔ وہاں غیر موجود پا کر ادھر آ گئے۔

کون ہو سکتا ہے؟

کہیں سعد تو نہیں.....؟ وہ سوچتی ہوئی وزیٹنگ روم میں داخل ہوئی تو سیاہ پینٹ اور خاکی شرٹ میں ملبوس سانولے رنگ کے عینک والے اس چلبلے مگر ذہین وفطین صحافی کو دیکھ کر اچھا خاصا حیران ہوئی۔

"ارے۔ آپ کہاں آ پہنچے میرے پیچھے۔" سلام کرنے کے بعد بے ساختہ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں۔

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں۔

دیکھ لیجیے صاحب۔ ہم نقش پا گنتے گنتے ادھر تک پہنچ گئے۔"

داور کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے بھرپور انداز میں اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں دس کوٹ سے؟ میں پہلے ادھر ہی گیا تھا۔" وہ اس کے اشارے پر بیٹھ گیا۔

"ہمیں آپ حکام کی ہدایت پر در بدر کیا گیا ہے یہاں۔" وہ مبہم سا مسکرائی اور سامنے والی نشست سنبھال لی۔

"میں نے ایک خبر سنی ہے۔ باوثوق ذرائع سے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد داور دبے لہجے میں گویا ہوا۔

"اسے مہران کی آخری زیادتی سمجھوں یا پہلی شبت کاروائی۔"

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہا تھا۔

ارشین نے نظر چرا لی۔

"دوسری بات زیادہ مناسب ہے۔" گہری سانس لے کر بولی۔ داور کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ رگوں کا تناؤ بتدریج کم ہونے لگا۔

"گویا اس کے اس فیصلے میں آپ کی مرضی شامل تھی۔"

"اس میں ہم دونوں کی بہتری پوشیدہ تھی۔" ارشین نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "جو ہوا اچھا نہیں ہوا مگر بہت زیادہ برا ہونے سے کچھ اچھا ہو جانا بہر حال بہتر ہوتا ہے۔ مجھے ایس ایس پی صاحب سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ ایک اچھے انسان تھے بس ہم دونوں کا ساتھ ایک دوسرے کے لیے اچھا نہیں تھا اسی لیے زیادہ دیر تک چل بھی نہ سکا۔ فطرتاً ہم شروع دن سے ہی الگ تھے۔"

"اور آئندہ کے لیے سوچا ہے۔" داور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"آنے والا وقت اپنی ترجیحات کا تعین خود کرتا ہے۔ یہ بات مجھے اب سمجھ میں آ گئی ہے۔ انسان کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بھی زندگی سے بہت کچھ چاہتی تھی مگر مجھے زندگی سے وہ ملا جس کے بارے میں خواب وخیال بھی نہ تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" داور نے کندھے اچکائے پھر کھڑا ہو گیا کچھ دیر تک ٹھوڑی پہ ہاتھ جما کے کچھ سوچتا رہا پھر الجھن وہچکچاہٹ کے عالم میں اس کی طرف پلٹا۔

"خبر نہیں مجھے یہ بات اس موقعہ پر کہنی چاہیے یا نہیں۔" وہ جھجک کر بولا۔ "مجھے انسانی رشتوں کی نزاکتوں کی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ میں ان چیزوں سے بہت عرصہ ہوا بچھڑ چکا ہوں۔ بہت سادہ اور بے ترتیب سا بندہ ہوں۔ بظاہر مجھ میں کوئی خوبی وخصوصیت یا کشش بھی نہیں ہے کہ کسی کو متاثر کر سکے۔ تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے اول جلول اور الجھے بکھرے حلیے کے اندر جو ایک دل چھپا بیٹھا ہے وہ خلوص اور پیار کے چشموں سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ میں وہی اپنے لائف پارٹنر کی نذر کر سکوں گا۔ میں نے آپ سے ملنے سے پہلے کبھی شادی شدہ زندگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ایسی باتوں پر میں صرف ہنسا کرتا تھا مگر اب احساس ہوا یہ سفر بھی اپنی جگہ بہت سے مثبت اور خوبصورت موڑ دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ میں زندگی کا یہ سفر آپ کے ساتھ

شروع کرنا چاہتا ہوں۔" وہ رسانیت سے گویا تھا۔

"ایک مدت بعد میرے اندر اپنے پرانے گھر لوٹنے کی چاہ جاگی ہے۔" وہ بہت دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

"یہیں لاہور میں ہماری بہت بڑی کوٹھی ہے ارشین۔" وہ بچوں کے سے اشتیاق سے بتانے لگا۔ "اب تو شاید کھنڈر ہو چکی ہو گی مگر....."

پھر اس کی آنکھیں کسی احساس سے دمک اٹھیں۔

"مگر....." وہ رکا۔

"اگر آپ ساتھ دیں تو ہم اس کھنڈر کو پھر سے گھر بنا سکتے ہیں۔"

وہ رک رک کر دعا بیان کر رہا تھا۔

ارشین نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ بظاہر عام سے نارمل سے آدمی کے اندر چھپا بہت خوبصورت دل اس کی آنکھوں میں خلوص اور پیار کی چمک بن کر جگمگا رہا تھا۔

ارشین اس کے اندر کی اس خوبصورتی کو دیکھ سکتی تھی۔ محسوس کر سکتی تھی۔

اخلاص و محبت کی یہ چھاؤں اس کی تھکن دور کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔

"اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔" بہت دیر بعد وہ آہستگی سے بولی۔

"مگر ابھی نہیں۔ مجھے کچھ ٹائم چاہیے....."

"ٹھیک ہے..... جتنا مرضی ٹائم لے لیں۔" داور کا چہرہ کھل اٹھا۔

"لیکن ایک بات یاد رہے۔ امتحان آپ کے ظرف کا ہے۔ کیا آپ اپنے دوست کے حوالہ جات اور میرا ماضی فراموش کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟" وہ اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

"ماضی کیا ہوتا ہے ارشین! ختم ہو جانے والا وقت۔ مردہ وقت اور مردہ چیزوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ ماضی کے مزاروں پر یادوں کے پھول چڑھانے والے احمق ہوتے ہیں۔ پدرم سلطان بود والا محاورہ اس کمپیوٹرائزڈ ایج میں نہیں چل سکتا۔ یہاں ہونا نہیں کافی یہاں بننا بھی پڑتا ہے۔ اپنا وجود خود ثابت کرو ماضی کی یادگاریں ہماری ذات کی بقا کی ضامن نہیں بن سکتیں۔ اہمیت حال کی ہے۔ میرے لیے حال اہم ہے۔" وہ سنجیدگی سے گویا تھا۔

ارشین کے سر سے بہت سے بوجھ سرکتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆☆☆

"آؤ نازش! کیسے ہو آپ بیٹے۔ ایک مدت بعد نظر آئی ہو۔ اب تو آپ ہی ہو جو بھولے بھٹکے اس گھر کی خاموشی میں کمی کرنے آ جاتی ہو۔"

نینی اسے دیکھ کر پائپ کیاری میں رکھتے اٹھ گئی تھیں۔

"میں بھی پاکستان میں اب کچھ دنوں کی مہمان ہوں نینی....." سبز شال میں ستورم سبز آنکھوں اور پھیکی رنگت لیے وہ ملگجے سے لباس میں اپنے حال کی تفسیر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

"کیوں خیریت..... کیا مہران کے بعد اب آپ بھی اپنی سرزمین چھوڑ کر باہر آباد ہو جائیں گی۔" نینی کو سخت تاسف ہوا۔

"کچھ عرصے کے لیے وطن چھوڑنا ہی ہو گا۔ مجبوری ہے۔ مہوش کی رپورٹس امریکہ بھجوائی تھیں وہاں سے کچھ امید افزا جواب ملا ہے ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ بچی کو لے آئیں۔ عین ممکن ہے سال چھ ماہ کی ٹریٹمنٹ کے بعد بڑی حد تک مرض کا خاتمہ ہو جائے۔ لہٰذا اب ایک آدھ سال ہمیں امریکہ میں رہنا ہو گا۔"

"نازش کا انتظام کیسے ہو گا۔"

"دانیال کا اپنا فلیٹ ہے امریکہ میں۔"

"چلو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا....." نینی سوچ میں گم سر ہلانے لگیں۔ "اللہ تعالیٰ بچی کو شفا عطا فرمائے۔ ننھی سی جان ہے۔ گڑیا سی تو ہے۔" نینی کے لہجے میں حقیقی شفقت تھی۔

نازش کی آنکھیں پانیوں میں ڈوبنے لگیں۔

"دانیال میاں کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہی ہوں گے۔" نازش کے لہجے میں تلخی تھی۔ "بس تعلق کو ڈور ہے نینی۔ مجبوری نے باندھ رکھا ہے ورنہ ان کی شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بچی کو درد سے تڑپتا دیکھتی ہوں تو جی چاہتا ہے۔ بیٹی کو ساتھ لے کر اس شخص سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جاؤں۔ آہ لگی ہے میری بیٹی کو۔" اس کا لہجہ بھرا گیا۔

"سیاہ اعمالی باپ کی ہے اور بھگت بیٹی رہی ہے۔"

"ایسے نہیں کہتے بیٹے۔" نینی نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے کندھے سے

لگالیا۔ نازش اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ سفیان کہاں ہے۔ نظر نہیں آتا آج کل....." وہ بات بدلنے کو بولی۔

"اندر ہی ہوگا۔ جانا کہاں ہے۔ اس نے تو ایسا چولا بدلا ہے کہ اپنے پرائے سب حیران ہیں۔ کم گوئی اور سنجیدگی تو ایک طرف وہ ناظر سے بھی فقط ہوں ہاں میں بات کرتا ہے۔ ایکدم خاموش آفس سے گھر اور گھر سے آفس۔ اس کے علاوہ نہ کہیں آتا ہے نہ جاتا ہے۔ میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی۔" نجی ملول ہو کر بولیں۔

"بہتر ہوگا فاریہ کو رخصت کرا کے گھر لے آئیں۔ یوں بھی نکاح ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے....."

"اب کیا کہوں بیٹے! میرا اپنا دل ہی مر گیا ہے۔ سچ پوچھو تو بہو لانے بیاہنے کے سارے چاؤ ختم ہو گئے ہیں۔ یہ سب رشتے ناطے بے معنی لگنے لگے ہیں۔ مہران کو دیکھ لو خود تو یورپ جا کر بیٹھ گیا ہے اور ادھر دو نایاب کی صورت میں سوالیہ نشان میرے لئے چھوڑ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کیا نہ کروں۔"

انہوں نے سر تھام لیا۔

"ارشین کو طلاق دے کر مہران اچھا نہیں کیا۔" نازش نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ دوسری حماقت ہے کہ نایاب کو بھی نہیں بسا رہا۔ یہ اس سے بھی بڑی غلطی ہے اور لگی لگائی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ۔ اوہ! مجھے مہران سے یہ امید نہیں تھی....."

نازش نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائی ہوئی تھیں اور انہیں بار بار جھٹکے دے رہی تھی۔

"جزا و سزا کا اختیار خدا کے پاس ہے لیکن جب بندہ یہ میزان اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو اس سے اسی طرح غلط فیصلے سرزد ہوتے ہیں۔" نجی دکھ سے بولیں۔ "ہم کون ہوتے ہیں اپنی مرضی سے کسی کو گنہگار ٹھہرا کر سزا دینے والے! اصل منصف اور قادر تو خدا کی ذات ہے مگر افسوس یہ بات انسان اس وقت سمجھتا ہے جب وہ اپنا بہت زیادہ نقصان کر چکا ہوتا ہے۔"

نجی نے سرد آہ بھری۔

"مہران کی انتہا پسندانہ سوچ نے اسے کہیں کا نہیں رکھا۔" نازش نے برملا کہا۔

"آپ اس پر زور دیں۔ وہ نایاب کو عزت کے ساتھ گھر لے آئے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ ایک کو اجاڑا ہے دوسری کو تو بسا لے۔ کیوں زمانے بھر میں اپنا تماشا بنا رہا ہے۔"

"اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ تم بات کر کے دیکھ لینا۔ کسی طرح بھی سہی معاملہ تو نپٹے۔ نایاب کے والد کئی بار فون کر کے استفسار کر چکے ہیں۔" نجی نے بتایا۔

"ہاں اگر اس نے آنے تک پاکستان میں رہی تو ضرور سمجھاؤں گی۔ آگے اس کی مرضی۔ میں چلتی ہوں نجی۔"

☆☆☆☆☆☆

راشد صاحب کافی عرصے بعد بارہ کہو کے ڈرگ کنٹرول سنٹر میں امبرین کی خبر گیری کے لئے آئے تھے یہاں آ کر انہیں یہ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ امبرین آٹھ ماہ کی باقاعدہ ٹریٹ منٹ کے بعد نہ صرف یہ کہ صحت یاب ہو چکی تھی بلکہ اس نے نرسنگ کورس کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ رہائش کے لئے نرسنگ سٹاف کے اپارٹمنٹس میں کمرہ مل گیا تھا۔ اب وہ پوری لگن اور محنت کے ساتھ نرسنگ کا کام سیکھ رہی تھی۔

"یہ تو بالکل مردے کو زندہ کر دینے والی بات ہو گئی ڈاکٹر صاحب....." راشد صاحب نے گرمجوشی سے ڈاکٹر رضا سے ہاتھ ملایا تھا۔

"آپ ان کے لواحقین کو اطلاع کر دیجئے۔ وہ چاہیں تو انہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ مس امبرین اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی ہیں۔"

ڈاکٹر رضا نے انہیں اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی نشست سنبھالی۔

"اچھی بات ہے۔ میں گوٹھ میں خط لکھ کر بخاری صاحب کو مطلع کر دوں گا۔ ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امبرین کو اپنا نرسنگ کورس مکمل کر لینا چاہئے۔"

"راشد صاحب۔" ڈاکٹر رضا کچھ دیر تک غور کرتے رہے پھر مخاطب ہوئے۔ "آپ بخاری فیملی کے قریبی عزیز ہیں اور ایک طرح سے اس شہر میں مس امبرین کے سرپرست بھی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"جی ارشاد....."

"میں نے بڑی توجہ اور لگن سے ٹکڑا ٹکڑا جوڑ کر ایک نئی شخصیت تشکیل دی ہے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کو مثبت سطح تک پہنچایا ہے۔ میں نہیں چاہتا اتنی مشکل سے زندگی کی روشن راہ پر گامزن ہونے والا وجود کسی ناخوشگوار صورتحال کے نتیجے میں پھر سے اندھیروں میں کھو جائے۔ یوں سمجھئے جیسے مصور کو اپنی تخلیق سے لگاؤ ہو جاتا ہے کچھ اسی طرح میری اس مشکل اور تقریباً ناممکن کیس میں دلچسپی بڑھتی گئی اور میں نے اس مریضہ کو زندگی کی طرف لوٹانے کا چیلنج گویا زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا اور اب اس سٹیج پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا یہاں رہنا ان کیلئے بھی فائدہ مند ہے ادارے کے لئے بھی اور....."

"وہ کچھ توقف کے بعد سر جھکا کر میز پر پڑے اسٹیتھو سکوپ سے کھیلنے لگے۔

"اور میرے لئے بھی۔" انہوں نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی؟....." راشد صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی بات کر سکتے ہیں۔ وہ ہکا بکا ان کی صورت دیکھنے لگے۔

"آپ شاید میری عمر کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں۔ چالیس برس کی عمر کم نہیں ہوتی جبکہ امبرین بمشکل بائیس برس کی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں پوری ذمہ داری اور اعتماد کے ساتھ امبرین کو خوش رکھ سکتا ہوں۔ میں اس کی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ اس کی شخصیت کے ناتراشیدہ پہلوؤں سے واقف ہوں سو ان خامیوں کو دور کر کے اسے تراش کر ایک مکمل اور بھرپور روپ دے سکتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے اس کا اندر بہت معصوم اور سادہ ہے۔ یہ صرف زندگی سے ملنے والی محرومیاں تلخیاں اور چرکے ہیں جنہوں نے اس کی بیرونی آؤٹ لک کو منفی بنا دیا ہے۔ جب یہ فاضل مواد نکل جائے گا تو اندر سے سادہ شفاف صورت خود بخود نمودار ہو جائے گی۔ ہم کیوں ایسے لوگوں کو کوڑے کرکٹ کی طرح معاشرے کے کچرے میں پھینکتے جائیں۔ اگر کوئی اپنے جرم کی سزا بھگتنے کے بعد عزت چاہتا ہے وہ اس کا بنیادی حق ہے اور اسے ملنا ہی چاہئے۔"

"میں حیران اس لئے ہوں کہ آپ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے یہ پروپوزل دے رہے ہیں۔ ہر کوئی آپ کی طرح نہیں سوچتا۔ یہ معاشرہ ٹھکرائے ہوئے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو قبول نہیں کرتا۔ پھر آپ کیسے.....؟"

راشد صاحب طبیعت کے کھرے بندے تھے جو مناسب سمجھتے تھے منہ پر کہہ دیتے تھے وہ

دل کی بات دل میں رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے مخصوص انداز میں جو محسوس کیا کہنے سے خود کو باز نہ رکھ سکے۔

"راشد صاحب! کسی کو تو سوچنا ہی ہوگا ناں اس بارے میں۔" وہ ہلکا سا مسکرائے۔ "کوئی تو پہلا قطرہ بنے۔ یوں بھی گھاٹے میں نہیں رہوں گا۔ امبرین ایک اچھی لڑکی ہے۔ بس تربیت کی کمی ہے اور کچھ قوت ارادی کی کمزوری۔ انشاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کمزوریاں بھی دور ہو جائیں گی۔"

"سوچ لیں۔ ایسا نہ ہو ابھی جوش میں آ کر غیر معمولی قدم اٹھا لیں اور پھر کل پچھتاوں کا شکار ہو کر فیصلہ بدل لیں....."

"ایسا نہیں ہوگا۔ اب اس عمر میں آ کر مجھ سے جذباتی فیصلے کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ مجھے بتائے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔ مہران کئی ماہ سے ملک سے غائب ہیں۔ امبرین کے والدین یہاں نہیں ہیں۔ یہ معاملہ کس کی عدالت میں پیش کیا جائے۔"

"میں اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں۔ اپنی وائف سے مشورہ کر کے آپ کو آگاہ کروں گا۔" راشد صاحب نے جواب دیا تھا۔

"امبرین کہاں ہوگی اس وقت۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "اس سے ملتا چلوں۔"

"ایک منٹ میں آپ کو ان کے روم تک پہنچاتا ہوں۔" ڈاکٹر رضا نے بیل بجا کر وارڈ بوائے کو طلب کیا تھا۔ "بلکہ بہتر ہوگا آپ اس بارے میں ان سے بھی ڈسکس کر لیجئے۔"

کچھ دیر بعد وہ نرسنگ اپارٹمنٹس کے احاطے میں امبرین کے روبرو تھے۔ سفید یونیفارم میں وہ چہرے پر صحت مندی کی سرخیاں لئے انہیں بہت بھلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاصی مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔

"آنٹی رقیہ کیسی ہیں انکل۔"

"ٹھیک ہیں بیٹے....."

وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر مختصراً ڈاکٹر رضا کے پروپوزل کے متعلق بتایا۔

وہ کتنی ہی دیر ساکت و صامت بیٹھی رہی۔

ایک انتہائی معزز و محترم اور نفیس ہستی اسے شریک سفر بنانے کی متمنی تھی۔

وہ لڑکی جسے معاشرہ پستیوں کی انتہا میں ڈبو چکا تھا۔

کہیں قدرت میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہی؟

اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"وہ سیریس ہیں بیٹے....." راشد صاحب نے سر ہلایا۔

"تم سوچ لو۔ سوچ کے اپنا جواب بتا دینا۔ میں کوشش کرتا ہوں کسی طرح گوٹھ میں تمہارے والدین سے رابطہ کروں۔"

وہ اس کا سر تھپتھپا کر چلے گئے۔

امبرین ان کے جانے کے بعد دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رو دی۔

انسان اتنا بے صبرا اور ناشکرا کیوں ہوتا ہے؟

کیوں اس کا دل اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ دوسرے کی خوشی سہار نہیں پاتا۔ الٹا اسے چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ کیوں یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی باری میں سارے در بند ہو جائیں گے۔

کیوں کسی کے لبوں کی ہنسی چھین کے اپنے ہونٹوں پر سجانے کی کوشش کرتا ہے!

قدرت نے ہر شخص کیلئے دکھ سکھ کا الگ کوٹہ مخصوص کر رکھا ہے۔ سب کو اپنے اپنے حصے کی خوشیاں مل جاتی ہیں مگر ہم بے صبرے لوگ.....! کہ ہم سے صبر نہیں ہوتا۔

ہم سے اچھے وقت کا انتظار نہیں ہوتا۔

ہم سے دوسروں کی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔

ہمیں محرومیوں سے لڑنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

میں نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ خدا نے میرے نصیب میں کوئی سکھ کی گھڑی نہیں لکھی۔

کاش میں نے مشکل گھڑیاں صبر کے ساتھ کاٹنے کا سبق سیکھا ہوتا۔

کاش میں نے انتظار کرنا سیکھا ہوتا۔

اگر مجھ میں صبر اور انتظار کرنے کی طاقت ہوتی تو راستے سے نہ بھٹکتی، بہک کر غلط ہاتھوں میں نہ جاتی اور آج اپنے ماضی سے اس قدر شرمندہ نہ ہوتی۔

اس نے آہ بھری۔ آج اسے اپنی ساری غلطیاں نظر آ رہی تھیں۔

اس کا جی چاہا ڈاکٹر رضا کے سامنے جا کر برملا اعتراف کر لے۔

"میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے ابھی کچھ اور سزا ملنی چاہئے تھی۔ یہ عنایت میرے ظرف سے بہت زیادہ ہے۔"

مگر وہ خود کو اس قابل بھی نہیں پا رہی تھی کہ ان کا سامنا کر سکے۔

بعض لمحے بڑے عجیب ہوتے ہیں اس طرح آپ کی زندگی میں آتے ہیں کہ آپ کو ساکن رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شاہین شبانہ آنٹی کے ساتھ کپڑوں اور جوتوں کی خریداری کیلئے انارکلی کی دکانیں چھان رہی تھی جب اچانک ایک سٹال پر اس کی نظر سفید اور براؤن پرنٹ کے سوٹ میں ملبوس اس لڑکی پر پڑی تھی۔

"ارشین آپی....." استعجاب کی انتہا ایک تیز چیخ کی صورت میں شاہین کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔

وہ سیلز مین سے پوسٹر کلرز کا باکس نکالنے کو کہہ رہی تھی چیخ نما پکار سن کر یک لخت گردن موڑ کر دیکھا اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی۔

"شاہین!" اس کے خاموش لب بے آواز ہلے تھے۔ "یہاں۔ لاہور میں!"

"ارشین آپی.....!" شاہین اب سو فیصد پہچان چکی تھی وہ کسی تند و تیز ریلے کی طرح لپکتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

"آپی.....!" دوسرے لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھی۔

ارشین نے اسے کسی عزیز ترین شے کی طرح اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ ایک مدت بعد کسی اپنے کا لمس میسر آیا تھا۔

"آپی آپ یہاں لاہور میں رہتی ہیں؟" شاہین اس سے الگ ہو کر بچوں کی سی بے قراری سے اس کے بازو اور ہاتھ ٹٹول رہی تھی جیسے اس کی موجودگی کا یقین چاہ رہی ہو۔

"ہاں۔ مگر تم یہاں کیسے پہنچیں؟" پھر ارشین کی نظر اس کے پیچھے حیران پریشان کھڑی ایک

معززی خاتون پر پڑی۔ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔

کیا شاہین کی شادی ہوگی ہے؟ اس نے الجھن کے عالم میں شاہین کا سراپا دیکھا۔ گو کہ اس کا لباس و انداز وعمدہ اور نفیس نظر آ رہا تھا مگر سونے کی کوئی چیز نہیں پہنی ہوئی تھی جو شادی کی نشانی قرار پاتی۔

"شاہین بیٹی! انہیں اپنے ساتھ گھر لے چلو۔ آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کرنا۔ بازار میں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔" وہ ریانیت سے گویا ہوئیں۔

اب ارشین کو مزید یقین ہو گیا۔ ہو نہ ہو یہ شاہین کی ساس ہیں۔ اس نے تصدیق کے لئے شاہین کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپی! یہ ایک بہت مہربان خاتون ہیں۔ میں ان کی کے گھر میں رہتی ہوں ان کے ساتھ۔ ان کے بیٹے سعد بھائی کے دوست ہیں....."

ارشین گومگو کی کیفیت میں شاہین کی شکل دیکھنے لگی۔

"آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ بڑی لمبی داستان ہے۔ تفصیل سے سناؤں گی۔ فکر نہ کریں۔ آنٹی ہماری بہت زیادہ اپنی ہیں۔ وہ سب جانتی ہیں۔"

☆☆☆☆☆

ٹھیک اسی دن جب ارشین اور شاہین کی ملاقات ہوئی سعد کراچی سے پہنچا تھا۔ اس کا ٹرانسفر کراچی ہو چکا تھا۔ ویک اینڈ پر امی ابو سے ملنے اسلام آباد آیا تھا۔ شاہین کی صورت میں ذمہ داری اس کے کاندھوں پر تھی وہ اب اسے کسی دوسرے کے سر ڈالنا چاہتا تھا۔ آیا تو پتا چلا بخاری لاج میں تالا پڑا ہوا ہے۔ راشد صاحب نے مختصراً حالات بتائے۔ ابرین کے متعلق بھی بتایا۔

"اتنے عرصے سے کہاں غائب تھے۔" ساتھ ساتھ حسب معمول خفا بھی ہو رہے تھے۔

"تمہاری ماں نے اور نازو نے میرا ناطقہ بند کر رکھا تھا کہ بیٹے کا کچھ پتا کرائیں۔ کہاں گیا۔"

"میرا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ اتنی جلدی میں جانا پڑا کہ بتا نہیں سکا۔" اسے یہاں کے حالات جان کر سخت دھچکا لگا تھا۔

ان لوگوں کو جھٹکا تب لگا جب اس نے شاہین کے بارے میں بتایا۔

"اتنے عرصے تک تم نے یہ بات ہم سے چھپائے رکھی....." رقیہ بیگم غم و غصے سے لرز رہی

تھیں۔ "وہ تمہارے پاس تھی تو خبر کیوں نہ کی؟"

"اس وقت خاموشی ہی بہتر تھی امی!" وہ انہیں ٹھنڈا کر رہا تھا۔

"اگر اسے یہاں لاتا تو ان کے گھر زلزلہ آ جاتا۔ اب معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ آپ اسے لے آئیے اور اس کے والدین تک پہنچا دیں تاکہ ہماری ذمہ داری ختم ہو۔"

"ہم خود چلیں گے وہاں....." راشد صاحب نے اعلانیہ کہا۔

"خود جا کر اسے لے کر آئیں گے۔" وہ بخاری صاحب کی غیر موجودگی میں قرابت داری کا حق پوری طرح نبھا رہے تھے۔

لیکن جب وہ لوگ لاہور پہنچے تو شاہین کے ساتھ ساتھ ارشین کو بھی موجود پا کر خوشگوار حیرت میں گھر گئے۔

ارشین تمام حالات سے باخبر ہو چکی تھی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا پروفیسر دانیال مہدی پر فائر کھول دے۔ بس نہیں چل رہا تھا ان کی بوٹی بوٹی نوچ لیتی۔

شبانہ خاتون نے تو سادگی میں اسے شاہین اور سعد کی آپس میں شادی کرانے کی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ بلکہ موقع نکال کر یہ بات انہوں نے رقیہ بیگم اور راشد صاحب کے کانوں میں بھی ڈال دی۔

"لوگوں کو چھوڑیں۔ آپ کی تو دیکھی بھالی ہے۔ سامنے پلی بڑھی ہے۔ بھول تو اس سے ہوئی ہے مگر آپ ڈھک لیں گی تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بہن! مسئلہ میرے بیٹے کی مرضی کا ہے۔ دوسرے بچی بہت چھوٹی ہے ابھی۔" رقیہ بیگم ہچکچا رہی تھیں۔

"چھوٹی کہاں ماشاء اللہ سمجھدار اور سیانی ہے۔" شبانہ خاتون چمک کر بولیں۔ "رہی بیٹے کی مرضی کی بات تو بہن اس کا ایک ہی مسئلہ ہے کہ کھونٹے سے بندھنا منظور نہیں ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ اس کی شادی کی عمر ہے اور اب اسے کر ہی لینی چاہئے۔ آپ زور دے کر بات کریں گی تو مان جائے گا۔" وہ گویا ہر صورت تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔

ارشین دوسرے کمرے میں شاہین کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی ایک ایک کے بارے

میں تفصیل سے پوچھ رہی تھی۔ مدتوں کی تشنگی تھی اتنی جلد کیسے سیرابی ہو سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆

"سہران سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔" نازش نے چلتے ہوئے نینی کو مخاطب کیا۔ "ملاقات تو نہیں ہو پائی۔ کہہ رہا تھا اس ہفتے کی فلائٹ نہیں مل سکی۔"

"اچھا۔ اور کیا کہتا ہے اب وہ....."

"وہ فرانس میں اپنا بزنس سیٹ کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا' کچھ عرصے بعد پاکستان آئے گا نایاب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے۔"

"شکر ہے خدایا' کوئی فیصلہ تو درست کیا۔" بے اختیار نینی کے منہ سے نکلا تھا۔

نینی اور سفیان پروفیسر دانیال' نازش اور مہوش کو خدا حافظ کہنے ایئرپورٹ آئے تھے۔ آج انکی نیویارک کی فلائٹ تھی۔

"اب وہ بھلے سے فرانس میں سیٹل ہو جائے میری پریشانی میں کچھ تو کمی ہو گی۔ بہو ساتھ ہو گی تو دل کو تسلی رہے گی اسکی طرف سے فکر بھی کم ہو جائے گی۔ یوں بھی نایاب کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔"

"کہہ رہا تھا پروفیشن اس لئے چھوڑا تھا کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تھا اور ملک بدری خود کو سزا دینے کے لئے منتخب کی تھی۔ نایاب کو فرانس اپنے پاس بلانے کا فیصلہ بھی اسی سزا کا ایک حصہ ہے۔"

اسی لمحے فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا تھا۔

"ارے ہاں۔ کل کے نیوز پیپر میں کیوبا کے قریب ایک مسافر بردار طیارے کے گر کر تباہ ہونے کی خبر آئی تھی۔ مسافروں کی لسٹ میں لیلیٰ شاہ کا نام بھی شامل تھا۔ وہ یہاں سے فرار ہو کر بیرون ملک کسی جگہ مفرور ہو گئی تھی۔ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔" نینی کو جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"نازش آپا۔ آ جائیے۔ دیر ہو رہی ہے....." سفیان تیزی سے چلتا ہوا ان کی طرف آیا تھا۔

نازش نینی سے مل کے آگے بڑھ گئی.....

"دعا کیجئے گا کامیابی کی خبر کے ساتھ دوبارہ اس سرزمین پر قدم رکھیں....." نازش نے چلتے

ہوئے چھلکتے آنسوؤں کو صاف کر کے کہا تھا۔

نینی ریلنگ تھامے کھوئے ہوئے شکستہ انداز میں افق کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

"شبانہ خاتون کی تجویز میرے دل کو لگی ہے۔" راشد صاحب پشت پر ہاتھ باندھے ٹہلتے ہوئے گویا ہوئے۔ وہ لوگ کل اسلام آباد واپس پہنچے تھے۔ فی الحال شاہین کو لاہور میں شبانہ خاتون کے پاس ہی رہنے دیا تھا یوں بھی اب ارشین بھی وہاں موجود تھی۔ ارشین کی زبانی اس کی طلاق کی افسوسناک خبر ان تک پہنچ گئی تھی۔

"بخاری صاحب تو اپنے تئیں شاہین کو دفنا چکے ہیں۔ وہ اسے کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے جو کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہو گا میرا خیال ہے ہمیں نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کیوں نہ سعد کو کراچی سے بلوا لیں۔ سادگی سے بچی کو بیاہ کر گھر لے آتے ہیں۔ بس نازش اس کا خاوند اور چند دیگر قریبی عزیزوں کو ہمراہ لے جائیں گے۔"

"وہ سب تو بعد کی بات ہے پہلے سعد سے پوچھ لیں۔" رقیہ بیگم تردد سے بولیں۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" راشد صاحب گرم ہونے لگے۔ "ایک کی دفعہ تو تماشا بنوا دیا میں دوسری مرتبہ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ امبرین کے لئے عین شادی کے دنوں میں انکار بھجوا کر اس نے دونوں گھرانوں کی ذلت و رسوائی کا سامان تو بہرحال جو کیا تھا سو کیا تھا اس انکار کے ردعمل نے امبرین کو تباہی کی جس سطح پر پہنچا دیا اس کا بڑی حد تک ذمہ دار وہ خود بھی ہے۔ چنانچہ اب اسے ہی اس کی تلافی بھی کرنا ہو گی۔ شاہین کو اپنا کر۔" راشد صاحب نے فیصلہ صادر کیا۔

"امبرین کی بہن کو ہی اپنانا ہے تو پھر شاہین کیوں ارشین بھی "مستحقین" کی لسٹ میں آ سکتی ہے۔ وہ بھی تو طلاق کے بعد "اکیلی" ہے۔"

نازو جل کر بولی۔ اسے صبح رقیہ بیگم نے بلوایا تھا بات چیت کے لئے۔ صورتحال جان کر وہ خاصی ناخوش تھی۔ شادی کے بعد وہ سسرال میں رہ کر بڑی حد تک زمانہ ساز ہو چکی تھی۔ اسے بخاری صاحب کی فیملی کی لڑکی بیاہ کر لانے سے اختلاف تھا۔ وہ تو آتے ہی رقیہ بیگم سے جھگڑی۔

"کمال ہے امی! ڈیڈی کو تو خیر خدا ترسی اور انسانی ہمدردی کا بخار چڑھا رہتا ہے' آپ نے بھی بلا سوچے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ سارا زمانہ ان بہنوں پر تھو تھو کرتا ہے اور آپ چلی

ہیں انہیں عزت و اعزاز کی چادر اوڑھ کر گھر میں لانے۔"

"ایسے نہیں کہو بیٹی! اس طرح امبرین کو ٹھکرانے کی غلطی کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ ایک نہ سہی دوسری بیٹی کو بہو بنا کر لے آئیں۔ یوں بھی شاہین معصوم اور کم عمر ہے۔ پھر اپنے ہی اپنوں کا عیب ڈھکتے ہیں۔ وہ ہمارے عزیز ہیں۔ برسوں پرانی تعلق داری رہی ہے۔"

"میں تو کہتی ہوں اچھا ہی ہوا جو سعد نے امبرین سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ورنہ جو گل اب محترمہ نے کھلائے ہیں شادی کے بعد ایسا کرتی تو ہماری خاندانی عزت و عظمت کا جلوس نکل جاتا۔ دیکھ لی ناں اس کی فطرت۔ بری سوسائٹی میں پڑ کے کتنی خراب ہوئی؟ توبہ توبہ۔" نازو نفرت سے بولی۔

"اور دوسری بھی کیا کم نکلی۔ گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ امی کم از کم مجھ سے آنکھوں دیکھی مکھی نہیں لگی جائیگی۔ میرے سسرالی رشتہ داروں کو اس کے ماضی کی بھنک پڑ گئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ ہمارے سعد کو لڑکیوں کی کمی ہے کیا جو آپ اس کے لئے نمبر دو قسم کی بیوی کا انتخاب کر رہی ہیں؟" وہ باقاعدہ ناراض ہو رہی تھی۔ "بری بات ہے نازو! اس طرح نہیں کہتے۔ وہ بچے ہماری آنکھوں کے سامنے پلے بڑھے ہیں۔ جو کچھ بھی ہے وہ فطرتاً برے نہیں تھے' حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگر....."

"امی ہم نے ساری دنیا کے ٹھکرائے بھٹکے لوگوں کو آباد کرنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا....." نازو بری طرح جھلا گئی تھی۔

"کون ہاتھ رکھتا ہے ایسی لڑکیوں کے ننگے سروں پر؟ یہ زندگی ہے کوئی ڈرامہ یا فلم نہیں ہے جو مخصوص وقت کے بعد ختم ہو جائے گی۔ عمر بھر کا معاملہ ہے۔ رسوائی کو گلے لگا کر جینا بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے اور دیکھ لیجئے گا وہ بھی راضی نہیں ہوگا۔"

"کیسے نہیں ہوگا۔ شاہین میں کیا برائی ہے اور یوں بھی وہ اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا چشم دید گواہ ہے۔" رقیہ بیگم نے دلیل دی۔

"یوں تو پھر قرعہ فال ارشین کے نام بھی نکل سکتا ہے۔ وہ بھی تو فارغ ہے آج کل۔" وہ طنزیہ بولی تھی۔

اور اب یہی بات وہ باپ کے سامنے دہرا رہی تھی۔

"آں ہاں۔ ارشین بھی اچھی لڑکی ہے۔ مجھے پسند ہے لیکن موجودہ حالت میں شاہین کا انتخاب ہی مناسب ہوگا۔ ارشین سمجھدار اور میچور ہے اور اس قابل ہے کہ اپنا اور دوسروں کا سہارا بن سکے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے کسی کی محتاج نہیں ہے اور زندگی کی اس سطح پر ہے کہ پوری ذمہ داری اور شعور کے ساتھ اپنے لئے کوئی فیصلہ کر سکے۔ مدد اور ہمدردی کی ضرورت شاہین کو ہے۔ وہ بہت چھوٹی ہے اور عمر کے ایک نازک دوراہے پر کھڑی ہے۔"

"ہونہہ! ہم نے تو جیسے "رفاہ عامہ" کا ادارہ کھول رکھا ہے نا....." نازو دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ "یہ اچھی مصیبت ہے۔ اسے کہتے ہیں نیکی گلے پڑ جانا....."

"سعد سے بھی کنٹیکٹ کر لیجئے گا۔" وہ بمشکل اپنے تیور چھپا رہی تھی۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں اس نے عین شادی کے دنوں میں ارشین کی خاطر امبرین کو ٹھکرا دیا تھا۔ اب اگر دوبارہ یہ ڈرامہ دہرایا گیا تو جی بھر کر جگ ہنسائی ہوگی۔"

وہ جل بھن کر بظاہر نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ارشین کی دوستی اور تعلق کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ جس کی وہ کبھی رازدار اور غمگسار ہوا کرتی تھی اس کے لئے اب نازو کے دل میں سوائے نفرت اور بیزاری کے کچھ نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی اسی دنیا کی باسی تھی۔ پے در پے بخاری فیملی کے ساتھ پیش آنے والے ذلت آمیز واقعات اور اس کے نتیجے میں آس پاس کے لوگوں کی چہ میگوئیاں' لن ترانیاں سن سن کر وہ مکمل طور پر ان سے متنفر ہو چکی تھی۔

"ایسا کرتے ہیں سعد کو کراچی سے بلوا لیتے ہیں۔ ساری صورتحال سامنے رکھ دیں گے انتخاب کا مسئلہ خود ہی حل ہو جائے گا۔" راشد صاحب نے سوچ کر تجویز پیش کی تھی۔

اگلے روز سعد کو فون کر دیا گیا۔ وہ آیا تو اسے اپنے لاہور جانے اور شاہین کے ساتھ ساتھ ارشین سے ملاقات کی روداد سنائی۔ ارشین کی طلاق کا سنتے ہی وہ پارے کی طرح بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ راشد صاحب اور رقیہ بیگم جان اس سے کیا کیا پوچھتے رہے۔ اس کا ذہن ارشین کے نام کے ساتھ ہی اٹک کے رہ گیا تھا۔

اگلی صبح وہ افراتفری میں لاہور روانہ ہو گیا۔ شبانہ خاتون سے ملنے کے بعد شاہین سے ارشین کے ہاسٹل کا ایڈریس لے کر وہ شام کو اس کے سامنے موجود تھا۔

"کیسی ہو تم ظالم لڑکی! بے وفا دوست' بے فیض عزیزہ!" وہ اتنی مدت بعد دوبارہ اسے

سامنے پا کر جذباتی ہو گیا تھا۔

"ارے ارے سانس تو لے لو۔ ایک ساتھ اتنے ڈھیر سارے القابات!....." ارشین ایک مدت بعد خوشدلی سے مسکرائی تھی۔

"ہم لاہور آئے تو تم یہاں سے کوچ فرما گئے۔ کم از کم ویلکم کہنے کے لئے ہی رک جاتے۔" وہ خوش دلی سے مخاطب تھی۔

سعد ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا' جیسے اس کے چہرے کا ایک ایک نقش حفظ کر رہا ہو۔

"میں رسماً بھی یہ نہیں کہوں گا کہ تمہاری طلاق کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ کیونکہ ایک درندے اور وحشی نما بے حس شخص سے چھٹکارا مل جانا میرے نزدیک خوشی کی خبر ہے۔"

"چھوڑو پرانے قصے کو۔ میں بیت جانے والے لمحوں کا ماتم کرتے رہنے کی قائل نہیں ہوں۔ تم سناؤ' تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے۔ کراچی میں پوسٹنگ ہوئی ہے ناں۔"

"ہاں۔ اور تم سیٹ ہو گئی ہو یہاں....." وہ اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"بالکل۔ اب نئی جگہ جا کر سیٹ ہونے کا مسئلہ پریشان نہیں کرتا مجھے۔ دربدری کی عادت سی ہو گئی ہے....." وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"تم نے شاہین کے معاملے میں جو ذمہ داری نبھائی ہے' اس کے لیے میں تا عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔ اگر تم بروقت اس کی مدد نہ کرتے تو وہ جانے کن کن ہاتھوں میں رلتی ہے۔"

"چھوڑو فضول کی باتوں کو۔ میں نے جو کچھ کیا وہ رشتہ دار ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا۔" سعد نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔ "تم نے آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے؟"

وہ بہت آس سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابھی تو فی الحال شاہین کو اس کے اپنے گھر میں سیٹ کرنا ہے۔ اسلام آباد میں ڈرگ کنٹرول سینٹر جا کر امبرین کی خبر گیری کرنی ہے۔ ایک مرتبہ بخاری لاج کے بند دروازے کھول کر اپنے اسٹوڈیو روم میں بیٹھ کے پرانے وقتوں کو آواز دینی ہے اور۔ اور ہو سکا تو گوٹھ جا کر بابا جان اور بی بی جان کے قدموں میں پڑ کے اپنی خطاؤں کی معافی مانگنی ہے۔" وہ کسی غیر مرئی نقطے پہ نظر جمائے بول رہی تھی۔

"اور اس کے بعد....." وہ نجانے اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔

"اس کے بعد....." وہ کچھ سوچ کر اچانک مسکرا دی۔

"آں ہاں..... بتاؤ گی میں تمہیں اس سے....." وہ واضح طور پر متبسم ہوئی۔

"کس سے؟" سعد الجھ کر دیکھنے لگا۔

"اپنے "مستقبل" سے۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"بعض اوقات خشک پتھروں کے دیس میں میٹھے پانیوں کے چشمے مل جاتے ہیں۔ وہ چشمے کے اعتبار سے صحافی ہے۔ یہیں لاہور کا رہنے والا ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے عارضی رہائش اسلام آباد میں ہے۔ ایس ایس پی مہران کا دوست رہا ہے مگر مزاجاً اس کے چھینٹے بھی نہیں پڑے۔ وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ مہربان' اخلاص والا' سادہ اور کشادہ دل۔ داور نام سے اس کا۔ آج کل تو یہاں نہیں ہے پھر دوبارہ کبھی آیا تو اس سے ملاقات کراؤں گی۔ تمہیں مل کر دلی خوشی ہو گی۔ مجھے یقین ہے بہت جلد تم لوگ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن جاؤ گے تم دونوں میں بہت سی عادتیں ایک جیسی ہیں۔"

ارشین کے لہجے میں زندہ دلی در آئی تھی۔

جوں جوں وہ تفصیلات سنا رہی تھی' سعد کا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دوسری بار بھی ہار گیا تھا۔ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیا اس کی قسمت میں ہمیشہ خالی دامن رہنا ہی لکھا ہے۔

"میں تمہاری تہہ دل سے مشکور ہوں کہ تم نے شاہین کے سلسلے میں ہاتھ بڑھا کر میرا بہت بڑا بوجھ بانٹ لیا۔

آنٹی رقیہ اور راشد انکل لاہور آئے تھے۔ شبانہ آنٹی تو بہت بے تاب تھیں رسم کرنے کو مگر میں نے مناسب سمجھا کہ قسط وار منگنی' نکاح کے بجائے ڈائریکٹ شادی کر دی جائے۔ بار بار چھٹی لینا تمہارے لیے بھی آسان نہیں ہو گا۔ رقیہ آنٹی کچھ دنوں میں آ رہی ہیں۔ تم اپنے حساب سے تاریخ وغیرہ کے متعلق بتا دینا جب چھٹی آسانی سے مل سکے۔"

وہ خوشدلی سے گویا تھی پھر اس کی غائب دماغی محسوس کر کے چونکی۔

"کہاں گم ہو بھئی۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" اس نے سعد کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"کیا تم اپنے فیصلے سے خوش ہو۔ اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ کیا وہ تمہیں ایک پرسکون زندگی دے سکے گا؟" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"ہاں....." وہ مطمئن لہجے میں پورے اعتماد سے بولی۔ "پہلی مرتبہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔ میرے جیسے مزاج کی حامل لڑکی کے لیے داور ایک پرفیکٹ چوائس ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی لیکن میرا دل کہتا ہے اس میں وہ سب اوصاف موجود ہیں جو ایک با اعتماد اور پرخلوص جیون ساتھی میں ہونے چاہئیں۔ میں اس کے ساتھ خوش رہوں گی۔"

سعد کے کندھے ڈھلک گئے۔

اب کیا ہو سکتا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا اور دلی رضامندی کے ساتھ کیا گیا تھا۔

"سعد! میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" وہ قدرے عاجزانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شاہین کی ماضی کی غلطیوں کو طعنہ بنا کر بہانے بہانے سے اس کی تذلیل نہ کرنا' اسے اپنی ہمراہی کا اعتبار دینا۔ بے اعتباری عورت کا ساری دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ میں اس سٹیج سے گزر چکی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ جس طرح میں نے وہ عذاب ناک گھڑیاں بتائی ہیں۔ خدا سب کو ان سے بچائے۔ تم نے ہمیشہ میرے اور اپنے بیچ دوستی کے اس ان کہے رشتے کا مان رکھا ہے۔ مشکل لمحوں میں ساتھ نبھایا ہے۔ تم تو میرے ان دکھوں کے بھی رازدار ہو جس کی گواہ صرف میری ذات ہے۔ مجھے تم پر خود سے بھی زیادہ بھروسا ہے۔ میرے بھروسے کو قائم رکھنا۔ شاہین کو کبھی کوئی دکھ نہ دینا....."

"میرے لئے کوئی شے تمہاری خوشی سے بڑھ کر اہم نہیں ہو سکتی۔ تمہاری خواہش سر آنکھوں پر۔" وہ زخمی مسکراہٹ لئے بولا۔

"چلتا ہوں اب....." اب اس کے لئے ٹھہرنا محال ہو رہا تھا.....

"امی اور ڈیڈی کل تاریخ لینے آ جائیں گے۔ ایک ہفتے بعد میں شاہین کو بیاہ کر لے جاؤں گا۔"

وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے اندر کوئی شے پگھل رہی تھی۔ دل سیال مادہ بن کر آنکھوں سے ٹپکنے کو تھا۔ یوں لگ

رہا تھا اندر باہر دھواں ہی دھواں بھر گیا ہو۔ گھٹن ایسی تھی کہ سانس لینا عذاب ہو گیا تھا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ایک زبردست ذہنی و جذباتی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے کبھی پڑھی ہوئی وہ نظم بے طرح یاد آئی۔

پیار کے سمندر میں
ہر اترنے والے کو
کشتیاں نہیں ملتیں۔
دور دور تک جاناں۔ دھوپ کی مسافت ہے۔
اور کہیں بھی پل بھر کو دھوپ کے مسافر پر۔ سائباں نہیں کھلتے۔
اس عجب سمندر میں۔ عمر کی ریاضت کے بعد ہم نے جانا ہے
جس طرح فضاؤں میں اڑنے والے پنچھی پر برس ہا برس میں بھی۔ آسماں نہیں کھلتا۔
ہجر بیکراں میں بھی بھید بھید رہتا ہے' رازداں نہیں ملتے
بار دور نہیں کھلتے۔ ہر اترنے والے کو۔ کشتیاں نہیں ملتیں
اور مل بھی جائیں تو بادباں نہیں کھلتے
پیار کے سمندر میں' بھید بھید رہتا ہے

بالآخر اس نے ایک دن سڑک کے کنارے گاڑی روک دی اور ماتھا سٹیئرنگ سے ٹکا دیا۔

اس کے حوصلے بری طرح بکھر رہے تھے۔

"کس امتحان میں ڈال دیا ہے تم نے؟" اس کا رواں رواں ارشین کا ورد کر رہا تھا۔ "کس طرح سنبھالوں اپنے بے قرار من کو۔ کیسے تمہاری جگہ کسی اور کو دے سکوں گا۔" اس کے دل کی دھڑکنیں احتجاج کر رہی تھیں۔

کافی دیر کے بعد وہ دوبارہ خود کو کمپوز کر کے گاڑی چلانے کے قابل ہوا تھا۔

کچھ بھی تھا ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔

یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔

وہ اس کے نصیب میں نہیں لکھی گئی تھی۔

وہ تقدیر کے لکھے کو مٹا نہیں سکتا تھا۔

وہ اس کے لئے نہیں بنی تھی اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

"بڑی مشکل سے گوٹھ پہنچ پایا ہوں۔ راستے ہی سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ میرا کبھی اس طرف آنا نہیں ہوا اس لیے۔" راشد صاحب نے پانی کا گلاس خالی کرنے کے بعد گہری سانس لی۔

وہ اس وقت بخاری صاحب اور صباحت بیگم کے روبرو بیٹھے تھے اور تمام تفصیلات وقفے وقفے سے ان کے گوش گزار کر رہے تھے۔

"شاہین ہمارے گھر کی عزت بن گئی ہے۔ ہم اسے بیاہ کر اسلام آباد لے آئے ہیں۔ امبرین مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے بعد نرسنگ کی ٹریننگ لے رہی ہے۔ اس کے لیے بڑا اچھا رشتہ آیا ہے۔ آپ اور صباحت بہن چل کر دیکھ لیں۔ ارشین لاہور میں جاب کر رہی ہے مہران نے اسے طلاق دے دی تھی مگر ایک معزز اور شریف گھرانے کا نوجوان اسے اپنانے کا خواہش مند ہے آپ لوگ بخاری لاج واپس آ جائیں اور اپنی تسلی کرنے کے بعد عزت سے بیٹیوں کو گھر سے رخصت کریں۔"

راشد صاحب بڑی دانش مندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے دھیرے دھیرے انہیں ان انکشافات کے لیے تیار کر رہے تھے۔

بخاری صاحب کے چہرے پر ایک تشنجی کیفیت نمایاں تھی۔ صباحت بیگم بیٹیوں کے تذکرے پر بری طرح بے قرار ہو گئی تھیں مگر بخاری صاحب کے ڈر سے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی سعی کر رہی تھیں۔ ان کا دل ایک نظر بچیوں کو دیکھنے کے لیے بے طرح ترس رہا تھا۔

"ہم نے آپ کو کلی اختیار سونپ دیا ہے۔ آپ ہماری طرف سے انہیں رخصت کر دیجیے گا۔ ہم میں بار بار عزتوں کے جنازے اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔" بخاری صاحب تھکے لہجے میں بولے۔

"میرے خیال میں تو یہی مناسب ہو گا کہ آپ شہر واپس چلیں۔" راشد صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔

"یہاں گوٹھ میں رہ کر بچوں کی پڑھائی کا بھی خرچ ہو رہا ہے۔" انہوں نے عدنان اور ثمرین کی تعلیم و تربیت کا حوالہ دیا۔

"عدنان کو زمین داری میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہاں خوش ہے۔ ثمرین کو لڑکیوں کے سکول میں پانچویں کلاس میں داخل کرا دیا ہے۔ یہ اسکول دسویں کلاس تک ہو گیا ہے۔ حکومتی منصوبوں کے تحت گوٹھ میں بہت سی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ رہے ہم تو ہم دنیا کے طعن و تشنیع اور طرح طرح کی باتوں سے دور ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں سب کو یہی بتایا ہے کہ تینوں بیٹیوں کی شادیاں کر دی ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں شاد و آباد ہیں۔ پہلے یہ مصلحت آمیز جھوٹ تھا اب تمہارے بتلانے پر دل کو مزید تسلی ہو گئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ پردہ پوشی سچائی کا روپ اختیار کر گئی ہے۔ ہم ان سے مل کر کیا کریں گے۔ بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن تو خود سے جدا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہم نے بھی یہی سمجھ کے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔ ہم ان کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

بخاری صاحب بہت آہستہ و دل شکستہ انداز میں دھیرے سے گویا تھے۔ وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا قصور تو اس میں انکا بھی برابر کا تھا۔ صباحت بیگم ساری مصلحتیں اور ڈر خوف بالائے طاق رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھیں۔

"لیکن بیٹیوں کا ایک میکہ بھی ہوتا ہے۔ اس کا ایک اپنا مان ہوتا ہے۔" راشد صاحب برابر انہیں اسلام آباد واپس چلنے کے لیے قائل کر رہے تھے۔

"میں بخاری لاج ارشین کے نام کر رہا ہوں۔ وہ اس کی حقدار بھی ہے۔ اس سے کہنا وہ اس گھر کے بند دروازے کھول کر بہنوں کے لیے میکہ آباد کر دے۔"

بخاری صاحب اپنے طور پر تمام پہلوؤں پر غور کر چکے تھے۔

راشد صاحب کو چپ سادھنے ہی بن پڑی۔ کچھ ساعت بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ زیورات اور کچھ کپڑے شاہین اور امبرین کے لیے بنا کر رکھے تھے میں نے۔" صباحت بیگم نے بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے ایک بیگ اندر سے لا کر راشد صاحب کے سپرد کر دیا۔

"ان سے کہیے گا وہ دنیا کے کسی کونے پر بھی رہیں ہماری بیٹیاں ہیں۔ ہمارا خون ہیں۔ خدا نے توفیق دی تو کبھی آئیں گے ان سے ملنے۔ مگر ابھی نہیں ابھی زخموں پر کھرنڈ نہیں جمی۔ ابھی

عزت کے ٹوٹے شیشے کی کرچیاں بدستور پاؤں میں چبھ رہی ہیں۔" بخاری صاحب انہیں رخصت کرتے ہوئے بڑے ضبط سے کہہ رہے تھے۔

راشد صاحب نے پلٹ کر ان کے شدت ضبط سے سرخ پڑتے چہرے اور لال آنکھوں میں اولاد کی دید کی بے تحاشا تڑپ کو محسوس کیا اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر آگے بڑھ گئے۔

خدایا تو کیسے کیسے لمحوں میں آزماتا ہے اپنے بندوں کو!

کبھی یہ شخص قہر کا مجسمہ ہوا کرتا تھا۔

آج شکست و ریخت اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ایک گرتا ہوا خستہ حال کھنڈر مکان دکھائی دیتا ہے۔ حالات کی آندھیوں کی زد میں آ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا ہوا بے بس لاچار مکان!

☆☆☆☆☆

"نہیں انکل! میں یہ کاغذات نہیں رکھوں گی۔ اس گھر پر عدنان کا حق ہے۔ بابا جان چاہیں تو اس کے نام کر سکتے ہیں۔ میں اسے لے کر کیا کروں گی۔ یوں بھی یہاں رہ کر میں ماضی کے دفتوں میں بھٹک کر اپنے حال کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتی۔ رہی میکہ آباد کرنے کی بات تو میرا اور داور کا گھر ان کا میکہ ہی ہوگا۔ میں جہاں بھی رہی ان کے حالات سے بے خبر نہیں رہوں گی۔ امبرین سے میں مل آئی ہوں۔ ڈاکٹر رضا بہت اچھے انسان ہیں وہ اسے مکمل تحفظ دیں گے۔ مجھے یقین ہے۔ شاہین تو آپ کے ہاں آ ہی چکی ہے میں اب لاہور واپس جاؤں گی۔ جاب سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آئی تھی۔"

ارشین شاہین کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد میں ہی تھی۔ بخاری لاج کی چابیاں راشد صاحب نے اسے دے دی تھیں۔ وہ ایک ہفتہ یہاں رہی تھی۔ سعد کی شادی میں داور بھی شریک تھا اور راشد صاحب سے مل کر اظہار دعا کر چکا تھا۔

"ہم تمہیں اس طرح لاہور نہیں بھیجیں گے بیٹی!" رقیہ بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔ "بہتر ہوگا تمہارا اور داور کا عقد کر دیا جائے وہ کئی بار درخواست کر چکا ہے۔ زیادہ ہلا گلا نہیں ہوگا۔ وہ چار بندے لے کر آ جائے گا۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" ارشین نے سر جھکا لیا۔

ایک عجیب خیال کا ساحیران کن موڑ آیا تھا اس کی زندگی کی پر پیچ کہانی میں۔ وہ خود کی تصویر

بنی ایک ایک چیز کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے آج ہی بالکل ابھی سے زندگی کا سفر شروع کرنے لگی ہے۔ ہر شے نئی لگ رہی تھی۔

ایک عجیب و غریب تبدیلی آئی تھی۔ اس کے محسوسات کو تحیر سے تغیر سے روشناس کراتی ہوئی اسے گنگ کرتی ہوئی۔

جب کوئی احساس سمجھ میں نہ آئے تو باقی صرف حیرانی رہ جاتی ہے۔ وہ بھی حیران تھی۔ جی بھر کر۔ سرتاپا۔ لیکن اس حیرانی کے جلو میں امید اور سرخوشی کے قافلے بھی اتر رہے تھے۔

فاریہ کا بھائی کیپٹن اظہر نیا نیا کراچی ٹرانسفر ہوا تھا آتے ہی پتا چلا میجر سعد میس میں دعوت ولیمہ دے رہے ہیں۔ وہ تازہ تازہ شادی کی چھٹیاں گزار کر اسلام آباد سے کراچی پہنچے تھے مع مسز کے۔ اظہر میجر سعد سے بخوبی واقف تھا اسے بھی فطری سا اشتیاق ہوا تھا لیکن مسز سعد کے روپ میں شاہین کو سامنے پا کر اس کے اعصاب پر بجلیاں گر پڑیں۔

یہ تو وہ بھی جو برسوں سے اس کے خوابوں میں ہم سفر رہی تھی۔ جس کی اچانک گمشدگی نے اسے گزشتہ کئی ماہ سے بری طرح بے چین کر رکھا تھا۔ وہ بارہا بخاری لاج کے سامنے سے گزرا تھا مگر وہاں گیٹ پہ پڑے موٹے سے تالے نے اس کی امیدوں پر اوس ڈال دی تھی۔ وہ اس کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چلا تھا کہ اچانک وہ نظر آ گئی۔

مگر کس روپ میں۔

اپنی نارسائی کے احساس نے اس اندر تک چھیل کے رکھ دیا تھا۔

مشہور صحافی داور صدیقی اور نامور مصورہ ارشین بخاری کی شادی کی خبر مع تصویر کے اخبار میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ اس اخبار کا یورپی ایڈیشن بھی چھپتا تھا اپنے وطن سے ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے مہران آفریدی کی نظروں سے جب یہ تصویر اور خبر گزری تو اس کے اعصاب پر بھی ایسی ہی قیامت ٹوٹی تھی۔

یہ خبر بیٹی کے غم میں نیم پاگل امریکہ میں مقیم پروفیسر دانیال مہدی تک بھی پہنچی تھی مگر اب اس خبر سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کے اعصاب تو اس روز سے ادھڑ کر رہ گئے تھے جب ڈاکٹرز نے اپنی ناکامی کی خبر سنائی تھی۔ مہوش کا آپریشن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ کینسر جیسے موذی مرض سے نجات کی بجائے وہ زندگی سے ہی نجات پا گئی۔ وہ آپریشن کے دوران انتقال کر گئی تھی۔ نازش

اس صدمے کے زیر اثر دو ماہ تک ہوش وحواس سے غافل رہی اس کی حالت کے پیش نظر اس کے والدین کراچی سے امریکہ اس کے پاس پہنچ گئے تھے اور جونہی وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی اسے اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ پروفیسر دانیال فی الحال امریکہ میں ہی تھے۔ وہ اپنی جگہ عبرت کا نمونہ بن گئے تھے۔ ایک ہی بیٹی تھی اور وہ زندگی میں سب سے زیادہ اسی سے پیار کرتے تھے۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کی فوتگی' غمخوار بیوی کی نڈھال دنیم مردہ حالت' اپنے ماضی کے گناہوں کا احساس ندامت اور لاشعوری طور پر بیٹی اور بیوی کو اس نہج تک پہنچانے کی ذمہ داری کا احساس جرم۔ ان سب چیزوں نے نفسیاتی طور پر اس بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

وہ نفسیاتی امراض کے وارڈ میں شفٹ کر دیے گئے تھے' اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ طویل سائکو تھراپک ٹریٹ منٹ سے گزرنے کے بعد ہی وہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں گے۔

امبرین کا تو ماہ کا ٹریننگ کورس مکمل ہوا تو ڈاکٹر رضا نے شادی کے لیے راشد صاحب سے رابطہ کیا۔ جواباً انہوں نے ارشین اور داور سے رجوع کیا۔ وہ دونوں لاہور میں مقیم تھے۔ داور اپنے والد کی پرانی کوٹھی کو از سر نو آراستہ کر چکا تھا۔ وہیں سے دونوں نے نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ارشین جاب چھوڑ کر چکی تھی مگر بالواسطہ سوشل ڈائجسٹ کے لیے گھر بیٹھے ضروری تصاویر بنا دیتی تھی' اس نے اپنی پوزیشن توجہ فن مصوری پر صرف کر رکھی تھی۔

ڈاکٹر رضا نے شادی پر مہران اور اس کے گھر والوں کو بھی بلایا تھا۔ مہران تو فرانس میں تھا اور نجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' چنانچہ سفیان فاریہ کو لے کر چلا گیا۔ (فاریہ رخصت ہو کر آفریدی ہاؤس آ چکی تھی)

دلہن کے روپ میں امبرین کو دیکھ کر دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔

دنیا واقعی گول ہے اور کتنی محدود ہے۔

فاریہ نے امبرین کے خوشی سے چمکتے سرشار چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا اور آگے بڑھ کر خلوص دل سے مبارکباد دی۔ اس کی اور سفیان کی مبارکباد قبول کرتے ہوئے امبرین کے انداز میں کوئی تلخی یا ناراضی نہیں تھی' وہ بہت خوش دلی سے ان سے ملی تھی۔

تقدیر نے اسے تنا نوازا تھا کہ وہ ماضی کی تمام محرومیاں اور تلخیاں فراموش کر گئی تھی۔ ارشین کو مسز داور کے روپ میں دیکھنا بھی ان کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔

"ہم کیا غیر تھے جو ہمیں اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کیا....." سفیان ارشین کو سلام کرنے کے بعد داور سے گلے ملتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولا۔

"ان دنوں حالات ہی کچھ ایسے تھے میرے بھائی! سب کچھ بہت سادگی سے ہوا تھا۔ خیر تم آؤ ناں لاہور۔ ویسا یادگار کھانا کھلائیں گے اپنے ویسے کا کہ یاد کرو گے۔ کیوں بھئی ننھی سی دلہنیا۔ دولھا میاں سے فرمائش کر دو لاہور کی سیر کی۔"

داور نے اپنائیت سے فاریہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سفیان نے غور کیا وہ ارشین کی معیت میں بے پناہ خوش مطمئن اور آسودہ نظر آ رہا تھا۔

یہ خوشی' یہ آسودگی بھائی جان کے نصیب میں نہیں تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی خوشیوں کا چمن اجاڑا تھا۔ کسی کو کیا دوش دیں۔

ارشین اس سے اور فاریہ سے اسی پرانی اپنائیت و شفقت سے ملی تھی اور نجی کا حال چال پوچھا تھا۔ ناظر کے متعلق بھی دریافت کیا تھا۔

☆☆☆☆☆

یہ لاہور کے گھر کا ایک خوشگوار منظر تھا۔

"بیگم..... بیگم جانی....." داور اسے پکارتا ہوا اسٹوڈیو میں آ رہا تھا۔ ارشین انہماک سے تصویر بنا رہی تھی۔

"کیا آفت ٹوٹ پڑی اب۔ ابھی تو آئی ہوں آپ کے پاس سے....." وہ جھلا گئی تھی۔

داور اس کی ہزار تاکیدوں کے باوجود پھر بیڈروم سے نکل کر اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔

"کیا کریں۔ ہم آپ کے بغیر ایک منٹ' ایک پل' ایک سیکنڈ نہیں رہ سکتے۔ سچ۔ یقین نہیں آتا تو ہمارے دل پہ ہاتھ رکھ کے معلوم کر لو۔"

وہ اس کے قریب آ کر وارفتگی سے اس کے ہاتھ سینے پر رکھ کر بولا تھا۔

"ابھی دو گھنٹے جناب کے روبرو گزار کے آئی ہوں۔" اس نے ہاتھ چھڑا کر جتلایا۔

"صرف دو گھنٹے....." وہ مصنوعی حیرانی سے بولا۔ "میں نے تو اتنی ذرا سی دیر میں ٹھیک طرح سے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"ڈیڑھ سال ہو گیا ہے شادی کو۔" وہ ہنس دی۔ "اب تو اس دیوانے پن کو جانے دیں۔"

"ڈیڑھ صدیاں بھی گزر جائیں تو یہ دیوانگی کم نہ ہوگی۔" وہ محبت سے اس کی پیشانی اور لب چھو کر بولا۔ "تم کیا ہو کتنی پیاری چیز ہو یہ صرف میرا دل جانتا ہے۔ تم تو ٹھہریں زمانے بھر کی بے خبر۔ تمہیں کیا معلوم کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں تمہارے سندر سراپے میں....."

وہ بے خود ہو رہا تھا۔ ہمیشہ اسی طرح وہ اس کے قرب میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔ اس ڈیڑھ برس میں اس نے اس طرح ٹوٹ کر ارشین کو چاہا تھا کہ اس کی بکھری ترسی تشنہ ذات کا گوشہ گوشہ سیراب ہو گیا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا لگتا تھا کہ اس کے اندر محبتوں کا زور آور ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن ہوگا تو شادی کے بعد ہی اس پہ کھلا تھا کہ وہ کس درجہ جوشیلا اور گرم جوش واقع ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ارشین کو اپنے اندر اتار لے۔

"پلیز دادر!" وہ منتوں سے اسے من مانیوں سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "مجھے یہ تصویر مکمل کر لینے دیں۔ یہ بیرون ملک ایک کمپٹیشن میں بھجوانی ہے اور کل تک مجھے لازمی تیار کرنی ہے۔" اس نے اس کے بازو پیچھے کرتے ہوئے وضاحت کی۔

"تم ہر بار یہی بہانا بناتی ہو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"بہانا نہیں ہے۔ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا دکھاؤ تو کیا بنا رہی ہو۔" دلچسپی سے ایزل کی طرف جھکا۔ ایک اونچا سا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر ایک درخت اگا ہوا تھا۔ درخت بالکل سیدھا تھا اس پر کوئی پتا یا ٹہنی نہیں تھی ایک۔ یہ شاخ تھی جو تناور درخت بن کر چوٹی پر ایسا دکھتی۔ ظاہر ہے اتنی بلندی پر سبزے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے درخت بالکل ٹنڈ منڈ تھا۔ اس کے ارد گرد کسی دوسرے درخت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بہت اوپر جا کر درخت کی ٹہنی ٹیڑھی ہو کر جھکنے لگی تھی اور کچھ اس طرح جھکی تھی جیسے ابھی کسی آن ٹوٹ کے جڑ سمیت نیچے پہاڑ کے دامن کی وسیع گہرائیوں میں جا پڑے گی۔ وادی کی پستیاں اسے نگلنے کو تیار کھڑی تھیں۔ اس کے نیچے عنوان لکھا تھا۔

"خود پسندی اور انتہا پسندی..... دونوں کا انجام پستی اور غرقابی ہے۔"

"بہت خوب....." بے اختیار دادر کے منہ سے نکلا۔

"خود پسند شخص دوسروں سے نمایاں تو ہو جاتا ہے مگر ان سے الگ بھی ہوتا چلا جاتا ہے اور اکیلا پن انسان کتنی مدت تک برداشت کر سکتا ہے۔ کس دن اس کی شخصیت کا بت ٹوٹ کے پستیوں

میں جا گرتا ہے۔ دوسروں سے ممتاز اور بلند نظر آنے کے لیے اپنی فطرت اور انسانیت ہی کی نفی کر دینا کہاں کا انصاف ہے یہ طرز عمل تباہی کے زمرے میں آتا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس پر کوئی انعام ضرور ملے گا۔ یہ کلر اسکیم بہت سوٹ کر رہی ہے اور بیک گراؤنڈ کا اسٹیک بھی اچھا ہے۔"

"شکریہ۔ اب آپ مجھے تقریباً دو گھنٹوں کے لیے بخش دیجیے تاکہ میں اس کی فنشنگ کر سکوں۔" ارشین دوبارہ کام میں لگ گئی۔

"جو حکم سرکار کا۔" دادر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "مگر دیکھ لو یہ "ادھار" چکانا ہوگا..... مع سود کے....." وہ اس کی زلفیں بکھیرتے ہوئے شرارتاً بولا۔

"یہ اخبار والوں کی ہفتہ وار چھٹی نہیں ہونی چاہیے....." ارشین نے مصنوعی خفگی دکھائی۔ "گھر والوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔"

"تو پھر وے دوناں کوئی تھا منا جیتا جاگتا کھلونا۔ جب تک تم مصروف ہوا کرو گی میں اس سے دل بہلاتا رہوں گا۔" وہ جاتے جاتے شوخ ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ جواب میں ارشین کا پھینکا ہوا برش اس کے سر پر پڑتا وہ ہنستا ہوا غائب ہو گیا۔

"بدتمیز نہ ہو تو....." خفت اور شرم سے لال چہرہ لیے وہ بڑبڑا رہی تھی۔

یہ خواب سبز ہے یا رت وہی پلٹ آئی
پھولوں پہ گھاس، ہوا میں نمی پلٹ آئی

☆☆☆☆☆

"دنیا کے کسی گوشے میں آرٹ کی نمائش ہو ان کا جانا لازم بنتا ہے۔"

ورنایاب چھ ماہ کے شایان کو پرام میں ڈالے آرٹ گیلری میں داخل ہوتی ہوئی دل ہی دل میں جھلا رہی تھی۔ مہران اس سے آگے تھا اس کی گود میں ننھی ردا سوئی ہوئی تھی۔ ردا اور شایان جڑواں بہن بھائی یوں بیک وقت نایاب کی بیٹے اور بیٹی کی خواہش ایک ساتھ پوری ہو گئی تھی۔ اسے فرانس میں مہران کے ساتھ دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا اب وہ یہاں کے رہن سہن کی عادی ہو گئی تھی۔ مہران نے اسے پاکستان سے یہاں بلوانے کے بعد مزید کوئی تفتیش یا سرزنش نہیں کی تھی۔ اس کا رویہ ویسا ہی نارمل تھا جیسے شادی کے بعد پہلے ہوتا تھا۔ وہ اس کا اور بچوں کا پورا خیال رکھتا تھا مگر اس کے باوجود بار ہا نایاب کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اندر سے ایک منہ بند قلعے کی طرح ہے

اور اس کے شہر دل کا دروازہ کسی نے مضبوطی سے بند کر رکھا ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود وہ اس قلعے میں داخل ہو کر مہران کے "اندر" کا حال نہیں جان پائی تھی۔ ہار تھک کر اس نے اس کے دل میں اترنے اور اس کی گہرائیاں ناپنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور اپنی پوری توجہ بچوں کی طرف لگا دی تھی۔

مہران نے اخبار میں اس نمائش کے بارے میں پڑھا تھا۔ کئی غیر ملکی فن پارے میں نمائش میں رکھے گئے تھے اور جانے کس کھوج میں وہ کشاں کشاں چلا آیا تھا۔

مختلف فن پاروں کو دیکھتے ہوئے وہ ایک پینٹنگ کے آگے رک گیا۔ سبز و سرمئی پہاڑ جس کی چوٹی پر ایک بھورا ٹنڈ منڈ درخت رکوع کی حالت میں کھڑا تھا۔

اس نے جھک کر عنوان پڑھا۔ پھر ایک اذیت ناک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

"خود پسندی اور انتہا پسندی..... دونوں کا انجام پستی اور غرقابی ہے....."

"تم نے ٹھیک کہا۔" اس نے گہری سانس لی۔

وہ ہولے ہولے ارشین بخاری کے دستخط پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس کے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا اور ٹوٹتا ہی چلا جا رہا تھا۔

یہ ٹوٹی توڑ پھوڑ اب اس کا مقدر بن چکی تھی۔

☆☆☆☆☆